

دنیا کے مزدوروں، ایک ہو !

کارل مارکس  
فریڈرک اینگلس

# منتخب تصانیف

حصہ دوم

والا شاعت ترقی، مالمو



رضوان عطا

۱۹ جون ۲۰۰۱ء

۸/۲۰

## فہرست

صفحہ

۷	کارل مارکس - سیاسی معاشیات کی تنقید پر
۱۴	کارل مارکس - اجرت، قیمت اور منافع
۱۴	شروعات کے چند جملے
۱۵	۱ - پیداوار اور اجرت
۱۸	۲ - پیداوار، اجرت اور منافع
۳۰	۳ - مزدوری اور نقد رقم
۳۶	۴ - سپلائی اور مانگ
۳۸	۵ - اجرتیں اور قیمتیں
۴۲	۶ - قدر اور محنت
۵۴	۷ - محنت کی قوت
۵۸	۸ - قدرزائد کی پیداوار
۶۱	۹ - محنت کی ویلیو
	۱۰ - کسی مال کو اس کی ویلیو پر فروخت کر کے منافع
۶۳	کمایا جاتا ہے
۶۴	۱۱ - وہ مختلف حصے جن میں قدرزائد بکھر جاتی ہے
۶۸	۱۲ - منافع، اجرت اور قیمتوں کا باہمی رشتہ
	۱۳ - وہ خاص موقع جب اجرت کو بڑھانے کی کوشش کی
۷۱	جاتی ہے یا اسے گرنے سے روکنے کی
۷۹	۱۴ - سرمائے اور محنت کی کشمکش اور اس کے نتیجے
۸۸	کارل مارکس - "سرمایہ"، کی پہلی جلد کے پہلے جرمن ایڈیشن



کا دیباچہ کارل مارکس - سرمائے کا نام نہاد ابتدائی  
سمٹاؤ ("سرمایہ"، کی جلد اول کا ۲۴واں باب)

فریڈرک اینگلس - "جرمنی میں کسانوں کی جنگ"، کا دیباچہ ۱۰۱  
۱۸۷۰ء کے دوسرے ایڈیشن کے لئے  
۱۸۷۵ء کے تیسرے ایڈیشن کے لئے ۱۸۷۰ء والے دیباچے  
کا تکملہ

کارل مارکس - فرانس میں خانہ جنگی

۱۸۹۱ء کے فریڈرک اینگلس کا دیباچہ

فرانس اور پروشیا کی جنگ پر پہلا خط جو انٹرنیشنل

ورکنگمینز ایسوسی ایشن کی جنرل کونسل نے بھیجا

فرانس اور پروشیا کی جنگ پر انٹرنیشنل ورکنگمینز

ایسوسی ایشن کی جنرل کونسل کا دوسرا خط

فرانس میں خانہ جنگی - انٹرنیشنل ورکنگمینز ایسوسی ایشن کا خط

۱۶۰ - ۱

۱۷۴ - ۲

۱۸۵ - ۳

۲۰۶ - ۴

نوٹس

فریڈرک اینگلس - مزدور طبقے کے سیاسی عمل کے بارے میں

کارل مارکس - گوتھا پروگرام پر تنقیدی نظر

فریڈرک اینگلس کا دیباچہ

کارل مارکس - ولہلم براکے کے نام خط

کارل مارکس - جرمن مزدور پارٹی کے پروگرام پر ایک نظر

۲۳۸ - ۱

۲۵۳ - ۲

۲۵۶ - ۳

۲۵۷ - ۴

فریڈرک اینگلس - بیبل کے نام خط

فریڈرک اینگلس - "فطرت کی جدلیات"، کا تعارف

تشریحی نوٹ

ناموں کا اشاریہ

۳۰۴

۳۵۸

## کارل مارکس

### سیاسی معاشیات کی تنقید پر

#### دیباچہ

میں بورژوا معیشت کے نظام کا اس ترتیب سے جائزہ لینا چاہتا  
ہوں: ساریہ، زمین جائداد، مزدوری (اجرتی محنت)، ریاست، غیرملکی  
تجارت اور عالمی منڈی۔ پہلے تین عنوانوں کے تحت ان تین بڑے طبقوں  
کی زندگی کے معاشی حالات کی چھان بین کروں گا جن میں آج کی بورژوا  
سوسائٹی بٹی ہوئی ہے۔ باقی تینوں عنوانوں کا باہمی تعلق تو ظاہر  
ہے۔ کتاب اول کا پہلا حصہ جس میں سرمائے سے بحث کی گئی ہے،  
تین بابوں پر تقسیم ہے: (۱) مال، (۲) زر یا روپیہ یا صرف رقم کی  
گردش، (۳) سرمایہ عام طور سے۔ پہلے دو باب میں موجودہ کتاب کا  
سارا بیان آجاتا ہے۔ تمام سروسامان میرے سامنے مونوگرافوں کی صورت میں  
پھیلا ہوا ہے جو مختلف اوقات میں بڑے بڑے وقفوں سے لکھے گئے تھے  
اور اشاعت کے خیال سے نہیں بلکہ صرف ذاتی وضاحت یا تشریح کی خاطر  
لکھے گئے تھے۔ اوپر دئے ہوئے نقشے کے مطابق ان مونوگرافوں کا آگے تک  
پھیلاؤ اس پر منحصر ہے کہ باہر کے حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔  
میں نے جو عمومی دیباچے (۲) کا خاکہ تیار کر رکھا تھا اسے  
چھوڑتا ہوں کیوں کہ جب گہرائی تک نظر ڈالی تو میں اس فیصلے  
پر پہنچا کہ ایسے نتیجوں کا پہلے سے قیاس کر لینا جو ابھی پایہ ثبوت  
کو نہیں پہنچے ہیں، الجھاؤ پیدا کرے گا، پس یہی مناسب ہے کہ  
پڑھنے والا جو میرے ساتھ آنا چاہے وہ خاص سے عام کی طرف بڑھتا چلا



آئے۔ البتہ کچھ یادداشتیں جو میں نے اپنے سیاسی معاشی مطالعے کے سلسلے میں تیار کی تھیں، یہاں موقع موقع سے بیان ہوتی رہیں گی۔

تعلیم میں میرا خاص مضمون تھا قانون، تاہم فلسفے اور تاریخ کے ساتھ ساتھ میں قانون کے مضامین کو ثانوی حیثیت سے سیکھتا رہا۔

۱۸۴۲-۴۳ء میں جب «Rheinische Zeitung» (۳) کا ایڈیٹر تھا تو مجھے کو مشکل پیش آئی کہ پہلی بار ان اختلافی سوالوں پر زبان کھولنی پڑی جنہیں 'مادی مفاد' کہتے ہیں۔ رائن صوبے کے لاندتاگ (قانون ساز اسمبلی) میں جنگل کی چوریوں اور زمین جائداد کی تقسیم پر جو بحثا بحثی ہوئی، رائن صوبے کے اس وقت کے "اوبر پریسیڈنٹ" (چیرمین) فان شاپر کی موزیل کے کسانوں کی حالت پر جو سرکاری بحث «Rheinische Zeitung» اخبار کے ساتھ چلی اور ہوتے ہوتے آخر تجارت کی آزادی اور حفاظتی ڈیوٹی لگانے پر جو مباحثے چھڑ گئے، ان سب نے ٹھوکے دے کر مجھے معاشی اقتصادی سوالوں کا مطالعہ کرنے میں لگادیا۔

دوسری طرف یہ ہوا کہ ان دنوں جب "قدم آگے بڑھانے"، کی تمنا تو کہیں زیادہ تھی لیکن موضوع کی معلومات بہت کم، «Rheinische Zeitung» اخبار میں فرانسیسی سوشلزم اور کمیونزم کی گونج بھی سنائی دینے لگی، اگرچہ فلسفیانہ رنگ اتنا چوکھا نہیں تھا۔ میں نے اس ادھ کچرے پن کے خلاف اظہار خیال کیا لیکن آگس برگ کے اخبار «Allgemeine Zeitung» (۴) سے سوال جواب کرنے میں کھلے طور سے یہ مان لیا کہ فی الحال میری معلومات اتنی نہیں ہیں کہ فرانسیسی رجحانات کی حقیقت پر کوئی فیصلہ دینے کی ہمت کر سکوں۔ اور تو اور، میں نے «Rheinische Zeitung» اخبار چلانے والوں کی اس خوش فہمی سے بروقت اور خوب کام نکالا کہ اگر اخبار نرم یا مصالحت آمیز رویہ اختیار کرلے تو اس کا پھانسی کا پھندا ڈھیلا ہو جائے گا۔ اور میں نے سماجی اکھاڑے چھوڑ کر مطالعے والے کمرے کا رخ کیا۔

پہلی تصنیف جسے میں نے اپنی الجھنیں دور کرنے کے لئے سامنے رکھا وہ ہیگل کے فلسفہ حقوق کا تنقیدی مطالعہ \* تھی جس کا دیباچہ

\* کارل مارکس "ہیگل کے فلسفہ حقوق کی تنقید پر"، (ایڈیٹر)

۱۸۴۴ء میں پیرس سے شائع ہونے والے اخبار «Deutsch-Französische Jahrbücher» (۵) میں شائع ہوا تھا۔ میری تحقیق و تلاش نے مجھے اس نتیجے پر پہنچایا کہ ریاست کی مختلف شکلوں کی طرح حقوق یا قانون کی کڑیوں کو بھی، نہ تو بجائے خود سمجھا جا سکتا ہے نہ اس کی مدد سے سلجھایا جاسکتا ہے جسے انسانی اسپرٹ کی عام اٹھان کہتے ہیں، بلکہ اس کے برخلاف باہمی حقوق کی جڑیں زندگی کے ان مادی تعلقات کے اندر اتری ہوئی ہیں جن کے مجموعے کو ہیگل فلسفی نے اٹھارویں صدی کے انگریز اور فرانسیسی ادیبوں کی دیکھا دیکھی "شہری سماج"، کا نام دیا ہے اور اگر اس شہری سماج کے کل پرزے معلوم کرنے ہوں تو سیاسی معاشیات میں تلاش کرنے ہوں گے۔ اس مضمون کا مطالعہ میں نے پیرس میں شروع کیا تھا اور جب وہاں سے مجھے مسٹر گیزو کے حکم سے جلاوطن کیا گیا تو میں بروسلز میں بس گیا اور یہاں بھی یہ مطالعہ جاری رکھا۔ میں اپنی تلاش میں جس عام نتیجے تک پہنچا اور جو بعد میں میری تحقیق کے لئے نشان راہ بنتا چلا گیا وہ مختصر طریقے سے یوں پیش کیا جا سکتا ہے:

لوگ جب مل کر زندگی میں کوئی چیز پیدا کرتے ہیں تو پیدا یا تیار کرتے وقت لازمی طور سے وہ باہم ایسے تعلقات بھی بنا لیتے ہیں جن تعلقات میں ان کی مرضی کا کوئی دخل نہیں ہوتا البتہ پیداوار میں یہ تعلقات ان کی مادی پیداواری طاقتوں کے اس خاص مرحلے سے (جس پر وہ پہنچے ہوں) ضرور میل کھاتے ہیں۔ پیداوار میں لوگوں کے ان باہمی تعلقات کی کل میزان ہے سماج کا معاشی ڈھانچہ یا وہ اصلی داغ بیل جس پر قانون اور سیاست کی عمارتیں چنی جاتی ہیں اور سماجی شعور کی مختلف شکلیں بھی اسی سے مناسبت رکھتی ہیں۔ مادی زندگی کا طریق پیداوار ہی عام طور سے زندگی کے سماجی، سیاسی اور ذہنی عمل کی راہیں طے کرتا ہے۔ وہ لوگوں کا شعور نہیں ہے جو زندگی کا رخ مقرر کرتا ہو بلکہ اس کے برخلاف لوگوں کی سماجی زندگی ان کے شعور کا رخ مقرر کرتی ہے۔ سماج کی مادی پیداواری طاقتیں جب ترقی کر کے ایک خاص مرحلے پر پہنچتی ہیں تو اس وقت کے پیداوار میں قائم شدہ تعلقات سے ان کا ٹکراؤ ہوتا ہے، یا اگر قانونی لفظوں



میں کہنا ہو تو یوں کہیں گے کہ ملکیت کے ان تعلقات سے ٹکرا جاتی ہیں جن کے ہوتے وہ اب تک ترقی کرتی رہی تھیں۔ پیداوار میں یہ تعلقات اب تک تو پیداواری طاقتوں کی ترقی کی شکل تھے، اب وہ ان کے پاؤں کی زنجیر بن جاتے ہیں۔ تب سماجی انقلاب کا دور شروع ہوتا ہے۔ معاشی اقتصادی بنیاد بدل جانے کے ساتھ کم و بیش تیزی کے ساتھ اوپر چنی ہوئی عمارتوں کی بھی کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ جب اس کایا پلٹ پر غور کیا جائے تو لازم ہے کہ پیداوار کے معاشی حالات میں اس مادی تبدیلی کو، جسے قدرتی سائنسوں کی سی ناپ تول کے ساتھ قطعی طور پر معلوم کیا جا سکتا ہے، ان قانونی، سیاسی، مذہبی، فنی اور فکری، مختصر یہ کہ ان نظریاتی شکلوں سے شناخت کرنا چاہئے جن کے ذریعے لوگ اس تصادم یا ٹکراؤ کا اظہار کرتے ہیں اور جن میں اس ٹکراؤ سے نکلنے کے لئے طاقت لگاتے ہیں۔ جس طرح ہم کسی آدمی کے متعلق اپنی رائے قائم کرنے میں یہ نہیں دیکھتے کہ وہ خود اپنے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے، عین اسی طرح کایا پلٹ کے کسی خاص دور پر فتوا دیتے وقت اس دور کے شعور کو بنیادی وجہ نہیں مان لینا چاہئے۔ اس کے برخلاف ہونا یہ چاہئے کہ اس شعور یا سوجھ بوجھ کی وجہ معلوم کی جائے مادی زندگی کے تضاد میں، اور اس بات میں کہ سماجی پیداواری طاقتوں کے اور پیداوار میں انسانی تعلقات کے درمیان کونسا ٹکراؤ چل رہا تھا۔ کوئی سماجی نظام اس وقت تک تلپٹ نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ تمام پیداواری طاقتیں جن کے پنپنے کی اس نظام میں گنجائش ہوتی ہے، خوب پھل پھول نہ چکی ہوں، پیداوار میں نئے اور زیادہ بلند سطح کے تعلقات اس وقت تک کبھی نہیں ابھرتے جب تک کہ اسی پرانے سماج کے وجود کے اندر سے اس کے لئے مادی حالات اور اسباب پک کر تیار نہ ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ عالم انسانیت اپنے ذمے وہی فریضے لیتا ہے جو وہ پورے کر سکے، چنانچہ اگر زیادہ غور کیا جائے تو ہمیشہ یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ خود فریضہ بھی تبھی سامنے آتا ہے جب اس کے لئے مادی حالات یا تو موجود ہوں یا کم از کم اتنا ہو کہ آگے بڑھتے بڑھتے کسی مقام پر ان کی نوبت آجائے۔ موئے اندازے سے یوں

کہیں گے کہ ایشیائی قدیم یونانی جاگیرداری اور موجودہ زمانے کا بورژوائی طریق پیداوار۔ ان سب کو معاشی سماجی بناوٹ کے درجہ بدرجہ مختلف دور سمجھنا چاہئے۔ پیداوار میں جو بورژوائی تعلقات ہیں وہ پیداوار کے سماجی عمل میں تنانٹی کی ایک آخری شکل ہیں، مطلب یہ نہیں کہ کوئی ذاتی کشاکش ہے بلکہ اس کا مطلب ہے کہ افراد کی زندگی کے سماجی حالات سے یہ تنانٹی اور ٹکراؤ کی صورت نکلتی ہے۔ یہی پیداواری طاقتیں جو بورژوائی سماج کے وجود کے اندر پنپتی ہیں، اس تنانٹی سے نکلنے کے مادی حالات و اسباب بھی پیدا کر دیتی ہیں۔ چنانچہ بورژوائی سماجی بناوٹ کے ہاتھوں انسانی سماج کے ماقبل تاریخ کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔

جب سے فریڈرک اینگلس کا وہ شاندار خاکہ شائع ہوا جو انہوں نے اقتصادی درجوں کی تنقید پر لکھا تھا \* (Deutsch-Französische Jahrbücher) (اخبار میں) میں ان کے ساتھ خط و کتابت کے ذریعے برابر تبادلہ خیالات کرتا رہا اور اینگلس دوسرے راستے سے (ملاحظہ ہو ان کی تصنیف "انگینڈ میں مزدور طبقے کی حالت ۱۸۴۴ء میں")، اسی نتیجے پر پہنچے جس پر میں پہنچا تھا اور جب ۱۸۴۵ء میں انہوں نے بھی بروسلز شہر کو اپنا مستقل ٹھکانہ بنا لیا تو ہم نے فیصلہ کیا کہ مل کر جرمن فلسفے کے نظریاتی خیالات کے توڑ پر اپنے خیالات کا پورا نقشہ تیار کریں، یا اصلیت میں، اپنے تب تک کے فلسفیانہ ضمیر کا حساب صاف کر دیں۔ اس فیصلے نے عملی جامہ یوں پہنا کہ ہیگل کے بعد کے فلسفے کی تنقید لکھی گئی۔ اس کتاب کا مسودہ، جو آٹھ ورق فی جز کے حساب سے دو موٹی موٹی جلدوں میں تھا، ویسٹ فالیہ میں اشاعت کے انتظار میں بہت دن پڑا رہا یہاں تک کہ ہمیں اطلاع دی گئی کہ حالات بدل جانے سے اب اس مسودے کی چھپائی نہیں ہو سکتی۔ ہم نے بڑی خوشی سے وہ مسودہ چوہوں کی کٹیلی تنقید کے سپرد

\* فریڈرک اینگلس "سیاسی معاشیات کی تنقید پر ایک نظر"، (ایڈیٹر)

\* مارکس، اینگلس "جرمن آئڈیالوجی"، (ایڈیٹر)



کر دیا کیوں کہ ہمارا جو اصل مقصد تھا کہ مسئلہ اپنی نظر میں صاف ہو جائے، وہ مقصد حاصل ہو چکا تھا۔ اور ان مختلف تحریروں میں سے، جو ہم نے اپنے نقطہ نظر کی کسی نہ کسی سمت سے تشریح کے خیال سے ان دنوں پبلک کے سامنے پیش کی تھیں، یہاں صرف چند کا تذکرہ کر دوں، ایک وہ، جس کی تصنیف میں اینگلز اور میں شریک ہیں، ”کمیونسٹ پارٹی کا مینی فیسٹو“\* اور ایک ”تجارت کی آزادی پر بیان“، جو خود میں نے شائع کرایا تھا۔ ہمارے خیالات کے فیصلہ کن نکتے پہلی بار علمی طریقے سے، اگرچہ ان میں مناظرے کا رنگ تھا، میری تصنیف ”فلسفے کا افلاس“، میں پیش ہوئے جو ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی اور اس کا رخ تھا فلسفی پرودھوں کے خلاف۔ ”مزدوری اور سرمایہ“\*\* نام کا ایک مقالہ، جہاں میں نے اس موضوع پر بروسلز جرمن ورکرز سوسائٹی (۶) کے سامنے دئے ہوئے اپنے سب لکچر جرمن زبان میں لکھے ہوئے جمع کر دئے تھے، ابھی پریس میں تھا کہ فروری ۱۸۴۸ء کے انقلاب (۷) اور اس کے بعد بروسلز سے میرے نکالے جانے کے سبب اشاعت سے رہ گیا۔

۱۸۴۸ء اور ۱۸۴۹ء کے زمانے میں »Neue Rheinische Zeitung« (۸) اخبار کی ایڈیٹری نے اور اس کے بعد کے واقعات نے معاشیات پر میرے مطالعے کا سلسلہ توڑ دیا جو لندن پہنچ کر کہیں ۱۸۵۰ء میں پھر جاری ہوا۔ برٹش میوزیم میں سیاسی معاشیات کی تاریخ کے موضوع پر جو زبردست ذخیرہ موجود ہے، وہ اور اس کے علاوہ خود لندن جو بورژوائی سماج کا مطالعہ اور مشاہدہ کرنے کے لئے بڑے موقع کی جگہ ہے اور اوپر سے اس سماج کی ترقی کا تازہ ترین مرحلہ جس میں سب سے تازہ کیلی فورنیا (امریکہ) اور آسٹریلیا میں سونے کی دریافت ہونا شامل ہے، ان حالات نے مجھ سے یہ فیصلہ کرایا کہ پھر شروع سے ہی مطالعہ کرنا چاہئے اور نئے میٹرل میں خوب چھان بین کرنی چاہئے۔ اس طرح لگ کر کام کرنے سے، کچھ تو یہ مطالعہ بجائے خود ایسے سوالوں کی طرف کھینچ لے گیا جو پہلی نظر میں اصل مضمون سے

\* اسی سلسلے کے حصہ اول میں شامل ہے۔ (ایڈیٹر)  
\*\* اسی سلسلے کے حصہ اول میں شامل ہے۔ (ایڈیٹر)

قطعی سے تعلق معلوم ہوتے تھے، لیکن ان پر مجھے تھوڑا بہت اور جم کر کام کرنا پڑا۔ کام کی جتنی مہلت ملی اس کا بھی ایک حصہ یوں کٹ گیا کہ گزر اوقات کے لئے کچھ کام کرنا اور وقت خرچ کرنا پڑتا تھا۔ اب مجھے پہلے انگریزی امریکی اخبار »New-York Daily Tribune« (۹) کے لئے کام کرتے آٹھ سال ہو گئے ہیں (اخبار کے لئے میں یوں بھی کسی خاص وجہ کے بغیر نہیں لکھتا) جس سے میرے علمی مشغلوں میں غیر معمولی خلل پڑتا رہا ہے اور ان کا سلسلہ اکثر ٹوٹتا رہا ہے۔ بہر حال انگلینڈ میں اور یورپ میں اقتصادی زندگی کے نمایاں واقعات پر مضامین لکھنے کی خاطر مجھے اخباروں میں اپنی محنت کا خاصہ بڑا حصہ لگا دینا پڑا اور مجبوراً ایسی عملی تفصیلات سے بھی آگاہی حاصل کرنا ضروری ہو گیا جو سیاسی معاشیات کے اصل علمی مضمون سے باہر کی بات ہیں۔

سیاسی معاشیات کے دائرے میں اپنی مصروفیت اور مطالعے کی رفتار کا جو تذکرہ میں نے یہاں کیا ہے، اس سے صرف اتنا ہی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ میرے یہ خیالات، چاہے ان کے بارے میں کوئی بھی فتوا دیا جائے اور حاکم طبقوں کے خود غرضانہ تعصبات سے چاہے وہ کتنی ہی کم مطابقت رکھتے ہوں، تاہم وہ دیانت داری کے ساتھ برسوں کی تلاش اور ریسرچ کا حاصل ہیں۔ رہا علم تو اس کے دروازے پر بھی باب دوزخ کی طرح یہی نقش ہونا چاہئے کہ:

«Qui si convien lasciare ogni sospetto;  
Ogni viltà convien che qui sia morta».\*

لندن، جنوری ۱۸۵۹ء  
یہ دیباچہ برلن ۱۸۵۹ء میں شائع ہونے والی کتاب »Zur Kritik der politischen Oekonomie von Karl Marx«. Erstes Heft. میں پہلی بار شائع ہوئی تھی۔

\* ”لڑتے قدموں کا اس جا گزر نہیں ہوتا  
نگاہ و دل کو یہاں کچھ خطر نہیں ہوتا۔“  
(دانتے - ”طریہ خداوندی“،)۔ (ایڈیٹر)



ویسٹن صاحب دیکھ لیں گے کہ میں اس خیال سے اتفاق رکھتا ہوں جس سے انہوں نے (میرا یہ اندازہ ہے) اپنے نظریاتی مقالے کی تیاری و ترتیب میں آغاز کیا ہوگا اگرچہ اب جو شکل ان مقالوں کی ابھر کر آئی وہ ایسی ہے کہ میرے خیال میں نظریاتی لحاظ سے باطل اور عملی لحاظ سے خطرناک ہوگی۔

خیر، اب میں سوال زیربحث کی طرف آتا ہوں۔

## ۱۔ پیداوار اور اجرت

ویسٹن صاحب کا سارا استدلال دو قیاسوں پر رکھا ہوا ہے :  
 اول یہ کہ ساری کی ساری قومی پیداوار کوئی ایک جامد چیز ہے، اس کی ایک مستقل مقدار یا علم حساب والوں کی زبان میں یوں کہیں کہ ایک قطعی حاصل جمع ہوتا ہے۔  
 دوسرے یہ کہ اصل اجرت کی کل رقم، یعنی سب اجرتیں مل ملا کر اس حساب سے جتنا مال وہ خرید سکتی ہوں، وہ بھی ایک جامد رقم ہے اور اس کا حاصل جمع بھی قطعی ہوتا ہے۔  
 اب یہ پہلا ہی دعوا صاف غلط نکلتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ سال بسال پیداوار کی ویلیو اور کل مقدار بڑھتی جاتی ہے، قومی محنت کی پیداواری طاقت برابر بڑھ رہی ہے، اور اس بڑھتی ہوئی پیداوار کو گردش میں رکھنے کے لئے جتنی نقد رقم کا ہونا لازمی ہے، اس کی مقدار بھی لگاتار بدلتی جا رہی ہے۔ ایک دوسرے سے مقابلہ یا موازنہ کرتے وقت جو بات پورے سال کے لئے یا مختلف برسوں کے لئے درست ہے، وہی کسی سال کے مختلف دنوں یا ہر ایک دن کے لئے درست ٹھہرتی ہے۔ قومی پیداوار کی کل مقدار یا حاصل جمع لگاتار بدلتی رہتی ہے۔ اس حاصل جمع کو ثبات نہیں، تغیر ہے۔ آبادی کی تعداد میں جو کمی بیشی ہوتی ہے، اس سے اگر قطع نظر کر لیا جائے، تب بھی قومی پیداوار کی کل مقدار ایک حال پر اس وجہ سے

کارل ماکس

## اجرت، قیمت اور منافع

### شروعات کے چند جملے

صاحبان!

نفس مضمون کی طرف آنے سے پہلے، شروعات کے چند جملے کہنے کی اجازت دیجئے۔  
 فی الحال پورے یورپ میں ہڑتالوں کی ایک وبا پھیلی ہوئی ہے اور اجرت بڑھوانے کی مانگ ہر طرف عام ہے۔ ہماری کانگریس میں یہ سوال زیربحث آئے گا۔ آپ لوگ جو انٹرنیشنل ایسوسی ایشن (۱۱) کے سربراہ ہیں، آپ کی رائے اس نہایت اہم مسئلے پر خوب جچی تلی ہوئی چاہئے۔ لہذا میں اسے اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ مسئلے کی جڑ بنیاد تک پہنچوں اور اس کی خاطر آپ صاحبان کی قوت برداشت کو امتحان میں ڈالنے کا خطرہ بھی مول لے رہا ہوں۔

شروع کرتے وقت دوسرا ریمارک مجھے ویسٹن صاحب کی بابت دینا ہے۔ انہوں نے مزدور طبقے کے مفاد کی خدمت کے خیال سے نہ صرف آپ کے سامنے بلکہ پبلک کے سامنے کھلے طور پر ایسے خیالات کی حمایت کی ہے جو مزدور طبقے میں، جیسا کہ انہیں خبر ہوگی، انتہائی ناپسندیدہ ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کے دل میں اخلاقی جرات کے ایسے اظہار کی بڑی قدر ہونی چاہئے۔ مجھے امید ہے کہ اگرچہ میری تقریر کا لب و لہجہ تیکھا ہوگا، لیکن اس کے تمام ہونے پر



نہیں ر سکتی کہ سرمائے کا ذخیرہ ہونا اور محنت کی پیداواری طاقت یہ دونوں لگاتار بدلتے رہتے ہیں۔ یہ بالکل درست ہے کہ اگر کسی روز اجرتوں کا عام معیار چڑھ جائے تو چاہے بعد میں کچھ بھی نتیجے نکلیں، تاہم صرف اس معیار کے چڑھ جانے سے پیداوار کے حاصل جمع پر براہ راست کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جو صورت حال اس وقت ہوگی شروع میں اسی کی بنیاد پر کام چلتا رہے گا۔ لیکن اگر قومی پیداوار اجرتیں بڑھ جانے سے پہلے تک کوئی جامد نہیں بلکہ متحرک یا بدلتی رہنے والی کل مقدار ہے تو پھر اجرتیں بڑھ جانے کے بعد بھی وہ جامد نہیں بلکہ متحرک ہی رہے گی۔

اچھا فرض کریں کہ قومی پیداوار کی کل مقدار متحرک نہیں بلکہ جامد یا ایک حال پر رہنے والی ہے۔ تب بھی وہ بات جسے ہمارے دوست ویسٹن ایک منطقی نتیجہ سمجھ رہے ہیں لفظی الٹ پھیر کے سوا اور کچھ نہیں ٹھہرتی۔ اگر ایک مقررہ عدد ہمارے سامنے ہے، فرض کیجئے آٹھ ہے، تو آٹھ کے عدد کی جو واقعی حد ہے، اس کے اندر رہ کر باقی دوسرے عدد اپنی باہمی نسبت آسانی سے بدل سکتے ہیں۔ اس آٹھ کے عدد میں اگر منافع کا عدد چھ ہے اور اجرت کا دو تو یہ ممکن ہے کہ اجرت بڑھ کر ۲ ہو جائے اور منافع دو رہ جائے۔ یوں بھی دونوں کی جمع آٹھ ہوگی۔ پس معلوم ہوا کہ پیداوار کی کل مقدار کے نہ بدلنے کا کسی صورت میں بھی یہ مطلب نہیں نکلتا کہ اجرتوں کی کل مقدار بھی ایک حال پر رہی ہو۔ اس صورت میں ہمارے دوست ویسٹن کیونکر ثابت کرتے ہیں کہ اجرت کی کل مقدار ایک حال پر رہتی ہے؟ ثابت ہی نہیں کرتے، اس پر اصرار کرتے ہیں۔

چلئے، ان کا یہ اصرار بھی مان لیا۔ تب تو اسے دونوں سمتوں میں کارگر ہونا چاہئے، لیکن وہ صرف ایک سمت میں اسے کارگر دکھاتے ہیں۔ اگر اجرتوں کی کل مقدار ایسی حاصل جمع کا نام ہے جو بدلتی نہیں، تو پھر نہ وہ بڑھنی چاہئے، نہ گھٹنی۔ مطلب یہ کہ اگر مزدور عارضی طور سے اپنی اجرتیں بڑھوانے کی کوشش کرتے ہیں تو

ان کی یہ حرکت معقول نہیں ہے، تب سرمایہ داروں کی بھی یہ حرکت نامعقول ہوئی کہ وہ عارضی طور سے ان کی اجرتیں گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے دوست ویسٹن کو اس سے انکار نہیں کہ خاص حالات میں مزدور یہ کر سکتے ہیں کہ سرمایہ داروں کو مجبور کر کے اپنی اجرتیں بڑھوا لیں، لیکن چونکہ اجرتوں کی کل مقدار قدرتی طور سے معین معلوم ہوتی ہے، اس لئے اجرتیں بڑھوا لینا آخر رنگ لائے گا۔ دوسری طرف سے وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ سرمایہ دار یہ کر سکتے ہیں کہ اجرتیں گھٹا دیں اور سیچ پوچھئے تو وہ مستقل اسی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ لیکن اجرتوں کی مجموعی مقدار ایک حال پر رہنے کا اصول یہ کہتا ہے کہ اجرتیں گھٹانا بھی، اجرتیں بڑھوا لینے کی طرح رنگ لاتا ہے۔ چنانچہ اجرتیں گھٹائے جانے یا گھٹانے کی کوشش ہونے کے جواب میں محنت کش صحیح کارروائی کرتے ہیں۔ ان کی طرف سے یہ صحیح کارروائی ہے کہ اپنی اجرتیں بڑھوائیں کیوں کہ اجرتیں گھٹانے کی جوابی کارروائی یہی ہوگی کہ اجرتیں بڑھوانے کے لئے کارروائی کی جائے۔ ویسٹن صاحب کے نزدیک اجرتوں کے ایک حال پر رہنے کا اصول یہ کہتا ہے کہ محنت کشوں کو بعض خاص حالات میں یہ کرنا چاہئے کہ اجرتیں بڑھوانے کے لئے متحد ہوں اور اس کی پوری کوشش کریں۔

اگر انہیں اس نتیجے سے انکار ہے تو پھر جس قیاس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے اسی قیاس سے انکار کریں۔ انہیں یہ نہیں کہنا چاہئے کہ اجرتوں کی کل مقدار ایک جامد مقدار ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اجرتوں کی کل مقدار نہ تو بڑھ سکتی ہے اور نہ اسے بڑھنا چاہئے، البتہ جب بھی سرمایہ مناسب جانے، وہ گھٹ سکتی ہے اور اسے گھٹ جانا چاہئے۔ اگر سرمایہ دار کے دل میں نیکی آئے کہ وہ آپ کو گوشت کی جگہ آلو اور گیہوں کے بجائے جو کھلائے تو آپ اس کی یہ مرضی سیاسی معاشیات کا قانون سمجھ کر پوری کیجئے اور اس کے سامنے سر جھکا دیجئے۔ اب اگر ایک ملک میں اجرتیں دوسرے ملک کی اجرتوں سے زیادہ ہیں، مثلاً یہ کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں



انگلینڈ سے زیادہ ہیں تو آپ اجرتوں کے معیار کے اس فرق کی یہ تشریح کر سکتے ہیں کہ امریکی سرمایہ دار کی مرضی اور برطانوی سرمایہ دار کی مرضی میں فرق پڑتا ہے۔ یہ ایسی ترکیب ہے جو صرف معاشی اقتصادی مظاہر کو ہی نہیں بلکہ اور تمام مظاہر کے مطالعے کو بھی بے حد آسان اور سیدھا سادہ بنا دیتی ہے۔

پھر اس معاملے میں بھی ہم وہی سوال اٹھا سکتے ہیں: آخر امریکی سرمایہ دار کی مرضی برطانوی سرمایہ دار کی مرضی سے مختلف کیوں ہے؟ اس کا جواب دینے کے لئے آپ کو مرضی کے دائرے سے باہر کہیں جانا پڑے گا۔ ایک پادری یہ کہہ سکتا ہے کہ خدا کی مشیت فرانس میں اور ہے اور انگلینڈ میں کچھ اور۔ اس پر بھی اگر میں اصرار کروں کہ آخر پروردگار کے ہاں مشیت کی یہ دوئی کیوں ہے تو وہ ہچکچائے بغیر جواب دے سکتا ہے کہ خدا کی باتیں خدا ہی جانے، فرانس میں اس کی ایک مرضی ہے، انگلینڈ میں دوسری۔ مگر ظاہر ہے کہ ہمارے دوست ویسٹن اس قسم کی دلیل میں پناہ نہیں لینے والے جہاں کسی طرح کے استدلال کی گنجائش نہ رہے۔

اس میں شک نہیں کہ سرمایہ دار کی مرضی ہے کہ جتنا زیادہ سے زیادہ وصول کرسکے، کرلے۔ لیکن ہمارا کام یہ نہیں کہ اس کی مرضی کی تشریح کرتے پھریں بلکہ ہمارا کام یہ ہے کہ سرمایہ دار کی طاقت کا کھوج لگائیں، اس طاقت کی حدود کا اور ان حدود کی نوعیت کا پتہ لگائیں۔

## ۲۔ پیداوار، اجرت اور منافع

ویسٹن صاحب نے جو خطبہ ہمیں سنایا ہے اس کا لب لباب پیش کیا جاسکتا ہے۔

ان کی ساری دلیلیں گھوم پھر کر یہیں آتی ہیں کہ: اگر مزدور طبقہ سرمایہ دار طبقے کو مجبور کر کے نقد اجرت کی صورت میں چار کے بجائے پانچ شلنگ وصول کرتا ہے تو سرمایہ دار اس کے جواب میں

جو سامان دے گا وہ پانچ کا نہیں، چار شلنگ کی مالیت کا ہوگا۔ اب مزدور طبقے کی جیب سے اسی سامان کے پانچ شلنگ جائیں گے جس کے وہ اجرت بڑھنے سے پہلے چار شلنگ دیا کرتا تھا۔ مگر ایسا ہوتا ہی کیوں ہے؟ سرمایہ دار پانچ شلنگ کے بدلے میں صرف چار شلنگ کی مالیت کا سامان ہی کیوں دیتا ہے؟ کیوں کہ اجرت کی رقم مقرر ہے۔ مگر وہ چار شلنگ کی مالیت کے سامان پر ہی کیوں ٹھیری ہوئی ہے؟ تین یا دو شلنگ یا کسی اور رقم پر کیوں مقرر نہیں؟ اگر اجرت کی رقم کی حد کسی معاشی قانون سے طے پاتی ہے، وہ نہ سرمایہ دار کی مرضی کی تابع ہے، نہ محنت کش کی مرضی کی پابند۔ تو ویسٹن صاحب کو پہلا کام یہ کرنا چاہئے تھا کہ وہ قانون بیان کریں اور اسے ثابت کر دیں۔ اس کے علاوہ انہیں یہ بھی ثابت کرنا چاہئے تھا کہ اجرت کی رقم جو کسی ایک وقت میں ادا کی جاتی ہے وہ ہمیشہ اتنی ہی ہوتی ہے جسے لازمی رقم شمار کیا جائے۔ اس تناسب سے کبھی ادھر یا ادھر نہیں ہوتی۔ اب اگر ایسا ہوتا کہ اجرت کی موجودہ رقم کی حدیں یا تو سرمایہ دار کی محض ذاتی مرضی پر منحصر ہوتیں یا اس کے لالچ کی حدوں کی پابند ہوتیں تو یہ حدیں من مانی ہیں، ان میں کچھ بھی لازمی اور قطعی نہیں، سرمایہ دار کی مرضی کے مطابق بھی بدل سکتی ہیں اور مرضی کے خلاف بھی۔

ویسٹن صاحب نے اپنے نظریے کی تصویر یوں کھینچی ہے کہ اگر ایک دیگچی میں شوربے کی مقررہ مقدار سمائی ہے جو گنتی کے مقررہ آدمیوں کے لئے تیار کی گئی ہے، چمچہ یا کفگیر اگر اور بڑا ہو جائے تو اس سے شوربے کی مقدار نہیں بڑھ جائے گی۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ اس مثال میں چمچہ بہت پھرا دیا گیا ہے۔ اس پر مجھے ایک ایسا ہی واقعہ یاد آ گیا جسے منینی آگریا نے بیان کیا ہے۔ جب روم کی پرچا (plebeians) نے روم کے آقاؤں (patricians) کے خلاف ہڑتال کی تو آقا آگریا نے ان سے کہا کہ پتریشین (مالک) پیٹ سے ملک کے بدن کے پلے بین (پرچاوالے) اعضا کو غذا پہنچتی ہے۔ تاہم وہ یہ کہنے سے چوک گیا کہ ایک کا پیٹ بھر کر دوسرے کے اعضا کو غذا پہنچائی جا سکتی ہے۔ ویسٹن صاحب بھی چوک گئے کہ



جس دیگچی سے محنت کشوں کو غذا ملتی ہے وہ قومی محنت کی پوری پیداوار سے بھری جاتی ہے، وہ چیز جو انہیں دیگچی میں سے کچھ زیادہ لینے سے روکتی ہے وہ دیگچی کا چھوٹا ہونا یا اس کے اندر کا مال تھوڑا ہونا نہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ ان کے چمچے چھوٹے ہیں۔ وہ کونسی ہوشیاری ہے جس سے ایک سرمایہ دار یہ راستہ نکال لیتا ہے کہ چار شلنگ کی مالیت پانچ شلنگ میں دے؟ جو مال اسے فروخت کرنا ہے اس کی قیمت بڑھا کر یہ راستہ نکالا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ قیمت کا بڑھنا، بلکہ عام طور سے مال کی قیمتوں کا گھٹنا بڑھنا یا مال کی قیمتیں محض سرمایہ دار کی مرضی پر منحصر ہیں؟ یا یوں ہے کہ اس مرضی کو عمل میں لانے کے لئے کچھ اور شرطوں کا ہونا لازم ہے؟ اگر ان حالات کا، ان شرائط کا تقاضا نہ ہو تو بازار بھاؤ کا تیز یا مندا ہونا، اس کا لگاتار بدلتے رہنا ایک بن بوجھی پہیلی بن جائے۔

اگر ہم فرض کر لیتے ہیں کہ نہ تو محنت کی قوت پیداوار میں کوئی تبدیلی ہوئی، نہ سرمائے اور محنت کی اس مقدار میں کوئی فرق پڑا جو لگی ہوئی ہے، نہ روپے کی اس مالی حیثیت میں فتور آیا جس کے ذریعے سامان کی قیمتیں لگائی جاتی ہیں۔ بلکہ صرف اجرت کے معیار میں فرق آیا ہے تو پھر وہ کون سا طریقہ ہے جس سے اجرتوں کے بڑھ جانے کا اثر مال کی قیمتوں پر پڑ جاتا ہے؟ اجرتوں کا بڑھنا قیمتوں پر صرف اسی صورت میں اثر ڈالتا ہے کہ مال کی مانگ اور سپلائی کے درمیان جو اصلی نسبت ہے اس نسبت کو متاثر کر دیتا ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ مزدور طبقہ۔ اس کی پوری تعداد نظر میں رکھتے تو۔ اپنی آمدنی سب سے مقدم ضروریات پر خرچ کرتا ہے اور اس خرچ پر مجبور ہوتا ہے۔ اس لئے جوں ہی اجرتوں کا معیار عام طور پر اونچا اٹھتا ہے، ضروریات کی سب سے مقدم چیزوں کی مانگ بھی بڑھ جاتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ بازار بھاؤ بھی اسی کے ساتھ بڑھ جاتے ہیں۔ بازار میں آنے والا یہ سامان جن سرمایہ داروں کے ہاتھ سے نکلتا ہے، وہ اگر ایک طرف اجرت بڑھاتے ہیں تو دوسری طرف اپنے سامان کے بازار بھاؤ بڑھا کر حساب برابر کر لیتے ہیں۔ مگر ان

سرمایہ داروں کا کیا بنے گا جو سب سے مقدم ضروریات کا سامان تیار نہیں کرتے؟ ایسے سرمایہ دار کچھ کم ہوں گے، یہ سوچنا بھی نہیں چاہئے۔ اگر آپ یہ دھیان میں رکھیں کہ قومی پیداوار کی دو تہائی کا استعمال آبادی کا صرف پانچواں حصہ کرتا ہے۔ بلکہ حال میں ہی دارالعوام کے ایک نمبر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ آبادی کا صرف ساتواں حصہ ان کا استعمال کرتا ہے۔ تو سوچنے کی بات ہے کہ قومی پیداوار کا کتنا زبردست حصہ صرف عیش و آسائش کے سامان کے طور پر تیار کیا جاتا ہے یا ایسے سامان سے اس کا تبادلہ کیا جاتا ہے، اور مقدم ضروریات زندگی کا کتنا زبردست حصہ ہوگا جو فالتو خدمتگاروں پر، گھوڑوں، بلیوں وغیرہ پر ضائع کیا جاتا ہے۔ ہمیں اپنے تجربے سے معلوم ہے کہ جوں ہی مقدم ضروریات زندگی کے سامان کے بھاؤ بڑھنے لگتے ہیں، اس فضول خرچی کی حدیں ہمیشہ سکڑ جاتی ہیں۔

خیر، تو ان سرمایہ داروں کی پوزیشن کیا ہوگی جو ضروریات زندگی کا سامان تیار نہیں کرتے؟ کیوں کہ اجرتیں عموماً بڑھ جانے سے ان کے منافع کی شرح تو گرے گی اور وہ اپنے مال کے بھاؤ بڑھوا کر اس لئے حساب برابر نہیں کر سکتے کہ اس مال کی مانگ نہیں بڑھتی۔ ایسے سرمایہ داروں کی آمدنی گھٹے گی اور گھٹنے پر بھی انہیں ضروریات کا مہنگا سامان خریدنے کے لئے زیادہ خرچ کرنا پڑے گا۔ مگر یوں نہیں ہوتا۔ جب ان کی آمدنی گھٹتی ہے تو انہیں عیش و آسائش کے سامان پر اپنا خرچ گھٹانا پڑتا ہے اور اس صورت میں خود انہی کے اپنے مال پر آپس میں ایک دوسرے کی مانگ بھی گھٹتی چلی جاتی ہے۔ ہوتے ہوتے نتیجہ یہ کہ ان کے مال کی قیمتیں گرتی ہیں۔ اس کا اثر یہ کہ صنعت کی ان شاخوں میں منافع کی شرح اتر جاتی ہے اور یہ اترتی ہے اجرتوں کا معیار عام طور پر بڑھ جانے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے بھی کہ اجرتوں کا معیار عموماً بڑھ جانا، مقدم ضروریات کی چیزوں کے بھاؤ چڑھ جانا اور عیش و آسائش کے سامان کی قیمتوں کا گرجانا، سب مل کر اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔



جس دیگچی سے محنت کشوں کو غذا ملتی ہے وہ قومی محنت کی پوری پیداوار سے بھری جاتی ہے، وہ چیز جو انہیں دیگچی میں سے کچھ زیادہ لینے سے روکتی ہے وہ دیگچی کا چھوٹا ہونا یا اس کے اندر کا مال تھوڑا ہونا نہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ ان کے چمچے چھوٹے ہیں۔ وہ کونسی ہوشیاری ہے جس سے ایک سرمایہ دار یہ راستہ نکال لیتا ہے کہ چار شلنگ کی مالیت پانچ شلنگ میں دے؟ جو مال اسے فروخت کرنا ہے اس کی قیمت بڑھا کر یہ راستہ نکالا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ قیمت کا بڑھنا، بلکہ عام طور سے مال کی قیمتوں کا گھٹنا بڑھنا یا مال کی قیمتیں محض سرمایہ دار کی مرضی پر منحصر ہیں؟ یا یوں ہے کہ اس مرضی کو عمل میں لانے کے لئے کچھ اور شرطوں کا ہونا لازم ہے؟ اگر ان حالات کا، ان شرائط کا تقاضا نہ ہو تو بازار بھاؤ کا تیز یا مندا ہونا، اس کا لگاتار بدلتے رہنا ایک بن بوجھی پہیلی بن جائے۔

اگر ہم فرض کر لیتے ہیں کہ نہ تو محنت کی قوت پیداوار میں کوئی تبدیلی ہوئی، نہ سرمائے اور محنت کی اس مقدار میں کوئی فرق پڑا جو لگی ہوئی ہے، نہ روپے کی اس مالی حیثیت میں فتور آیا جس کے ذریعے سامان کی قیمتیں لگائی جاتی ہیں۔ بلکہ صرف اجرت کے معیار میں فرق آیا ہے تو پھر وہ کون سا طریقہ ہے جس سے اجرتوں کے بڑھ جانے کا اثر مال کی قیمتوں پر پڑ جاتا ہے؟ اجرتوں کا بڑھنا قیمتوں پر صرف اسی صورت میں اثر ڈالتا ہے کہ مال کی مانگ اور سپلائی کے درمیان جو اصلی نسبت ہے اس نسبت کو متاثر کر دیتا ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ مزدور طبقہ۔ اس کی پوری تعداد نظر میں رکھتے تو۔ اپنی آمدنی سب سے مقدم ضروریات پر خرچ کرتا ہے اور اس خرچ پر مجبور ہوتا ہے۔ اس لئے جو ہی اجرتوں کا معیار عام طور پر اونچا اٹھتا ہے، ضروریات کی سب سے مقدم چیزوں کی مانگ بھی بڑھ جاتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ بازار بھاؤ بھی اسی کے ساتھ بڑھ جاتے ہیں۔ بازار میں آنے والا یہ سامان جن سرمایہ داروں کے ہاتھ سے نکلتا ہے، وہ اگر ایک طرف اجرت بڑھاتے ہیں تو دوسری طرف اپنے سامان کے بازار بھاؤ بڑھا کر حساب برابر کر لیتے ہیں۔ مگر ان

سرمایہ داروں کا کیا بنے گا جو سب سے مقدم ضروریات کا سامان تیار نہیں کرتے؟ ایسے سرمایہ دار کچھ کم ہوں گے، یہ سوچنا بھی نہیں چاہئے۔ اگر آپ یہ دھیان میں رکھیں کہ قومی پیداوار کی دو تہائی کا استعمال آبادی کا صرف پانچواں حصہ کرتا ہے۔ بلکہ حال میں ہی دارالعوام کے ایک سمبرنے تو یہاں تک کہہ دیا کہ آبادی کا صرف ساتواں حصہ ان کا استعمال کرتا ہے۔ تو سوچنے کی بات ہے کہ قومی پیداوار کا کتنا زبردست حصہ صرف عیش و آسائش کے سامان کے طور پر تیار کیا جاتا ہے یا ایسے سامان سے اس کا تبادلہ کیا جاتا ہے، اور مقدم ضروریات زندگی کا کتنا زبردست حصہ ہوگا جو فالتو خدمتگاروں پر، گھوڑوں، بلیوں وغیرہ پر ضائع کیا جاتا ہے۔ ہمیں اپنے تجربے سے معلوم ہے کہ جو ہی مقدم ضروریات زندگی کے سامان کے بھاؤ بڑھنے لگتے ہیں، اس فضول خرچی کی حدیں ہمیشہ سکڑ جاتی ہیں۔

خیر، تو ان سرمایہ داروں کی پوزیشن کیا ہوگی جو ضروریات زندگی کا سامان تیار نہیں کرتے؟ کیوں کہ اجرتیں عموماً بڑھ جانے سے ان کے منافع کی شرح تو گرے گی اور وہ اپنے مال کے بھاؤ بڑھوا کر اس لئے حساب برابر نہیں کر سکتے کہ اس مال کی مانگ نہیں بڑھتی۔ ایسے سرمایہ داروں کی آمدنی گھٹے گی اور گھٹنے پر بھی انہیں ضروریات کا منہنگا سامان خریدنے کے لئے زیادہ خرچ کرنا پڑے گا۔ مگر یوں نہیں ہوتا۔ جب ان کی آمدنی گھٹتی ہے تو انہیں عیش و آسائش کے سامان پر اپنا خرچ گھٹانا پڑتا ہے اور اس صورت میں خود انہی کے اپنے مال پر آپس میں ایک دوسرے کی مانگ بھی گھٹتی چلی جاتی ہے۔ ہوتے ہوتے نتیجہ یہ کہ ان کے مال کی قیمتیں گرتی ہیں۔ اس کا اثر یہ کہ صنعت کی ان شاخوں میں منافع کی شرح اتر جاتی ہے اور یہ اترتی ہے اجرتوں کا معیار عام طور پر بڑھ جانے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے بھی کہ اجرتوں کا معیار عموماً بڑھ جانا، مقدم ضروریات کی چیزوں کے بھاؤ چڑھ جانا اور عیش و آسائش کے سامان کی قیمتوں کا گرجانا، سب مل کر اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔



صنعت کی مختلف شاخوں میں لگے ہوئے سرمایوں کو جب منافع کی شرح میں یہ فرق پڑے گا تو اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ لازمی بات ہے کہ وہی نتیجہ نکلے گا جو چاہے کسی حالت میں بھی ہو اور کسی سبب سے بھی ہو، لیکن پیداوار کے مختلف دائروں میں اوسط شرح منافع پر فرق پڑنے سے نکلتا۔ سرمایہ اور محنت دونوں کم نفع کی شاخوں سے نکل کر زیادہ نفع والی شاخوں کا رخ کرتے ہیں اور ایک سے دوسری میں ڈھلنے کا یہ سلسلہ تب تک چلتا رہتا ہے جب تک کہ صنعت کی بعض شاخوں میں مال کی سپلائی بڑھی ہوئی مانگ سے میل نہ کھائے اور صنعت کی دوسری شاخوں میں سپلائی کم ہوتے ہوئے گھٹی ہوئی مانگ کے برابر نہ آجائے۔ جب دونوں پلڑوں میں یہ ادل بدل ہو چکتی ہے تو صنعت کی مختلف شاخوں میں شرح منافع کا اوسط ایکساں ہو جاتا ہے۔ چونکہ یہ ساری اونچ نیچ شروع ہوئی تھی صرف اس بات سے کہ مختلف مالوں کی رسد اور طلب کے باہمی توازن میں فرق پڑ گیا تھا، لہذا سبب دور ہونے پر اس کا اثر بھی جاتا رہا اور قیمتیں پھر پہلے کی سطح پر اور باہمی توازن پر پہنچ گئیں۔ منافع کی شرح کا گرنا، جو اجرتیں بڑھنے کا نتیجہ ہوتا ہے، صنعت کی بعض شاخوں تک محدود رہنے کے بجائے سب میں عام ہو جاتا ہے۔ ہم نے جو فرض کیا تھا اس کی رو سے، نہ تو محنت کی قوت پیداوار میں فرق پڑا، نہ پیداوار کی کل میزان میں، البتہ تیار ہونے والے سامان کی کل مقدار کی صرف شکل بدل گئی۔ چنانچہ اب تیار ہونے والے سامان کا بڑا حصہ سب سے مقدم ضروریات زندگی کی شکل میں موجود ہے اور تھوڑا حصہ آسائش کے سامان کی صورت میں، یا اسی کو یوں کہیں کہ تھوڑا حصہ ایسا ہے جو عیش و آسائش کے بدیسی سامان سے بدلا جاتا ہے اور بیشتر اپنی اصل شکل میں ہی کھپ جاتا ہے، یا پھر اسی بات کو یوں کہا جاسکتا ہے کہ دیسی پیداوار کا بڑا حصہ ایسا ہے جو آسائش کے سامان کے بدلے میں نہیں بلکہ بدیسی سامان ضرورت کے تبادلے میں جاتا ہے۔ لہذا جب اجرتوں کا معیار عام طور سے اونچا ہوتا ہے تو بازار کے بھاؤ میں تھوڑی بہت اونچ نیچ ضرور آتی

ہے، لیکن اس کے اثر سے صرف منافع کی شرح عام طور پر گر جاتی ہے۔ البتہ یہ نہیں ہوتا کہ مال کی قیمتوں میں کوئی مستقل تبدیلی ہو جائے۔

اگر مجھ سے کہا جائے کہ اوپر جو دلیل دی ہے اس میں یہ فرض کر کے چلاؤں کہ اجرت میں جتنا اضافہ ہوگا وہ سارے کا سارا مقدم ضروریات زندگی پر خرچ ہو جائے گا تو جواب میں مجھے یہ کہنا ہے کہ میں نے فرض کرنے میں ویسٹن صاحب کی سہولت کو مدنظر رکھا ہے۔ اگر اجرت کے اضافے کی رقم ایسی چیزوں پر خرچ ہونے لگے جو مزدور پہلے استعمال نہیں کیا کرتے تھے تو پھر یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں رہتی کہ مزدوروں کی اصل قوت خرید بڑھ گئی۔ تاہم چونکہ ان کی قوت خرید کا یہ اضافہ محض نتیجہ ہے اجرت کے بڑھنے کا، اس لئے جس نسبت سے اجرت بڑھے اسی نسبت سے سرمایہ داروں کی قوت خرید گھٹتی چاہئے۔ اگر ایسا ہوتا تو مال کی جتنی مانگ ہوتی ہے اس کا عام ناپ تول نہ بڑھتا بلکہ مانگ کے اندر ضروریات اور آسائش کے سامانوں کا تناسب بدل جاتا۔ ایک طرف سے پلہ جھکتا تو دوسری طرف سے اٹھ جاتا۔ اور پھر چونکہ مانگ کی مجموعی مقدار جوں کی توں بنی رہتی تو مال کے بازار بھاؤ میں بھی کوئی فرق نہیں پڑنا چاہئے تھا۔

یہاں ایک اور گتھی پڑتی ہے: یا تو یوں ہے کہ اجرتوں کا اضافہ استعمال کی سبھی چیزوں پر مساوی حیثیت سے خرچ ہوتا ہے، اس صورت میں مزدور طبقے کی طرف سے مانگ بڑھنے میں سرمایہ دار طبقے کی طرف سے مانگ گھٹنا لازم آتا ہے، یا پھر یوں ہے کہ اجرتوں کا اضافہ استعمال کی صرف بعض چیزوں پر ہی خرچ ہوتا ہے جن کا بازار بھاؤ عارضی طور سے تیز ہو جاتا ہے، اس صورت میں صنعت کی بعض شاخوں میں شرح منافع کا بڑھنا اور اسی نسبت سے دوسری شاخوں میں شرح منافع کا گرنا یہ رنگ لائے گا کہ سرمایہ اور محنت اپنے اپنے ٹھکانے بدلیں اور تب تک بدلتے رہیں جب تک کہ کسی کسی صنعت میں سپلائی بڑھی ہوئی مانگ سے میل نہ کھائے اور دوسری صنعت میں گھٹتی گھٹتی وہ مانگ کی سطح پر نہ آجائے۔ اگر ہمارا پہلا



فرض درست ہے تو مال کی قیمتوں میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں ہونے والی، اور اگر دوسرا درست ہے تو بازار بھاؤ میں تھوڑی بہت اونچ نیچ ہونے کے بعد مال کی قوت تبادلہ وہیں آکر ٹھہرے گی جہاں وہ پہلے تھی۔ دونوں مفروضوں کا حاصل یہ ہوا کہ اجرتوں کا عام معیار بڑھ جانے سے اگر کوئی آخری نتیجہ نکلنے والا ہے تو وہ صرف اسی قدر ہے کہ شرح منافع عام طور سے گر جائے۔

آپ کے تخیل پر زور دینے کی خاطر ویسٹن صاحب تجویز کرتے ہیں کہ زرا آپ غور فرمائیں اور ان مشکلات کا اندازہ کریں جو انگلستان کے فارسیوں میں کام کرنے والوں کی اجرت نو کے بجائے اٹھارہ شلنگ کر دینے سے پیش آئیں گی۔ وہ آپ کو چونکاتے ہیں کہ زرا غور تو کیجئے؛ ایسا ہوا تو مقدم ضروریات زندگی کی مانگ کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی اور اس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ قیمتیں بڑھتے بڑھتے بھیانک حد کو پہنچیں گی۔ آپ صاحبان واقف ہیں کہ امریکہ کے فارسیوں میں کام کرنے والوں کا اوسط اجرت انگلستان کے فارسیوں کے مزدوروں سے دو گنے سے بھی کچھ زیادہ ہے اگرچہ امریکہ میں زراعتی پیداوار کا سامان برطانیہ عظمیٰ کے مقابلے میں سستا ہے، اور محنت اور سرمائے کے درمیان عام تعلقات امریکہ میں بھی وہی ہیں جو انگلینڈ میں ہیں، اگرچہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی سالانہ پیداوار انگلینڈ کی سالانہ پیداوار سے بہت کم ہے۔ تو پھر ہمارے یہ دوست کیوں خطرے کی گھنٹی بجا رہے ہیں؟ صرف اس خیال سے کہ ہمارے سامنے جو اصل سوال ہے وہ ٹل جائے۔ اجرت کا نو سے ایک دم اٹھارہ شلنگ ہو جانے کا مطلب یہ ہوا کہ اجرت ایکایک سو فیصدی بڑھ جائے۔ مگر سوال زیر بحث یہ ہئی نہیں کہ کیا انگلستان میں اجرت کا عام معیار ایک دم سو فیصدی بڑھ سکتا ہے؟ ہمیں اس بات سے قطعی کوئی واسطہ نہیں کہ اجرت کا اضافہ کس قدر ہو کیوں کہ جہاں بھی یہ سوال اٹھے گا خود وہاں کے حالات پر منحصر ہوگا اور انہی کی مناسبت سے وہ فیصلہ ہوگا۔ ہمیں تو صرف اتنی بات صاف کرنی ہے کہ اگر اجرتوں کا معیار عام طور سے بڑھے، چاہے وہ ایک فیصدی سے بھی آگے نہ بڑھے، تو اس کے نتیجے کیا ہوں گے۔

ہمارے دوست ویسٹن نے اجرت میں سو فیصدی اضافے کے جو خیالی گھوڑے دوڑائے ہیں، انہیں رد کر کے میں آپ کی توجہ اس طرف لانا چاہتا ہوں کہ ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۹ء کے عرصے میں برطانیہ عظمیٰ کے اندر اجرتیں واقعی کتنی بڑھی ہیں۔

آپ سب پر روشن ہے کہ ۱۸۴۸ء میں دس گھنٹے کے کام کا بل، بلکہ ساڑھے دس گھنٹے کام کا بل پیش کیا گیا تھا (۱۲)۔ یہ ایک نہایت اہم اقتصادی تبدیلی تھی جو ہماری آنکھوں کے سامنے آئی۔ اس بل کا مطلب تھا کہ اجرتیں ایک دم اور لازمی طور سے بڑھائی جائیں، کسی ایک مقامی کاروبار میں نہیں بلکہ صنعت کی ان نمایاں شاخوں میں جن کے سہارے انگلستان عالمی منڈی پر حاوی ہو گیا ہے۔ اجرتوں میں یہ اضافہ ایسے حالات میں کیا گیا جو نہایت ہی ناسازگار تھے۔ ڈاکٹر یور، پروفیسر سینٹر اور ان تمام ماہرین معاشیات نے جو بورژوازی کے حق میں سرکاری ترجمانی کرتے ہیں، ثابت کر دیا تھا، بلکہ میں کہوں کہ ہمارے دوست مسٹر ویسٹن کی منطق دلیلوں سے کچھ زیادہ ہی گہرے اتر کر ثبوت فراہم کر دئے تھے کہ دس گھنٹے کام کے بل نے انگریزی صنعت کی موت کی سنائی دی ہے۔ انہوں نے ثابت کیا تھا کہ یہ صرف اجرتیں بڑھانے کا سیدھا سا معاملہ نہیں ہے بلکہ اجرتوں میں اس قسم کے اضافے کا سوال ہے جو لگنے والی محنت کی مقدار کم کئے جانے کا نتیجہ بھی ہے اور اس پر مبنی بھی۔ ان لوگوں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ سرمایہ دار کے ہاتھ سے جو کام لینے کا بارہواں گھنٹہ چھینا جا رہا ہے، یہ وہی گھنٹہ ہے جس سے وہ اپنا منافع وصول کرتا ہے۔ انہوں نے ڈرایا کہ سرمائے کا ذخیرہ کم ہونے لگے گا، قیمتیں چڑھ جائیں گی، منڈیاں ہاتھ سے نکل جائیں گی، پیداوار گھٹے گی، اس کا اثر یہ پڑے گا کہ اجرتیں گریں گی اور آخر میں بربادی پھیلے گی۔ انہوں نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ میکسی میلیان روبس پیئر نے جو قوانین (Maximum Laws) (۱۳) بنائے تھے وہ اس کے سامنے ہیچ تھے، اور ایک معنی میں ان کا کہنا تھا بھی سچ۔ لیکن پھر انجام کار کیا ہوا؟ فیکٹریوں میں کام کرنے والوں کی نقد اجرتیں بڑھ گئیں حالاں کہ کام کے گھنٹے کم ہو گئے تھے؛ کارخانے کے



مزدوروں کی تعداد میں خاصا نمایاں اضافہ ہو گیا؛ کارخانوں میں بننے والے مال کی قیمتیں برابر کم ہوتی چلی گئیں؛ کارخانے کے مزدوروں کی قوت کارکردگی میں حیرت انگیز اضافہ ہو گیا؛ کارخانوں کے تیار شدہ مال کی منڈیاں رفتہ رفتہ اتنی پھیل گئیں کہ پہلے کبھی سان گمان نہ تھا۔ ۱۸۶۰ء کی بات ہے، مانچسٹر میں ایک جلسہ تھا سائنس کی ترقیوں کی سوسائٹی کا، جہاں میں نے خود مسٹر نیومین کو یہ اقرار کرتے سنا کہ وہ بذات خود، ڈاکٹر یور اور پروفیسر سینٹر اور علم معاشیات کے تمام سرکاری نمائندے غلط نکلے، مگر عام لوگوں کی فطری سوجھ بوجھ صحیح ثابت ہوئی۔ میں پروفیسر فرینس نیومین کے متعلق نہیں کہہ رہا ہوں، میرا روئے سخن ہے مسٹر ڈبلیو نیومین (۱۴) کی طرف، جو معاشیات کے علم میں ایک بلند پایہ رکھتے ہیں، وہ تھومس ٹوک کی کتاب ”قیمتوں کی تاریخ“ میں مصنف کے شریک بھی ہیں اور ایڈیٹر بھی۔ یہ ایک شاندار تصنیف ہے جو ۱۸۹۳ء سے ۱۸۵۶ء تک کی قیمتوں کی تاریخ کا سراغ لگاتی ہے۔ اگر ہمارے دوست ویسٹن کے دماغ میں بیٹھا ہوا خیال صحیح ہوتا کہ اجرتوں کی کل مقدار ایک حال پر رہتی ہے، پیداوار کی کل مقدار، محنت کی پیداواری طاقت اور سرمایہ داروں کی مرضی، یہ اور دوسری چیزیں ایک حال پر قائم، بے تغیر اور قطعی رہتی ہیں تو پروفیسر سینٹر کی وہ حسرت ناک پیش گوئیاں بھی کب کی صحیح ثابت ہو جاتیں اور رابرٹ اووین غلط نکلتا جس نے اب سے بہت پہلے ۱۸۱۵ء میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ کام کے گھنٹوں کا کم کیا جانا مزدور طبقے کی نجات ”شرط اول قدم“ ہے (۱۵)۔ اس نے عام تعصب کے سامنے سینہ سپر ہو کر اور ذاتی خطرہ مول لے کر نیولنارک کے مقام پر اپنی ذاتی کپڑا مل میں مزدوروں کے کام کے گھنٹے کم کر کے دکھا دیئے تھے۔

عین اس وقت جب دس گھنٹے کام کا قانون بنا اور اس کی بدولت اجرت میں اضافہ ہوا تو برطانیہ عظمیٰ میں کچھ ایسے اسباب سے جن کا تفصیلی ذکر یہاں بے موقع ہوگا، فارموں میں کام کرنے والوں کی اجرتیں بھی عام طور سے بڑھتی نظر آنے لگیں۔

اس وقت جو مقصد میرے پیش نظر ہے، اگرچہ یہ اس کا تقاضا نہیں ہے تاہم اس خیال سے کہ میری بات کا غلط مفہوم نہ نکالا جائے، یہاں میں کچھ ابتدائی نکتے جتا دینا چاہتا ہوں۔

اگر کسی شخص کو ہفتے میں دو شلنگ ملتے تھے اور اب اس کی اجرت بڑھ کر چار شلنگ تک پہنچ گئی تو اجرت کا معیار سو فیصدی بڑھا۔ اگر اضافے کے معیار کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اجرت میں زبردست اضافہ ہو گیا لیکن حقیقت میں اجرت کی کل رقم ہوئی چار شلنگ فی ہفتہ، جو بجائے خود کچھ حیثیت نہیں رکھتی، پیٹ بھرنے کو بھی کافی نہیں۔ اس لئے اجرت کے ناپنے میں فیصدی کے بلند بانگ اضافے کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا کچھ مناسب نہیں۔ ہمیشہ ہمارا سوال یہ ہوگا کہ اجرت کی اصل مقدار کتنی تھی؟ اب آگے دیکھئے تو یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ اگر دس مزدور ہفتے میں فی کس دو شلنگ پاتے ہیں، ۵ مزدور ۵ شلنگ فی ہفتہ پاتے ہیں اور ۱۱ مزدور ۱۱ شلنگ فی ہفتہ تو بیس آدمی کو ملا کر سو شلنگ یا پانچ پونڈ فی ہفتہ وصول ہوتا ہے۔ ان کے ہفتہ بھر کی اجرت کی مجموعی رقم میں بیس فیصدی اضافہ کیا جائے تو پانچ کی جگہ انہیں چھ پونڈ ملیں گے۔ اس کا اوسط نکالیں تو ہم کہیں گے کہ اجرت کا عام معیار بیس فیصدی بڑھا لیکن درحقیقت دس مزدوروں کی اجرت وہی رہی جو تھی، پانچ آدمی کے گروپ کی اجرت بڑھی تو فی کس پانچ کے بجائے چھ شلنگ تک ملنے لگی، اور دوسرے پانچ آدمی کے گروپ کی اجرت کی مجموعی رقم ۵۰ سے ۷۰ شلنگ ہو گئی۔ مزدوروں کی آدھی تعداد کی حالت زرا بھی بہتر نہیں ہوئی، چوتھائی تعداد کی حالت ذرہ ظہور بہتر ہوئی، صرف باقی چوتھائی کو واقعی اجرت کے اضافے کا فائدہ پہنچا۔ تاہم اگر مجموعی رقم کے حساب سے اوسط نکالا جائے تو ان بیس مزدوروں کی اجرت میں بیس فیصدی کا اضافہ ہوا۔ چون کہ یہ معاملہ پورے سرمائے کا ہے جو ان مزدوروں کو کام پر لیتا ہے اور ان کے بنائے ہوئے مال کی قیمتوں کا ہے، اس لئے انداز ایسے ہی کیا جائے گا گویا اجرت کا اوسط اضافہ سارے مزدوروں کو یکساں پہنچ گیا ہے۔ اوپر کی مثال میں اگر فارموں میں کام کرنے والوں کو



رکھا جائے جن کی اجرتیں انگلینڈ اور اسکاٹ لینڈ کے الگ الگ تعلقوں میں بالکل علاحدہ معیار رکھتی ہیں تو مزدوروں میں اجرتوں کے بڑھنے کا انداز ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہوگا۔

آخری بات یہ کہ جن دنوں اجرتوں میں یہ اضافہ ہوا، اسی زمانے میں کئی ایسے واقعے پیش آئے جنہوں نے مخالف سمت میں اپنا وزن ڈالا، مثلاً: نئے ٹیکس لگے جو روس سے جنگ (۱۶) کا تقاضا تھے، فارمیں میں کام کرنے والوں کے مکان بڑے پیمانے پر ڈھائے گئے (۱۷) وغیرہ وغیرہ۔

اتنا کچھ جتنا دینے کے بعد، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۹ء کے درمیانی عرصے میں برطانیہ عظمیٰ کے اندر فارموں کے کام کرنے والوں کا اوسط اجرت قریب قریب چالیس فیصدی بڑھا ہے۔ میں اپنے اس دعوے کی تائید میں بہت وسیع پیمانے پر اور تفصیلی مٹیریل پیش کرتا، لیکن پیش نظر مقصد کے لئے فی الحال اتنا ہی کافی ہے کہ مرحوم جان مارٹن نے لندن سوسائٹی آف آرٹس (۱۸) کے جلسے میں جو نہایت محنت، تحقیق اور چھان بین کے بعد لکھا ہوا مقالہ ۱۸۶۰ء میں پیش کیا تھا اور جس کا عنوان تھا ”زراعت میں استعمال ہونے والی طاقتیں“، اسی کا حوالہ دے دوں۔ مسٹر جان مارٹن نے اسکاٹ لینڈ کے بارہ اور انگلینڈ کے ۳۵ تعلقوں میں رہنے والے تقریباً سو کاشتکاروں کے بھی کھاتے، حساب اور باضابطہ کاغذات جمع کر کے ان سے اپنے نتیجے نکالے ہیں۔

ہمارے دوست ویسٹن صاحب کے خیال کے مطابق، خاص کر اگر یہ بھی نظر میں رکھا جائے کہ کارخانے کے مزدوروں کی اجرتیں بھی اس عرصے میں بڑھی ہیں تو ہونا یہ چاہئے تھا کہ ۱۸۴۹ء اور ۱۸۵۹ء کے درمیان زراعتی پیداوار کی قیمتیں کہیں سے کہیں پہنچ جاتیں۔ مگر دراصل ہوا کیا؟ حالاں کہ روس سے جنگ بھی چل رہی تھی اور ۱۸۵۴ء سے ۱۸۵۶ء کی کئی فصلیں بھی خراب گئیں، پھر بھی انگلینڈ کی اصل زراعتی پیداوار یعنی گیہوں کی اوسط قیمت جو ۱۸۳۸ء اور ۱۸۳۸ء کے درمیانی عرصے میں تقریباً تین پونڈ فی کوارٹر تھی، گر کر ۱۸۴۹ء اور ۱۸۵۹ء کے درمیانی برسوں میں

دو پونڈ دس شلنگ فی کوارٹر تک جا پہنچی۔ مطلب یہ کہ جب فارموں میں کام کرنے والوں کی اجرت کا اوسط چالیس فیصدی بڑھا ہے، اسی وقت گیہوں کی قیمت سولہ فیصدی سے بھی کچھ نیچے گر گئی۔ اب اگر ایک سرے کو دوسرے کے سامنے رکھا جائے یعنی ۱۸۴۹ء کا ۱۸۵۹ء سے مقابلہ کیا جائے تو سرکاری رجسٹروں کے ذریعے پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۴۹ء میں اگر مفلس قلاشوں کی تعداد ۹۳۴۴۱۹ تھی تو گھٹ کر ۸۶۰۴۷۰ رہ گئی، یعنی دس سال بعد ۳۹۴۹۶ مفلس کم تھے۔ مانتا ہوں کہ یہ کمی کچھ خاص قابل شمار نہیں اور بعد کے برسوں میں وہ پھر نہ ہونے کے برابر پہنچ گئی۔ تاہم کمی تو ضرور ہوئی تھی۔

کہہ سکتے ہیں کہ اناج کی قانونی پابندی (۱۹) ہٹنے کے بعد ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۹ء کے درمیان سرحد پار سے اناج کی درآمد اتنی ہو گئی جو ۱۸۳۸ء اور ۱۸۴۸ء کے درمیانی عرصے کے مقابلے میں دوگنی تھی۔ تو پھر کیا ہوا؟ ویسٹن صاحب کے نقطہ نظر سے تو ہونا یہ چاہئے تھا کہ سرحد پار کی منڈیوں میں اناج کی یہ زبردست اندادہند اور لگاتار بڑھتی ہوئی مانگ زراعتی پیداوار کی قیمتوں کو آسمان پر پہنچا دیتی کیوں کہ بقول ان کے بڑھی ہوئی مانگ کا اثر جوں کاتوں رہتا ہے چاہے یہ مانگ ملک کے اندر سے اٹھی ہو یا باہر سے۔ لیکن حقیقت میں کیا ہوا؟ اس تمام عرصے میں سوائے ان برسوں کے جب فصل بگڑ گئی، فرانس میں مستقل فریاد بلند رہی کہ اناج کے بھاؤ چوٹ ہوئے جا رہے ہیں، امریکیوں نے مجبوراً کئی بار اپنی فالتو پیداوار جلا ڈالی، اور اگر مسٹر اورکارٹ کا بیان صحیح ہے تو روس نے ہی ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں خانہ جنگی (۲۰) کو ہوا دی ہے کیوں کہ یورپ کی منڈیوں میں امریکیوں کے مقابلے نے روس کی زراعتی پیداوار کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔

اب اگر ویسٹن صاحب کے استدلال کو ایک عام کلیے کی شکل دی جائے تو وہ یوں ہوگی: مانگ میں ہر قسم کی بڑھوتری تبھی ہوتی ہے جب سامان یا پیداوار کی اتنی مقدار مہیا ہو۔ لہذا مانگ بڑھنا کسی حالت میں بھی استعمالی سامان کی سپلائی نہیں بڑھا سکتا البتہ



روپے کی شکل میں اس کی قیمت بڑھا سکتا ہے۔ تاہم بڑے معمولی مشاہدے سے بھی یہ بات روشن ہے کہ بعض موقعوں پر مانگ کے بڑھنے سے مال کے بازار بھاؤ بالکل نہیں بدلتے اور بعض موقعوں پر عارضی طور سے بھاؤ چڑھ جاتے ہیں اور اس کی بدولت سپلائی بھی بڑھ جاتی ہے۔ سپلائی بڑھنے کے کارن قیمتیں اپنے پہلے کے معیار پر اتر جاتی ہیں بلکہ بعض موقعوں پر اس سے بھی نیچے۔ یہ مانگ کا بڑھنا اجرت بڑھنے کے سبب ہوتا ہے یا کسی اور وجہ سے، اصل مسئلے پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ ویسٹن صاحب کے نقطہ نظر سے یہ اسی قسم کا ایک عام مظہر ہے جسے سمجھنا سمجھانا مشکل ہے جیسے انہوں نے واقعات کی صورت میں یعنی اجرتوں کے بڑھ جانے کی حالت میں پیش آتا ہے۔ لہذا جو مسئلہ ہمارے زیر غور ہے، اس میں ویسٹن صاحب کا استدلال قطعی طور پر کچھ ثابت نہیں کرتا۔ ان کے استدلال سے صرف یہ راز کھلتا ہے کہ ایسے اصولوں اور قانونوں کا پتہ لگانا ان کے بس کی بات نہیں جن کے تحت مانگ بڑھ جانا سپلائی بڑھنے کا تقاضا کرتے ہیں اور ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ بازار بھاؤ بھی بڑھ جائیں۔

### ۳ - مزدوری اور نقد رقم

بحث کے دوسرے دن ہمارے دوست ویسٹن صاحب نے اپنا پرانا عقیدہ نئے لباس میں پیش کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ: جب اجرت کی رقم عام طور سے بڑھتی ہے تو اس بڑھی ہوئی اجرت کو ادا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ زیادہ نقدی ہاتھ میں ہو۔ اگر نقدی میں کمی بیشی نہیں ہوتی تو پھر اس نہ بدلنے والی مجموعی رقم میں سے اجرت کی وہ مجموعی رقم کیسے ادا ہوگی جو پہلے سے بڑھ چکی ہے؟ پہلے یہ مشکل درپیش تھی کہ مزدور کے حصے میں خریداری کے لئے جو سامان آتا ہے وہ اتنے کا اتنا ہی رہا حالانکہ نقد اجرت بڑھ گئی۔ اب دوسری دشواری کا سامنا ہے کہ مزدور کی نقد اجرت تو بڑھ گئی

لیکن سامان کی مقدار نہیں بڑھنے پاتی۔ ظاہر بات ہے کہ اگر آپ ویسٹن صاحب کے خیال کی بنیادی اینٹ کھسکا دیں تو اوپر کی دوسری الجھنیں خود بخود نکل جائیں گی۔

پھر بھی میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ نقد رقم کے بارے میں جو سوال ہے اسے زیر بحث مسئلے سے دور دور کوئی واسطہ نہیں۔ آپ کے ملک میں روپے کے لین دین کی چول اس کمال کے ساتھ بٹھائی گئی ہے کہ یورپ کے کسی ملک میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ بینکوں کا سسٹم اس خوبی کے ساتھ پھیلا ہونے اور سب کڑیاں جڑی ہونے کی بدولت یہ سہولت حاصل ہے کہ جتنی مالیت کو گردش میں رکھنا ہے، یا جتنی رقم کی بزنس جاری رکھنی ہے، اتنی یا اس سے زیادہ رقم کی بزنس چلانے کے لئے کہیں کم نقدی کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثال لیجئے، اجرت کا معاملہ یوں ہے: انگلینڈ میں کارخانے کا مزدور ہر ہفتے جو اجرت پاتا ہے وہ لاکر دوکاندار کے حوالے کرتا ہے، دوکاندار ہر ہفتے یہ رقم بینکر کو بھیج دیتا ہے، وہ ہر ہفتے کارخانہ دار کو لوٹا دیتا ہے جو پھر اپنے مزدوروں کو ادا کر دیتا ہے اور یہ سلسلہ چلتا ہے۔ اس مشینی عمل کا کرشمہ ہے کہ مزدور کی سال بھر کی اجرت، فرض کیجئے اگر باون پونڈ ہو، تو وہ محض ایک اشرفی (گنی) کے گھماؤ سے ادا ہو سکتی ہے کیوں کہ یہی ایک پونڈ ہر ہفتے گھوم گھوم کر ۵۲ ہفتے پورے کر لے گا۔ انگلینڈ میں بھی یہ مشینی عمل اتنا پختہ نہیں جتنا اسکاٹ لینڈ میں۔ اور پھر یہاں بھی ہر جگہ اس کی کارکردگی یکساں مکمل نہیں، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مثلاً جن حلقوں میں صرف کارخانے ہیں، ان کے مقابلے میں بعض دیہاتی حلقوں کے اندر کہیں کم مجموعی مالیت کو گردش میں رکھنے کے لئے کہیں زیادہ نقد رقم کی ضرورت پڑتی ہے۔

اگر آپ چینل پار کر کے یورپ کی طرف جائیں تو دیکھیں گے کہ وہاں نقد اجرتیں انگلینڈ کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ پھر بھی جرمنی، اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور فرانس میں ان اجرتوں کی ادائیگی کے لئے کہیں زیادہ نقد رقم کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہاں نہ تو ہر اشرفی اتنی



تیزی سے بیکر کے ہاتھ میں پہنچتی ہے اور نہ اس تیز رفتاری سے گھوم پھر کر سرمایہ دار کے پاس آجاتی ہے۔ اس لئے بجائے ایک اشرفی کے جو سال بھر کا چکر کاٹ کر باون پونڈ کا کام کر دیتی ہے، یورپ کے براعظم میں ممکن ہے تین اشرفیوں کی ضرورت پڑے تاکہ سال بھر تک نقد اجرت کی صورت میں پچیس پونڈ ادا کئے جائیں۔ اس طرح انگلینڈ سے یورپ کے ملکوں کا موازنہ کرتے ہوئے آپ فوراً یہ بات نکال سکتے ہیں کہ کم تر اجرتوں کے لئے اس سے زیادہ نقد رقم کی ضرورت پڑ سکتی ہے جتنی زیادہ اجرتیں دینے کے لئے پڑتی ہے۔ اور حقیقت میں یہ سوال محض ٹیکنیکل ہے جس کا ہمارے موضوع سے قطعی کوئی واسطہ نہیں۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے زیادہ سے زیادہ صحیح شمار کے حساب سے انگلینڈ کے مزدور طبقے کی سالانہ اجرت کا اندازہ ۲۰ کروڑ پونڈ بیٹھتا ہے۔ یہ زبردست رقم قریب قریب تیس لاکھ پونڈ نقدی کی مدد سے ادا کی جاتی ہے۔ فرض کیجئے اجرتیں پچاس فیصدی بڑھا دی جاتی ہیں تو جہاں تیس لاکھ پونڈ نقد رقم لگتی ہے وہاں پینتالیس لاکھ پونڈ کی ضرورت پڑے گی۔ اب چونکہ مزدور اپنے روزمرہ کے خرچ کا زیادہ تر حصہ چاندی اور تانبے کے سکوں میں ادا کرتا ہے، یعنی ان معمولی سکوں میں جن کی قدر و قیمت سونے کی نسبت اسی طرح قانون کے حکم سے مقرر کی جاتی ہے جیسے کاغذی کرنسی کی مقرر ہوتی ہے تو اجرتوں کے پچاس فیصدی بڑھائے جانے میں حد سے حد یہی ہونے والا ہے کہ جتنی اشرفیوں کی کمی پڑتی وہ اور گردش میں شامل کردی جائیں، یہ رقم یوں کہئے کہ دس لاکھ اشرفی ہوگی۔ فرق یہی ہوا کہ دس لاکھ اشرفی جو فی الحال سونے کی سلاخوں کی یا سکوں کی صورت میں بینک آف انگلینڈ کے یا پرائیویٹ بینکروں کے تہہ خانوں میں پڑی ہے، وہ چلنے لگے گی۔ اس دس لاکھ اشرفی کا سکہ ڈھالنے میں یا سکے گھسنے پٹنے میں جو برائے نام خرچ ہوتا ہے اس خرچ کی بھی کفایت کی جاسکتی ہے اور ایسی حالتوں میں جب سکے کی گردش بڑھنے کے سبب سے کہیں رکاوٹ پڑتی ہے تو یہ کفایت کرلی جاتی ہے۔ آپ کو علم ہے کہ انگلینڈ میں جو زر گردش میں رہتا ہے،

اس کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک قسم میں تو وہ زر آجاتا ہے جس میں ہر طرح کے بینک نوٹ شامل ہیں جو تجارت پیشہ لوگوں کے درمیان چلتے ہیں اور زرا بڑی بڑی ادائیگیوں میں استعمال کرنے والوں (صارفوں) اور تاجروں کے درمیان ہاتھ بدلتے رہتے ہیں۔ دوسری قسم کا زر وہ ہے جس میں دھات کے سکے ہیں اور چھوٹے لین دین میں چلتے ہیں۔ اگرچہ گردش میں رہنے والے زر کی یہ دونوں قسمیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں تاہم ایک دوسرے پر سے پھلانگتی رہتی ہیں۔ سونے کے سکے کا عام چلن ہے اور جہاں پانچ پونڈ سے کم کسی طاق رقم کی زرا بڑی ادائیگی کرنی ہے وہاں بھی اسی سے کام لیا جاتا ہے۔ اگر کل کو چار، تین یا دو پونڈ کے بینک نوٹ جاری کر دئے جائیں تو سونے کے یہ سکے جو پانچ پونڈ سے نیچے کی بڑی ادائیگی میں جابجا چل رہے ہیں، فوراً یہ جگہیں چھوڑ دیں گے اور اس طرف کا رخ کریں گے جہاں نقد اجرتیں بڑھ جانے کی وجہ سے ان کی ضرورت محسوس ہونے والی ہے۔ اس طرح سے پچاس فیصدی اجرت بڑھنے کے نتیجے میں جو اور دس لاکھ اشرفی درکار ہے وہ ایک اشرفی بڑھائے یا بنائے بغیر ہی دست یاب ہو جاتی ہے۔ یہی نتیجہ بینک نوٹ کی گنتی بڑھائے بغیر حاصل کیا جاسکتا ہے، صرف زیادہ سرکاری بونڈ گردش میں لانے ہوں گے جیسا کہ لنکاشائر میں کافی زمانے تک ہوتا رہا۔

اگر اجرتوں کے معیار کا عام طور سے بلند ہونا، مثلاً سو فیصدی بلند ہونا، جیسا کہ ویسٹن صاحب نے فارموں پر کام کرنے والوں کے سلسلے میں سوچا ہے، مقدم ضروریات زندگی کی چیزوں کی قیمتیں کافی بڑھا دیتا ہے اور، ویسٹن صاحب کے نظریے کے مطابق، اوپر سے اور نقد رقم طلب کرتا ہے جو حاصل نہیں کی جاسکتی تو اجرتوں کے عام طور سے گرنے کا اثر بھی ایسا ہی اور اسی حد تک ہونا چاہئے، لیکن اس کے بالکل الٹ۔ لاجواب بات! آپ سب واقف ہیں کہ ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۰ء کا زمانہ سوتی کپڑا ملوں کی صنعت پھلنے پھولنے کا زمانہ تھا، خاص طور سے ۱۸۶۰ء تو ایسا سال گزرا ہے کہ تجارت کی پرانی یادداشتوں میں کہیں اس کی مثال نہیں ملتی۔ پھر یہی وہ زمانہ ہے جب صنعت کی دوسری شاخوں نے بھی پہلے سے کہیں زیادہ فروغ پایا۔



سوتی ملوں کے مزدوروں کی اجرت اور اسی سے متعلق دوسری صنعتی شاخوں میں اجرت کا معیار اتنا بڑھا ہوا تھا جو پہلے کبھی نہیں پہنچا۔ اتنے میں امریکی بحران آیا اور ان تمام مزدوروں کی اجرتیں ایک ایک ایسی گریں کہ پہلے کے مقابلے میں تقریباً چوتھائی رہ گئیں۔ اس کے برخلاف ہوتا تو یہ تین سو فیصدی بڑھنا کہلاتا کیوں کہ اگر اجرت پانچ سے بیس ہو جائے تو ہم اسے تین سو فیصدی بڑھنا کہتے ہیں۔ اور اگر وہ بیس سے پانچ رہ جائے تو ہم کہیں گے کہ پچھتر فیصدی گھٹ گئی۔ ایک واقعے میں اس کا بڑھنا، دوسرے میں اس کا گھٹنا دونوں کی رقم ایک ہی ہے یعنی پندرہ شلنگ اجرت کے معیار میں۔ اس وقت یہ ایسی اچانک انجانی تبدیلی آئی تھی اور پھر مزدوروں کی اتنی وسیع تعداد کو اس نے اپنی لپیٹ میں لیا تھا کہ اگر ان سب مزدوروں کو شمار کیا جائے، ان کو بھی جو براہ راست سوتی ملوں میں لگے ہوئے تھے، اور ان کو بھی جو اس صنعت کے سہارے بسر کرتے تھے تو یہ تعداد زراعتی فارموں میں کام کرنے والوں سے ڈیڑھ گنی ہوتی ہے۔ تو کیا گیہوں کی قیمت گر گئی؟ نہیں، بلکہ ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۰ء کے تین برسوں میں قیمت کا سالانہ اوسط ۴ شلنگ ۸ پینس فی کوارٹر رہا تھا تو ۱۸۶۱ء-۱۸۶۳ء کے تین برسوں میں قیمت کا اوسط بڑھ کر ۵۵ شلنگ ۱۰ پینس فی کوارٹر ہو گیا۔ اور جہاں تک سکے کا تعلق ہے تو ٹکسال میں صرف ۱۸۶۱ء میں ۸۶۷۳۲۳۲ پونڈ بنا کر نکالے گئے، حالانکہ ۱۸۶۰ء میں یہ مقدار ۳۳۷۸۱۰۲ پونڈ تھی۔ دوسرے لفظوں میں ۱۸۶۱ء کے دوران ۵۲۹۵۱۳۰ پونڈ کا سکے زیادہ ڈھالا گیا۔ صحیح ہے کہ ۱۸۶۱ء میں جتنے بینک نوٹ چل رہے تھے ان کی تعداد ۱۸۶۰ء کے مقابلے میں ۱۳۱۹۰۰۰ پونڈ کم تھی۔ اس پوری رقم کو منہا کر دیں، تب بھی بہر حال ۱۸۶۱ء میں جو زرگردش میں تھا وہ ۱۸۶۰ء کے خوش حالی والے سال کے مقابلے میں ۳۹۷۶۱۳۰ یا تقریباً چالیس لاکھ پونڈ زیادہ ہی تھا رہا سونے کا محفوظ ذخیرہ تو بینک آف انگلینڈ کے پاس وہ اس عرصے میں گھٹ گیا۔ اگرچہ اس میں اتنا گھٹا نہیں آیا، تاہم اس کے قریب قریب کمی پڑی۔

۱۸۶۲ء کا ۱۸۴۲ء سے مقابلہ کر کے دیکھیں۔ علاوہ اس کے کہ جو مال گردش میں تھا اس کی مالیت اور مقدار بھی بڑھ کر کہیں سے کہیں پہنچی، لیکن اگر صرف سرمائے کو لیجئے تو انگلینڈ اور ویلز میں ریلوے کے بونڈ پر لگے ہوئے حصوں، قرضوں اور دستاویزی رقموں وغیرہ کا سرمایہ بڑھتے بڑھتے ۱۸۶۲ء میں ۳۲ کروڑ پونڈ کو پہنچ گیا اور یہ وہ رقم تھی جو ۱۸۴۲ء میں فرضی داستان معلوم ہوتی۔ پھر بھی زر کی عام مقدار جو ۱۸۴۲ء اور ۱۸۶۲ء میں گردش میں تھی وہ قریب قریب اتنی ہی تھی۔ ویسے بھی گردش کرتے ہوئے زر نقد کو رفتہ رفتہ کم کرنے کا رجحان دکھائی دیتا ہے، حالانکہ مال کی جملہ مالیت بھی بے انتہا بڑھ گئی ہے اور مالیاتی لین دین کا پھیلاؤ بھی زبردست ہو گیا ہے۔ ہمارے دوست ویسٹن کے نقطہ نظر سے یہ ایک بن بوجھی پھیلی ہے۔

وہ زرا اور گہرائی میں اترتے تو انہیں پتہ چلتا کہ اگر اجرت کو بالکل ایک طرف رکھ دیں اور فرض کر لیں کہ اجرتوں میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی تب بھی جو مالیت اور مال کی کثیر مقدار گردش میں ہے، مالیاتی لین دین میں جو زبردست سودے ہوتے ہیں، ان کی مجموعی رقم، یہ سب عموماً ہر روز بدلتا رہتا ہے؛ اور یہ کہ جو بینک نوٹ جاری کئے جاتے ہیں ان کی مقدار روزانہ بدلتی ہے؛ اور یہ کہ ان ادائیگیوں کی مقدار روزانہ بدلتی رہتی ہے جو نقد رقم کے بغیر وصول ہوتی ہیں اور بونڈ، قرضوں، چیکوں، بک کریڈٹوں، کلیئرنگ ہاؤسوں کے واسطے سے کی جاتی ہیں؛ اور یہ کہ جہاں تک دھات کے چلتے ہوئے سکوں کی ضرورت ہے تو سکوں کی اس مقدار کا تناسب جو گردش میں رہتا ہے، سکوں اور سلاخوں کی اس مقدار سے جو محفوظ ذخیرے یا بینک کے تہ خانوں میں پڑی ہو، روزانہ بدلتا رہتا ہے؛ اور یہ کہ سونے کی وہ مقدار جو قوم کے ہاتھوں میں گھومتی رہتی ہے اور وہ مقدار جو سرحد پار بھیجی جاتی ہے تاکہ اسے بین الاقوامی گردش دی جائے، دونوں میں روزانہ فرق پڑتا رہتا ہے؛ انہیں پتہ چل جاتا کہ مجموعی رقم کے اٹل ہونے کا جو اٹل عقیدہ انہوں نے تراشا ہے، وہ ایک ہولناک گمراہی ہے جو ہماری روزمرہ کی زندگی سے کہیں



سپل نہیں کھاتی۔ بجائے اس کے کہ وہ کرنسی کے قانونوں سے اپنی بے خبری کو ایک دلیل بنا کر اجرت بڑھائے جانے کے خلاف استعمال کریں، ویسٹن صاحب کو چاہئے تھا کہ وہ ان قانونوں کا مطالعہ کریں جو کرنسی میں یہ لوچ پیدا کرتے ہیں کہ وہ اتنے لگاتار بدلتے ہوئے حالات کے مقابلے میں خود کو ڈھالتی چلی جاتی ہے۔

### ۴۔ سپلائی اور مانگ

ہمارے دوست ویسٹن صاحب اس لاطینی کہاوت کو مانتے ہیں کہ : «repetitio est mater studiorum» یعنی دہرانا علم حاصل کرنے کی ماں ہے۔ اسی لئے انہوں نے اپنے شروع کے اٹل عقیدے کو نئی شکل میں پھر سے دہرا دیا ہے اور اس پر زور دیا ہے کہ اجرتوں کے بڑھنے کے کارن جو کرنسی کی کمی پڑے گی وہ اپنی لیٹ میں سرمائے کی کمی وغیرہ لے کر آئے گی۔ چونکہ میں زر کے بارے میں ان کی خیال آرائی کے متعلق پہلے ہی کہہ چکا ہوں اس لئے اب ان فرضی نتیجوں پر تفصیل سے بحث کرنا بالکل فضول ہوگا جو ویسٹن صاحب کے خیال میں کرنسی کے اس بھونچال سے ظاہر ہونے والے ہیں جو خود انہوں نے فرض کر رکھا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ میں ان کے اس اٹل عقیدے کو جو طرح طرح سے دہرائے جانے کے باوجود جوں کا توں رہتا ہے، دو ٹوک طریقے پر نظریاتی شکل میں کھول کر رکھ دوں۔

انہوں نے اپنے موضوع کے ساتھ کس قدر بے احتسابی برتی ہے، یہ صرف ایک ریمارک سے روشن ہو جائے گا۔ انہیں اجرتوں کے بڑھائے جانے پر اعتراض ہے، یا اضافے کی وجہ سے جو اجرتیں اونچی ہو جائیں گی ان اونچی اجرتوں پر اعتراض ہے۔ میں ان سے سوال کرتا ہوں، یہ بتائیے، اونچی اجرت اور نیچی اجرت کیا ہوتی ہے؟ مثلاً ایسا کیوں ہے کہ پانچ شلنگ فی ہفتہ تو نیچی اجرت ٹھہری اور بیس شلنگ فی ہفتہ اونچی اجرت؟ اگر پانچ شلنگ بیس شلنگ کے مقابلے میں کم اجرت ہے تو بیس شلنگ دو سو شلنگ فی ہفتہ کے سامنے اور

بھی کم اجرت ہوئی۔ اگر کوئی شخص تھرماسیٹر پر لکچر دیتے ہوئے صرف یہی کہتا رہے کہ پارہ اتنا اونچا چڑھ گیا، اتنا نیچے گر گیا تو اس سے کسی کو کچھ معلومات نہیں ملنے والی۔ سب سے پہلے اسے یہ بتانا چاہئے کہ اتنے ڈگری پر پانی جم جاتا ہے، اتنے پر ابلنے لگتا ہے، اور فطرت کے قانون نے یہ حدیں مقرر کر رکھی ہیں، یہ ان لوگوں کا ڈھکوسلا نہیں ہے جو تھرماسیٹر بیچتے یا بناتے ہیں۔ ویسٹن صاحب نے اجرت اور منافع کے بیان میں یہ کہیں نہیں بتایا کہ معاشی قانون سے ابتدا اور انتہا کے یہ نقطے قرار پاتے ہیں، بتانا تو کیا، انہوں نے ان نقطوں کی تلاش کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ اتنے میں ہی مطمئن ہو گئے کہ اونچے اور نیچے کے جو چلتے ہوئے بے حیثیت لفظ تھے انہی کو قبول کر لیا اور سمجھ لیا کہ بس ان میں ایک مقررہ اور قطعی مفہوم پوشیدہ ہے، اگرچہ یہ بات بالکل سامنے کی ہے کہ کسی ایک پیمانے سے ناپنے کے بعد، جس کے ذریعے کمی بیشی کا اندازہ کیا جائے اجرت کو چاہے اونچا کہہ لیجئے، چاہے نیچا۔

وہ مجھے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتے کہ محنت کی ایک مقررہ مقدار کے بدلے میں ایک مقررہ رقم کیوں دی جاتی ہے۔ اگر وہ جواب دیں کہ سپلائی (رسد) اور ڈیمانڈ (طلب یا مانگ) کے قانون سے یہ رقم طے پاتی ہے تو میں فوراً سوال کروں گا کہ پھر وہ کون سا قانون ہے جس کے ذریعے سپلائی اور ڈیمانڈ میں باقاعدگی پیدا ہوتی ہے؟ اسی انداز کا جواب انہیں بندگی میں پہنچا دے گا۔ محنت کی سپلائی اور اس کی مانگ کے درمیان مستقل کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ اس کمی بیشی کے ساتھ ساتھ محنت کا بازار بھاؤ بھی بدلتا رہتا ہے۔ اگر مانگ سپلائی سے بڑھ گئی تو اجرت بڑھ جاتی ہے اور اگر سپلائی مانگ سے اوپر گئی تو اجرت گر جاتی ہے، اگرچہ اس قسم کے حالات پیدا ہونے پر یہ ٹٹول کر دیکھنا بھی ضروری سمجھا جا سکتا ہے کہ واقعی سپلائی اور ڈیمانڈ کس رنگ میں ہیں مثلاً ہڑتال کے ذریعے یا کسی اور تدبیر سے یہ جانچ کی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر آپ یہ مانتے ہیں کہ سپلائی اور ڈیمانڈ کا قانون ہی اجرتوں کو



ایک نہج پر رکھنے والا قانون ہے تو پھر اجرت بڑھنے کے خلاف آپ کا دعوا بچکانہ بھی ہے اور فضول بھی، کیوں کہ اس حاوی مطلق قانون کے مطابق جس کا آپ حوالہ دے رہے ہیں، وقت و وقت سے اجرت کا بڑھنا بھی اتنا ہی لازمی اور قاعدے کی بات ہے جتنا وقتاً فوقتاً اجرت کا گرنا۔ لیکن اگر آپ سپلائی اور ڈیمانڈ کو اجرتوں میں باقاعدگی رکھنے والا قانون نہیں مانتے تو میں اپنا سوال پھر سے دہراتا ہوں: ایسا کیوں ہے کہ محنت کی ایک مقررہ مقدار کے بدلے ایک مقررہ رقم ادا کی جاتی ہے؟

مگر اس معاملے کو زرا زیادہ پھیلاؤ کے ساتھ دیکھیں: اگر آپ یہ تصور کر لیں کہ محنت کی قدر (ویلیو) یا کسی اور مال کی قدر بالآخر سپلائی اور مانگ سے ہی طے پاتی ہے تو آپ سراسر غلطی پر ہیں۔ سپلائی اور مانگ تو بازار بھاؤ کی صرف وقتی اونچ نیچ کو چلاتی ہیں۔ ان کے ذریعے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ کسی مال کا بازار بھاؤ اس کی ویلیو سے اوپر کیوں جا رہا ہے یا اس سے نیچے کیوں اتر رہا ہے، لیکن سپلائی اور مانگ سے خود کسی مال کی ویلیو (قدر) کو نہیں سمجھا جاسکتا۔ فرض کئے لیتے ہیں کہ سپلائی اور ڈیمانڈ آپس میں ایک دوسرے کا پہلہ برابر رکھتے ہیں یا باہرین معاشیات کے بقول وہ ایک دوسرے کو پورے پڑتے ہیں۔ ٹھیک اس وقت جب یہ دونوں آمنے سامنے کی طاقتیں ایک دوسرے کے برابر تلتی ہیں، تو وہ ایک دوسرے کو ناکارہ کر دیتی ہیں اور کسی سمت میں بھی حرکت نہیں ہونے دیتیں۔ جب سپلائی اور ڈیمانڈ ہم پہلہ ہوجائیں اور اس کے باعث اثر تاثیر چھوڑ دیں تو مال کے بازار بھاؤ اس کی اصلی ویلیو (قدر) یا معمول کی قیمت سے میل کھاتے ہیں اور اسی کے آس پاس چکر لگاتے رہتے ہیں۔ لہذا جب اس ویلیو کی فطرت کا پتہ لگانے نکلیں تو ہمیں اس سے کوئی غرض نہ ہونی چاہئے کہ سپلائی اور ڈیمانڈ کا بازار بھاؤ پر وقتی اثر کیا پڑتا ہے۔ یہ بات اجرت کے بارے میں بھی اتنی ہی درست ہے جتنی اور تمام قسموں کے مال کی قیمتوں پر صادق آتی ہے۔

## ۵۔ اجرتیں اور قیمتیں

ہمارے دوست کی تمام دلیلیں اگر ان کو نہایت سادہ نظریاتی لفظوں میں سمویا جائے تو لے دے کر اس ایک اذعانے عقیدے کے کلیے پر پہنچتی ہیں: ”مال کی قیمتیں اجرتوں سے طے پاتی ہیں یا ان کے مطابق چڑھتی اترتی ہیں۔“

اس دقیانوسی اور ٹھکرائی ہوئی غلط بیانی کا توڑ کرنے کے لئے میں عملی تجربے کی مدد بھی لے سکتا ہوں اور یہ بھی کرسکتا ہوں کہ آپ کو یہ حقیقت جتنا دون کہ انگریزی کارخانوں کے مزدور، کان کھودنے والے، جہاز بنانے والے مزدور وغیرہ یعنی وہ جن کی محنت کے اچھے دام اٹھتے ہیں، ان کے ہاتھوں جو سامان تیار ہو کر نکلتا ہے، وہ دوسری قوموں کے تیار کئے ہوئے ویسے ہی سامان کے مقابلے میں کچھ سستا بکتا ہے، حالاں کہ اس کے سامنے انگریزی فارموں میں کام کرنے والوں کی محنت سے جو سامان تیار ہوتا ہے۔ اور یہ وہ ہیں جن کی محنت کم داموں پر جاتی ہے۔ وہ سامان قریب قریب تمام دوسری قوموں کے اسی سامان سے زیادہ مہنگا بکتا ہے۔ میں کسی ایک ملک کی بنی ہوئی کئی چیزوں کا مقابلہ کر کے یا کئی ملکوں کے مال کا موازنہ کر کے یہ دکھا سکتا ہوں کہ چند موقعوں کو چھوڑ کر جن میں اصلیت کے بجائے دکھاوا زیادہ ہے، باقی اوسط موقع ایسے ہیں کہ زیادہ دام پانے والی محنت سست مال تیار کرتی ہے اور کم دام پانے والی مہنگا مال۔ اس سے دور دور یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ایک موقع پر محنت کی اونچی قیمت اور دوسرے موقع پر نیچی قیمت ہر بار ایک دوسرے کے بالکل الٹا نتیجہ پیدا کرتی ہیں، لیکن بہرحال ان سے یہ ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ محنت کے داموں سے مال کی قیمتیں نہیں چکائی جاتیں۔ تاہم تجربے سے بات پیدا کرنے کا یہ طریقہ ہمارے لئے بالکل غیر ضروری ہے۔

ممکن ہے کسی کو اس سے انکار ہو کہ مسٹر ویسٹن نے اس



عقیدے پر زور دیا ہے کہ ”مال کی قیمتیں اجرتوں سے طے پاتی ہیں یا ان کے مطابق چڑھتی اترتی ہیں“۔ واقعی انہوں نے خود یہ فارسولا پیش نہیں کیا۔ بلکہ اس کے برخلاف ان کا کہنا ہے کہ منافع اور کرایہ بھی مال کی قیمتوں میں شریک ہوتے ہیں کیونکہ مال کی قیمتوں میں سے ہی، محنت کرنے والے کی اجرت کے علاوہ سرمایہ دار کا منافع اور زمین جائداد والے کا کرایہ نکالا جاتا ہے۔ تو پھر سوال یہ ہے کہ مسٹر ویسٹن کی رائے میں قیمتوں کا تعین کیسے ہوتا ہے؟ اول تو اجرتوں سے ہوتا ہے۔ پھر کچھ فیصدی سرمایہ دار کے منافع کے طور پر اور کچھ فیصدی زمین والے کا کرایہ ان قیمتوں میں جوڑ لیا جاتا ہے۔ فرض کیجئے کسی مال کی تیاری میں جو لیبر لگی ہے، اس کی اجرت دس کے برابر ہوئی ہے، منافع کی شرح اگر اجرت کے ہم پلہ سو فیصدی رکھی جائے تو سرمایہ دار مال کی قیمت میں دس اور بڑھا دے گا اور اسی نسبت سے اگر کرایہ زمین وغیرہ اجرت کا سو فیصدی ہو تو دس اور بڑھایا جائے گا، یعنی مال کی مجموعی قیمت تیس ہو گئی۔ قیمتوں کا یہ جو تعین ہوا یہ سیدھا سیدھا اجرتوں کے حساب سے قرار پایا ہے۔ اگر اوپر کی مثال میں اجرت دس کے بجائے بیس کو پہنچ جائے تو مال کی قیمت بھی تیس سے ساٹھ ہو جائے گی۔ یہی نسبت آگے چلے گی۔ چنانچہ سیاسی معاشیات پر اگلے وقتوں کے جتنے لکھنے والے گزرے ہیں، جنہوں نے یہ اندھ و شواس پھیلایا کہ اجرتیں ہی قیمتوں کی کمی بیشی طے کرتی ہیں، وہ ثبوت میں ہمیشہ یہی کوشش کرتے رہے کہ منافع اور کرائے کو اجرتوں پر فیصدی اضافہ سمجھ کر جوڑ دیا جائے۔ لیکن ان میں سے کسی کے بس کی بات نہ تھی کہ اس فیصدی اضافے کی حدود کو کسی معاشی قانون یا اصول کا پابند کر کے دکھائیں۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا انہوں نے دل میں سوچ رکھا ہے کہ منافع کا سوال پرانے دستور یا چلن سے، سرمایہ دار کی مرضی سے یا کسی ایسے ہی یک طرفہ اور انجانے طریقے سے طے پاتا ہے۔ اگر وہ اس پر زور دیں کہ منافع طے پاتے ہیں سرمایہ داروں کے درمیان مقابلے سے، تو یہ کوئی بات نہ ہوئی۔ مقابلہ ہوگا تو مختلف کاروباروں میں منافع کی اونچ نیچ اپنا پلہ برابر کر لے گی یعنی منافع کی مختلف شرحوں کو کسی

اوسط لیول پر لے آئے گی، لیکن وہ لیول کیا ہونا چاہئے، یا منافع کی عام شرح کتنی ہو، یہ کبھی طے نہ کر سکے گی۔ جب ہم کہتے ہیں کہ مال کی قیمتیں اجرتوں سے طے پاتی ہیں تو ہم کہنا کیا چاہتے ہیں؟ خود اجرت کیا ہے؟ محنت کی قیمت۔ تو مطلب یہ ہوا کہ مال کی قیمتیں محنت کی قیمت سے طے پاتی ہیں۔ مگر چون کہ ”قیمت“ ایک قدر بادلہ ہے (جب بھی میں قدر (ویلیو) کا نام لیتا ہوں، میرا مطلب ہوتا ہے اس ویلیو سے جس پر مالوں کا تبادلہ کیا جائے) تو قیمت وہ ویلیو ہوئی جو نقدی کی صورت میں ظاہر ہو۔ بیان کا خلاصہ یہ نکلا کہ ”مالوں کی قدر (ویلیو) محنت کی ویلیو سے طے پاتی ہے“، یا یوں کہیں کہ ”محنت کی ویلیو ہی ایک عام پیمانہ ہے جس سے اور قدریں ناپی جاتی ہیں“۔

تو پھر خود ”محنت کی ویلیو“ کیوں کر طے پاتی ہے؟ آگے راستہ بند ہے۔ اگر ہم منطق کی معقولیت سے بحث کریں تو واقعی آگے راستہ بند ہے۔ لیکن جو لوگ اوپر کے عقیدے کے قائل ہیں انہیں منطقی معقولیت سے کیا سروکار۔ ہمارے دوست ویسٹن صاحب کی مثال لیجئے۔ پہلے تو انہوں نے ہمیں بتایا کہ مال کی قیمتیں اجرتوں سے طے پاتی ہیں، لہذا اجرت بڑھنے سے قیمت بھی ضرور بڑھے گی۔ پھر انہوں نے ایک چکر اور کاٹا اور ہمیں بتایا کہ اجرتوں کے بڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں کیوں کہ سامان کی قیمتیں بھی بڑھ چکی ہوں گی اور حقیقت میں اجرتوں کا ناپ ہے اس سامان کی قیمتوں سے جس پر یہ اجرتیں خرچ کی جاتی ہیں۔ تو اب ہم یہ کہتے کہتے کہ محنت کی ویلیو مالوں (یا سامان) کی ویلیو کا فیصلہ کرتی ہے، یہ کہنے پر اتر آتے ہیں کہ مالوں کی ویلیو محنت کی ویلیو کا فیصلہ کرتی ہے۔ اس طرح ہم آگے پیچھے چکر کاٹتے رہ جاتے ہیں اور نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلتا۔

لے دے کے ظاہر یہ ہوا کہ اگر ہم کسی ایک مال کی ویلیو کو چاہے وہ محنت کی ویلیو ہو، اناج کی ہو یا کسی اور مال کی، باقی تمام قدروں کا ناپ اور انہیں چلانے والا مان لیتے ہیں تو ہم مشکل کا



بوجھ صرف ٹال رہے ہیں کیوں کہ ایک ویلیو جو خود اپنا تعین چاہتی ہے، ہم اس کا تعین دوسری ویلیو سے کئے دے رہے ہیں۔ یہ اندھ و شواس کہ ”اجرتیں ہی مالوں کی قیمتیں طے کرتی ہیں“، اگر مطلق طریقے سے رکھ دیا جائے تو اس نوبت کو پہنچا دیتا ہے کہ ”ویلیو طے پاتی ہے ویلیو سے“، اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں ویلیو کے بارے میں دراصل کچھ پتہ ہی نہیں ہے۔ اگر اس قیاس کو بنیاد مان لیا جائے تو سیاسی معاشیات کے عام اصولوں کے بارے میں سارا بحث و استدلال توتلا ہو کر رہا جاتا ہے۔ چنانچہ ماہر معاشیات ریکارڈو کا زبردست کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنی ۱۸۱۷ء میں شائع شدہ تصنیف ”سیاسی معاشیات کے اصول“، میں اس پرانے، بوسیدہ، مقبول عام مفروضے کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ دیا کہ ”اجرتیں ہی قیمتوں کا فیصلہ کرتی ہیں“۔ یہ ایک ایسا مفروضہ تھا جسے آدم اسمتھ اور اس کے فرانسیسی پیشرو اپنی معاشی تحقیقات کے اصل علمی حصوں میں تو رد کر چکے تھے لیکن پھر بھی انہوں نے ہلکے پھلکے اور گھٹیا قسم کے بابوں میں اسی کو پھر دہرا دیا تھا۔

## ۶۔ قدر اور محنت

صاحبان اب میں اس نکتے پر آگیا ہوں جہاں سوال زیر بحث کو قطعی طور پر صاف کرنا ضروری ہے۔ میں یہ وعدہ نہیں کرتا کہ آپ کی پوری تسلی کر سکوں گا کیوں کہ اس کے لئے تو سیاسی معاشیات کا پورا میدان چھاننا پڑے گا۔ البتہ اتنا ہے کہ بتول فرانسیسیوں کے »effleurer la question« یعنی میں صرف بنیادی نکتوں کو چھوتا ہوا گزروں گا۔

پہلا سوال ہمیں یہ اٹھانا ہوگا : کسی مال کی ویلیو (قدر) کیا ہوتی ہے ؟ اور کیسے طے پاتی ہے ؟ پہلی نظر میں پتہ چل جاتا ہے کہ کسی مال کی ویلیو ایک اضافی یا نسبتی چیز ہے اور وہ طے نہیں پاتی جب تک کہ ایک مال کو

دوسرے مالوں کی نسبت سے نہ تولا جائے۔ حقیقت میں جب ہم ویلیو کا لفظ زبان سے نکالتے ہیں، یعنی مال کے بدلے میں جو ویلیو ملتی ہے، وہ کہتے وقت ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تبادلے میں جو دوسرے مال ملیں گے ان کی مقداروں کی نسبت اتنی ہوگی۔ تب سوال یہ ہوگا کہ جن نسبتوں میں مالوں کا ایک دوسرے سے تبادلہ ہوتا ہے وہ نسبتیں کم و بیش کیوں کر ہوتی رہتی ہیں۔

تجربے نے ہمیں بتا دیا ہے کہ یہ نسبتیں برابر ادلتی بدلتی رہتی ہیں۔ صرف کسی ایک مال کو لے لیجئے۔ مثال کے طور پر گیہوں ہے۔ دیکھئے کہ گیہوں کی ایک بوری کو دوسرے مختلف مالوں کے بے شمار تناسب سے بدلا جاتا ہے۔ پھر بھی اس کی ویلیو جوں کی توں رہتی ہے، چاہے ہم اسے ریشم سے بدلیں، سونے سے یا کسی اور مال سے، مگر وہ جو ویلیو ہے وہ مختلف چیزوں کے ساتھ تبادلے کی شرح بدلتے رہنے کے باوجود الگ اپنا کوئی وجود رکھتی ہے۔ مختلف مالوں سے تبادلے میں جو طرح طرح کی نسبتیں بنتی ہیں ان سے ہٹ کر بھی کسی الگ صورت میں ویلیو کو ظاہر کرنے کا امکان تلاش کرنا چاہئے۔

آگے چلئے : اگر میں کہوں کہ گیہوں کی ایک بوری لوہے کی ایک خاص مقدار سے بدلی جاتی ہے یا گیہوں کی ایک بوری کی ویلیو لوہے کی اتنی مقدار میں ظاہر ہوتی ہے تو مطلب یہ ہوا کہ گیہوں کی ویلیو اور اس کے مساوی لوہے کی ویلیو برابر ہیں کسی تیسری چیز کے، جو نہ گیہوں ہے، نہ لوہا، کیوں کہ میرے ذہن میں ان دونوں کی ایک خاص مقدار دو مختلف صورتوں میں آئی ہے۔ چنانچہ گیہوں یا لوہا، دونوں میں سے کوئی بھی مال ایک دوسرے سے قطعی بے تعلق رہ کر اس تیسری چیز کے مساوی ہوگا جس میں ان دونوں کا مشترکہ ناپ موجود ہے۔

اسی پوائنٹ کو اور واضح کرنے کے لئے میں سیدھی اقلیدسی شکل لیتا ہوں۔ مثلثوں کی جتنی بھی شکلیں بن سکتی ہیں اور جتنے بھی چھوٹے بڑے مثلث بنائے جاسکتے ہیں ان کے رقبے کا موازنہ کرنے میں، یا



مثلثوں کا مستطیل کے رقبے سے یا زاویہ قائمہ کی کسی اور شکل کے رقبے سے موازنہ کرنے میں ہمیں کیا کرنا ہوتا ہے؟ ہم کسی بھی مثلث کو لے کر اس کا رقبہ ایسی صورت میں نکال لیتے ہیں جو اس مثلث کی ظاہرہ شکل سے قطعی مختلف ہوتی ہے۔ خود مثلث کی بناوٹ سے ہی ہم نے یہ اصول بنا لیا ہے کہ بنیاد کو بلندی سے ضرب دے کر جو حاصل ضرب ہوگا، مثلث کا پورا رقبہ اس سے آدھا ہوگا۔ اب ہم اس رقبے کو ہر قسم کے مثلثوں اور طرح طرح کی شکلوں کے مستطیلوں کے مختلف رقبوں سے ملا کر دیکھ سکتے ہیں کیوں کہ ان کے جتنے بھی رقبے نکلیں گے وہ سب مثلثوں کی کسی نہ کسی تعداد کے رقبے کے برابر ہی پہنچیں گے۔

مختلف مالوں کی ویلیو نکالنے میں بھی حساب کا یہی قاعدہ اپنایا جا سکتا ہے۔ ہمیں ان سب کی قدروں کو کسی ایسی صورت میں ڈھالنا چاہئے جو سب میں مشترک ہو البتہ وہ خاص ناپ ان مالوں میں جتنا کم یا زیادہ ہو اسی نسبت سے وہ ایک دوسرے سے الگ پہچانے جائیں۔

چوں کہ مالوں کے اندر مبادلے کی قدریں صرف ان چیزوں کی سماجی کارگزاری میں ہی ہوتی ہیں اور ان چیزوں کی قدرتی خاصیتوں سے ویلیو کو کچھ واسطہ نہیں ہوتا اس لئے ہمارا پہلا سوال یہ ہوگا کہ مالوں کے اندر وہ کونسا سماجی جوہر ہے جو سب میں مشترک ہو؟ وہ ہے لیبر (محنت)۔ کسی مال کو تیار کرنے میں محنت کی خاصی مقدار یا تو اس پر لگائی پڑتی ہے یا اس میں کھپی ہوتی ہے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ محض محنت کی نہیں بلکہ سماجی محنت کی خاص مقدار۔ جب کوئی شخص ایک چیز فوری ضرورت کے لئے، ذاتی استعمال کے لئے تیار کرتا ہے تو وہ ایک تیار چیز ہوئی، تیار مال نہیں ہوا۔ اس شخص نے اپنا کام چلانے کو ایک چیز تیار کی تو اسے سماج سے کچھ سرورکار نہیں۔ لیکن مال تیار کرنے میں ہوتا یہ ہے کہ آدمی صرف وہی چیز نہیں بناتا جو کسی سماجی ضرورت کی تسکین کر دے بلکہ خود اس کی محنت بھی اس مجموعی مقدار محنت کا ایک لازمی حصہ ہوتی ہے جو سماج نے چیزوں کے بنانے پر خرچ کی ہے

ہر آدمی کی محنت اس محنت کی تقسیم کی پابند ہے جو سماج کے اندر جاری ہوتی ہے۔ سماجی محنت کی دوسری کڑیوں سے الگ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ انہی کو جوڑنے اور ان کا حصہ بننے میں یہ ذاتی محنت کام آتی ہے۔

جب ہم مالوں کو قدریں شمار کرتے ہیں تو ہماری نظر میں ان کا صرف ایک ہی پہلو ہوتا ہے کہ وہ حاصل کی ہوئی، سمٹی ہوئی، اور آپ چاہیں تو یوں کہئے کہ ٹھوس شکل میں سمائی ہوئی سماجی محنت ہیں۔ اس حیثیت سے ان میں اگر کوئی فرق ہے تو اس بات کا کہ محنت کی کم مقدار لگی ہے یا زیادہ۔ مثلاً ایک ریشمی روبال تیار کرنے میں محنت کی زیادہ مقدار لگی ہوگی اور اینٹ تیار کرنے میں کم۔ سوال یہ ہے کہ محنت کی مقدار کیسے ناپی جائے؟ ناپ ہوگا جتنی دیر محنت کی گئی وہ وقت۔ گھنٹوں اور دنوں وغیرہ کے حساب سے محنت ناپی جائے گی۔ اور اس ناپ سے کام لے کر ہم سب طرح کی محنتوں کا ایک اوسط یا معمولی محنت کی سطح پر لا کر ان کی اکائی معلوم کر لیں گے۔

چنانچہ اب ہم اس نتیجے پر پہنچے: مال میں ایک ویلیو ہوتی ہے، وجہ یہ کہ سماجی محنت کا ایک ٹھوس شکل اختیار کرنا ہی مال ہے۔ اس کی ویلیو کا سائز یا نسبتی ویلیو کتنی بڑی ہے، یہ بات منحصر ہے اس پر کہ جو سماجی جوہر اس مال میں موجود ہے وہ زیادہ ہے یا کم۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیں کہ اس مال کی تیاری میں جو مجموعی محنت صرف ہونی لازم ہے اس کی نسبتی کمی بیشی پر ویلیو کا سائز منحصر ہوتا ہے۔ مختلف مالوں کی قدروں کا باہم کم و بیش ہونا اس سے طے پاتا ہے کہ ان میں محنت کی کتنی کتنی مقدار لگ چکی ہے، کھپی ہوئی ہے، یا جمع ہے۔ محنت کے یکساں وقت میں جو مال بنتے ہیں ان کی مالیت بھی یکساں ہوتی ہے۔ یا یوں کہیں کہ ایک مال کی ویلیو دوسرے مال کی ویلیو سے وہی نسبت رکھتی ہے جو نسبت ایک مال میں لگی ہوئی محنت اور دوسرے مال میں لگی ہوئی محنت کے درمیان ہوتی ہے۔



مجھے اندیشہ ہے کہ آپ میں سے اکثر لوگ سوال کر بیٹھیں گے کہ مال کی قدریں اجرت سے طے پانے میں یا محنت کی جتنی مقدار اس مال کی تیاری میں لگنی ضروری ہے، اس مقدار کی نسبت سے طے پانے میں کیا واقعی اتنا بڑا یا کچھ بھی فرق پڑتا ہے؟ آپ یہ تو ضرور جانتے ہیں کہ محنت کا انعام اور محنت کی مقدار، یہ دونوں بالکل الگ چیز ہیں۔ آئیے، فرض کریں کہ ایک بوری گیہوں میں اور ایک اونس سونے میں برابر کی محنت لگی ہوئی ہے۔ میں نے یہ مثال اس لئے اختیار کی کہ بنجائن فرینکلن نے ۱۷۲۹ء میں شائع شدہ اپنے پہلے مضمون میں یہی مثال لی تھی۔ مضمون کا عنوان تھا ”کاغذی کرنسی کی فطرت اور ضرورت کے بارے میں ایک ہلکی سی تحقیق“، ویلیو کی اصلیت ٹٹولنے کی یہ بھی ایک اولین کوشش تھی۔ خیر تو ہم فرض کر لیتے ہیں کہ گیہوں کی ایک بوری اور ایک اونس سونے میں برابر کی ویلیو ہے یا قدر میں دونوں مساوی ہیں کیوں کہ دونوں میں اوسط درجے کی محنت کی ایک سی مقدار ٹھوس شکل اختیار کئے ہوئے ہے، اتنے دن یا اتنے ہفتے کی محنت ان کے اندر اکٹھی ہو گئی ہے۔ اس طرح سے جب ہم سونے اور اناج کی نسبتی قدریں طے کرتے ہیں تو کیا کہیں ان اجرتوں کا حوالہ بھی آتا ہے جو زراعت کے محنتی کو یا کان کھودنے والے کو دی گئی ہے؟ قطعی نہیں۔ ہم اس کے بارے میں کوئی سوال ہی نہیں کرتے کہ ان دونوں کی روزانہ یا ہفتہواری محنت کیونکر ادا کی گئی بلکہ یہ سوال تک درمیان میں نہیں آتا کہ ان مالوں میں اجرتی محنت (مزدوری) لگی بھی ہے یا نہیں۔ اگر ایسا ہوا ہے تو دونوں کی اجرتوں میں بڑا فرق رہا ہوگا۔ وہ مزدور جس کی محنت گیہوں کی ایک بوری میں لگی ہے، ممکن ہے اسے اجرت میں صرف اناج کے دو تھیلے ملے ہوں، اور جس نے کان پر کام کیا اسے سونے کا آدھا اونس مل گیا ہو۔ یا فرض کیجئے کہ ان کی اجرتیں برابر تھیں، تب بھی ممکن ہے کہ جو مال انہوں نے تیار کئے ہیں ان کی قدروں سے اجرتوں کا تناسب انتہائی مختلف رہا ہو۔ مال کی قدروں کے سامنے وہ آدھا ہو، تھائی، چوتھائی یا پانچواں

حصہ ہو، ایک بوری اناج اور ایک اونس سونے کا کوئی سا حصہ ہو سکتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جو مال انہوں نے تیار کیا ہے اس کی ویلیو کی حد سے اجرت بڑھ نہیں سکتی، زیادہ نہیں ہو سکتی، لیکن کم ہونے کو وہ کتنی بھی کم ہو سکتی ہے۔ تیار شدہ مال کی قدروں نے ان کی اجرتوں کی حد مقرر کر رکھی ہے لیکن اجرتوں نے تیار شدہ مال کی قدروں پر حد نہیں لگائی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مثال میں اناج اور سونے کی قدریں، نسبتی قدریں، لگی ہوئی محنت کی ویلیو یعنی اجرت شمار کئے بغیر ہی طے ہو جاتی ہیں۔ لہذا مالوں میں جتنی جتنی مقدار لیبر کی لگی ہوئی ہے، اسی نسبت سے مالوں کی قدریں طے پانا قطعی اور بات ہے، اور یہ طریقہ کہ محنت کی ویلیو یعنی اجرت کی نسبت سے مالوں کی قدریں طے پانا بالکل دوسری چیز ہے۔ آگے کی چھان بین میں یہ نکتہ اور بھی واضح ہو جائے گا۔

کسی مال کی قدرمبادلہ (اکسچینج ایبل ویلیو) نکالتے وقت ہمیں چاہئے کہ پیداوار کے آخری مرحلے پر محنت کی جتنی مقدار لگی ہے اسی میں پہلے کی لگی ہوئی محنت کی مقدار بھی جوڑ لیں۔ یعنی اتنی محنت جو اس کے کچے مال پر خرچ ہو چکی ہے، اوزار، کل پرزے، مشین اور بلڈنگ پر لگ چکی ہے، جس سے بعد کی محنت کو مدد ملی۔ مثال کے طور پر سوتی دھاگے کی کسی ایک مقدار کی ویلیو معلوم کرنے کے لئے روئی کی کتائی ہوتے وقت لگی ہوئی محنت کی مقدار کو محنت کی اس مقدار کے ساتھ جوڑیں جو خود روئی تیار ہونے میں لگ چکی ہے۔ اور اسی میں محنت کی وہ مقدار بھی جو کوئلے، تیل اور دوسرے استعمالی مسالوں میں کھپی ہوئی ہے، پھر وہ مقدار جو بھاپ کے انجن میں، تکیوں اور سانچوں میں، فیکٹری کی عمارت میں کھپی ہوئی ہے، یہ سب یکجا کی جائیں گی۔ وہ جو بجا طور پر پیداوار کے اوزار کہلاتے ہیں، جیسے اوزار، مشین، عمارتیں پیداوار کے مسلسل عمل میں تھوڑے یا بہت عرصے کے لئے برابر کام دئے جاتے ہیں۔ اگر وہ بھی کچے مال ہی کی طرح ایک دم استعمال میں آکر تمام ہو جائیں تو ان کی بھی تمام ویلیو ان مالوں پر ڈال دی جائے گی



مجھے اندیشہ ہے کہ آپ میں سے اکثر لوگ سوال کر بیٹھیں گے کہ مال کی قدریں اجرت سے طے پانے میں یا محنت کی جتنی مقدار اس مال کی تیاری میں لگنی ضروری ہے، اس مقدار کی نسبت سے طے پانے میں کیا واقعی اتنا بڑا یا کچھ بھی فرق پڑتا ہے؟ آپ یہ تو ضرور جانتے ہیں کہ محنت کا انعام اور محنت کی مقدار، یہ دونوں بالکل الگ چیز ہیں۔ آئیے، فرض کریں کہ ایک بوری گیہوں میں اور ایک اونس سونے میں برابر کی محنت لگی ہوئی ہے۔ میں نے یہ مثال اس لئے اختیار کی کہ بنجامن فرینکلن نے ۱۷۲۹ء میں شائع شدہ اپنے پہلے مضمون میں یہی مثال لی تھی۔ مضمون کا عنوان تھا ”کاغذی کرنسی کی فطرت اور ضرورت کے بارے میں ایک ہلکی سی تحقیق“، ویلیو کی اصلیت ٹٹولنے کی یہ بھی ایک اولین کوشش تھی۔ خیر تو ہم فرض کر لیتے ہیں کہ گیہوں کی ایک بوری اور ایک اونس سونے میں برابر کی ویلیو ہے یا قدر میں دونوں مساوی ہیں کیوں کہ دونوں میں اوسط درجے کی محنت کی ایک سی مقدار ٹھوس شکل اختیار کئے ہوئے ہے، اتنے دن یا اتنے ہفتے کی محنت ان کے اندر اکٹھی ہو گئی ہے۔ اس طرح سے جب ہم سونے اور اناج کی نسبتی قدریں طے کرتے ہیں تو کیا کہیں ان اجرتوں کا حوالہ بھی آتا ہے جو زراعت کے محنتی کو یا کان کھودنے والے کو دی گئی ہے؟ قطعی نہیں۔ ہم اس کے بارے میں کوئی سوال ہی نہیں کرتے کہ ان دونوں کی روزانہ یا ہفتہ واری محنت کیونکر ادا کی گئی بلکہ یہ سوال تک درمیان میں نہیں آتا کہ ان مالوں میں اجرتی محنت (مزدوری) لگی بھی ہے یا نہیں۔ اگر ایسا ہوا ہے تو دونوں کی اجرتوں میں بڑا فرق رہا ہوگا۔ وہ مزدور جس کی محنت گیہوں کی ایک بوری میں لگی ہے، ممکن ہے اسے اجرت میں صرف اناج کے دو تھیلے ملے ہوں، اور جس نے کان پر کام کیا اسے سونے کا آدھا اونس مل گیا ہو۔ یا فرض کیجئے کہ ان کی اجرتیں برابر تھیں، تب بھی ممکن ہے کہ جو مال انہوں نے تیار کئے ہیں ان کی قدروں سے اجرتوں کا تناسب انتہائی مختلف رہا ہو۔ مال کی قدروں کے سامنے وہ آدھا ہو، تنہائی، چوتھائی یا پانچواں

حصہ ہو، ایک بوری اناج اور ایک اونس سونے کا کوئی سا حصہ ہو سکتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جو مال انہوں نے تیار کیا ہے اس کی ویلیو کی حد سے اجرت بڑھ نہیں سکتی، زیادہ نہیں ہو سکتی، لیکن کم ہونے کو وہ کتنی بھی کم ہو سکتی ہے۔ تیار شدہ مال کی قدروں نے ان کی اجرتوں کی حد مقرر کر رکھی ہے لیکن اجرتوں نے تیار شدہ مال کی قدروں پر حد نہیں لگائی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مثال میں اناج اور سونے کی قدریں، نسبتی قدریں، لگی ہوئی محنت کی ویلیو یعنی اجرت شمار کئے بغیر ہی طے ہو جاتی ہیں۔ لہذا مالوں میں جتنی جتنی مقدار لیبر کی لگی ہوئی ہے، اسی نسبت سے مالوں کی قدریں طے پانا قطعی اور بات ہے، اور یہ طریقہ کہ محنت کی ویلیو یعنی اجرت کی نسبت سے مالوں کی قدریں طے پانا بالکل دوسری چیز ہے۔ آگے کی چھان بین میں یہ نکتہ اور بھی واضح ہو جائے گا۔

کسی مال کی قدریں بدلہ (اکسچینج ایبل ویلیو) نکالتے وقت ہمیں چاہئے کہ پیداوار کے آخری مرحلے پر محنت کی جتنی مقدار لگی ہے اسی میں پہلے کی لگی ہوئی محنت کی مقدار بھی جوڑ لیں۔ یعنی اتنی محنت جو اس کے کچے مال پر خرچ ہو چکی ہے، اوزار، کل پرزے، مشین اور بلڈنگ پر لگ چکی ہے، جس سے بعد کی محنت کو مدد ملی۔ مثال کے طور پر سوتی دھاگے کی کسی ایک مقدار کی ویلیو معلوم کرنے کے لئے روئی کی کتائی ہوتے وقت لگی ہوئی محنت کی مقدار کو محنت کی اس مقدار کے ساتھ جوڑیں جو خود روئی تیار ہونے میں لگ چکی ہے۔ اور اسی میں محنت کی وہ مقدار بھی جو کوئلے، تیل اور دوسرے استعمالی مسالوں میں کھپی ہوئی ہے، پھر وہ مقدار جو بھاپ کے انجن میں، تکلیوں اور سانچوں میں، فیکٹری کی عمارت میں کھپی ہوئی ہے، یہ سب یکجا کی جائیں گی۔ وہ جو بجای طور پر پیداوار کے اوزار کہلاتے ہیں، جیسے اوزار، مشین، عمارتیں پیداوار کے مسلسل عمل میں تھوڑے یا بہت عرصے کے لئے برابر کام دئے جاتے ہیں۔ اگر وہ بھی کچے مال ہی کی طرح ایک دم استعمال میں آکر تمام ہو جائیں تو ان کی بھی تمام ویلیو ان مالوں پر ڈال دی جائے گی



جنہیں تیار کرنے میں وہ کام آتے ہیں۔ مگر چوں کہ ان کا مصرف رفتہ رفتہ ہوتا ہے، جیسے سوتی مل کا سانچہ دیر تک چلتا ہے تو اس کا بھی کارکردگی کی مدت کے حساب سے ایک اوسط نکالا جاتا ہے اور اس حساب سے کسی مقررہ مدت مثلاً ایک دن کی گھسائی اور ٹوٹ پھوٹ کا اوسط نکل آتا ہے۔ اس طرح ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک سانچے کی پوری ویلیو کا کتنا حصہ ایک دن کی کٹائی میں نکل جاتا ہے اور اسی طرح یہ بھی کہ ایک پونڈ دھاگے کے اندر محنت کی جو کل مقدار لگی ہوئی ہے اس میں محنت کی کتنی مقدار پہلے سے خرچ ہو کر ایک سانچے کے حصے میں آچکی تھی۔ جو مقصد فی الحال پیش نظر ہے، اس کا تقاضا ہے کہ زیربحث نکتے کو زیادہ نہ پھیلائیں۔

ممکن ہے یوں نظر آئے کہ اگر کسی مال کی ویلیو محنت کی اس مقدار سے ہی طے ہونی ٹھیری جو مال کی تیاری میں کھپ گئی ہے تو

پھر آدمی جتنا سست یا کام چور ہوگا اس کے مال کی ویلیو بھی اتنی ہی بڑھ جائے گی کیوں کہ مال پر اپنا کام پورا کرنے میں وہ محنت کا اور بھی زیادہ وقت لگائے گا۔ نہیں، یہ افسوسناک غلط فہمی ہوگی۔ یاد کیجئے کہ میں نے ”سماجی محنت“ کا لفظ استعمال کیا تھا۔ اس ایک ”سماجی“ کی شرط میں کئی نکتے پوشیدہ ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ کسی مال کی ویلیو محنت کی اس مقدار سے طے پاتی ہے جو اس پر لگائی گئی یا اس میں ٹھوس طریقے سے موجود ہے تو ہمارا مطلب ہے کہ محنت کی وہ مقدار جو اس مال کی تیاری کے لئے لازم ہے،

سماج کی ایک خاص حالت میں، پیداوار کے جو اوسط سماجی حالات ہیں ان میں، کام کی رفتار کا جو سماجی اوسط ہے اور لیبر کی ہنرمندی یا قابلیت کے اوسط درجے میں۔ انگلینڈ میں جب پاور لوم نے ہینڈلوم (کھدی کی بنائی) سے مقابلہ شروع کیا تو دھاگے کی مقررہ مقدار کو ایک گز سوت یا ایک گز کپڑا بنانے کے لئے پہلے سے صرف آدھا وقت محنت کافی ہونے لگا۔ ہاتھ کے بنکر غریب جو پہلے نو دس گھنٹے روزانہ کام کیا کرتے تھے، اب انہیں روز سترہ اٹھارہ گھنٹے کام کرنا پڑ گیا۔ پھر بھی جتنا مال وہ بیس گھنٹے کی محنت سے تیار کرتے تھے

وہ سماجی وقت محنت کے دس گھنٹے کے برابر رہا، یا یوں کہئے کہ دھاگے کی مقررہ مقدار کو سوتی کپڑا بنانے میں دس گھنٹے کی محنت سماجی طور پر لازم رہ گئی۔ چنانچہ اب بیس گھنٹے میں جو مال ہاتھ کے بنکر نے تیار کیا اس کی ویلیو اتنی ہی رہ گئی جتنی پہلے دس گھنٹے میں تیار کئے ہوئے مال کی ہوا کرتی تھی۔

غرضکہ تیار ہونے والے مال میں جو سماجی طور سے لازمی محنت لگی ہوئی ہے، اس محنت کی مقدار سے ہی مال کی قدرمبادلہ طے پاتی ہے تو اس مال کی تیاری کی خاطر محنت کی مقدار جتنی بڑھے گی، وہ مال کی ویلیو بھی بڑھا دے گی اور محنت کی مقدار جتنی گھٹے گی، مال کی ویلیو بھی اتنی ہی گھٹا دے گی۔

الگ الگ مالوں کی تیاری کے لئے جتنی محنت ضروری ہے اگر اس کی الگ مقدار ایک حال پر قائم رہتی ہے تو ان کی نسبتی قدروں کو بھی قائم رہنا چاہئے۔ لیکن ایسا ہوتا نہیں ہے۔ کسی مال کی تیاری کے لئے محنت کی جو مقدار لازم ہوتی ہے وہ برابر بدلتی رہتی ہے اس لیبر کی پیداواری طاقت کے فرق کے ساتھ جس سے کام لیا گیا ہے۔ لیبر کی پیداواری طاقت جتنی زیادہ ہوگی اتنا ہی زیادہ مال ایک مقررہ وقت محنت میں بن کر تیار ہوگا۔ اور اسی طرح لیبر کی پیداواری طاقت جتنی کم ہوگی، اتنا ہی کم مال اسی وقت محنت میں بن کر تیار ہو سکے گا۔ مثال کے طور پر اگر آبادی بڑھنے کے ساتھ ساتھ کمزور زمینوں پر کاشت کرنا ضروری ہو جائے تو پیداوار کی وہی پہلے کی سی مقدار حاصل کرنے کے لئے محنت کی زیادہ مقدار خرچ کرنی پڑے گی، نتیجہ یہ کہ زرعی پیداوار کی ویلیو برابر بڑھتی جائے گی۔ اب دوسری طرف سے دیکھئے کہ اگر پیداوار کے جدید ذریعوں سے کام لے کر کوئی ایک بنکر کپاس کی مقدار کو جس کام کے ایک دن کے دوران چرخہ کاٹا کرتی تھی، اتنے ہی وقت میں اس سے کئی ہزار گنا دھاگا بنا کر رکھ دیتا ہے تو یہ ظاہر بات ہے کہ کپاس کا ہر ایک پونڈ پہلے کے مقابلے میں کٹائی کی محنت ہزاروں گنی کم جذب کریگا۔ نتیجہ یہ کہ کپاس کے ایک ایک پونڈ میں کٹائی سے جو ویلیو بڑھ جایا کرتی تھی، وہ پہلے سے



ہزاروں گنا کم ہو جائے گی اور اسی حساب سے دھاگے کی ویلیو بھی بہت نیچے جائے گی۔

مختلف لوگوں میں قدرتی صلاحیت، طاقت اور کام کرنے کے خاص اکتسابی تجربے کا جو فرق ہوتا ہے، اس سے قطع نظر لیبر کی پیداواری طاقت خاص طور سے ان باتوں پر منحصر ہے :

اول، تو محنت کے قدرتی حالات پر، مثلاً زمین کی زرخیزی، کانوں وغیرہ کی حالت پر؛

دوسرے، لیبر کی سماجی طاقت کی رفتہ رفتہ بہتری پر۔ ایسی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں تب جب بڑے پیمانے پر مال تیار کیا جائے، بڑا سرمایہ لگا ہو اور لیبر بہت اکٹھی ہو چکی ہو، محنت کی تقسیم در تقسیم چلی گئی ہو، مشینری، ترقی یافتہ طریقے، کیمیکل اور دوسری قدرتی صلاحیتوں کا استعمال ہو، رسل و رسائل اور سامان لانے لے جانے کی سہولت کے ذریعے وقت اور جگہ کی بچت کی گئی ہو، اور بھی مختلف ایجادوں سے جن کے ذریعے سائنس قدرتی صلاحیتوں کو انسانی محنت کی خدمت میں لگا دیتی ہے اور جن کی بدولت لیبر کا سماجی یا مل کر کام کرنے والا کردار ابھرتا ہے۔ لیبر کی پیداواری طاقتیں جتنی بڑھتی جائیں گی سامان کی ایک مقدار تیار کرنے میں اتنی ہی کم محنت کھپے گی اور اس کے باعث مال کی ویلیو بھی اور گھٹ جائے گی۔ اور لیبر کی پیداواری طاقت جتنی کم ہوگی، سامان کی پہلے والی مقدار تیار کرنے میں اتنی ہی زیادہ محنت کھپے گی۔ پس اس کی ویلیو بھی اور بڑھ جائے گی۔ اب ایک کلیے کی شکل میں ہم اسے یوں رکھتے ہیں کہ :

مالوں کی قدریں سیدھے سیدھے محنت کے اس وقت سے مناسبت رکھتی ہیں جو اس سامان کی تیاری میں لگا ہے، اور دوسری سمت میں وہ لگی ہوئی محنت کی پیداواری طاقت سے الٹی مناسبت رکھتی ہیں۔

اب تک ساری گفتگو ویلیو (قدر) پر ہوتی رہی، اب کچھ قیمت کے بارے میں بھی کہتا چلوں۔ قیمت ہی ایک نرالا روپ ہے ویلیو کا۔

قیمت بجائے خود کچھ نہیں، سوائے اس کے کہ نقدی کی صورت میں ظاہر ہونے والی ویلیو ہے۔ مثلاً یہاں، انگلینڈ میں جتنے مال

بن کر نکلتے ہیں ان کی ویلیو سونے کی قیمتوں میں ظاہر کی جاتی ہے اور براعظم یورپ کے سارے مالوں کی قدریں چاندی کی قیمتوں میں۔ دوسرے مالوں کی طرح خود سونے چاندی کی قیمتیں بھی محنت کی اس مقدار کی پابند ہیں جو ان دونوں دھاتوں کے حاصل کرنے میں کھپنی ضروری ہے۔ آپ اپنی قومی پیداوار کی ایک خاص مقدار جس میں آپ کی قومی محنت کی ایک خاص مقدار ٹھوس شکل میں موجود ہے سونا اور چاندی پیدا کرنے والے ملکوں کے ہاتھ بدلتے ہیں اور ان ملکوں کا سامان لیتے ہیں جس میں ان ملکوں کی محنت کی بھی ایک خاص مقدار ٹھوس شکل میں موجود ہے۔ اس طرح مال کی ادلا بدلی سے آپ سونے اور چاندی کی صورت میں تمام مالوں کی قدریں ظاہر کرنے لگتے ہیں یعنی جتنی جتنی محنت ان پر لگ چکی ہے اس کا اظہار سونے، چاندی میں کرتے ہیں۔ ویلیو کا نقدی میں جو اظہار ہوتا ہے یا اسی کو یوں کہہ لیجئے کہ ویلیو جو قیمت کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے، اس کو اگر اور گہرائی تک دیکھئے تو یہ کھلے گا کہ ایک سلسلہ وار عمل ہے جس کے ذریعے آپ تمام مالوں کی قدروں کو الگ سے اور ایکساں روپ دے دیتے ہیں، یا جس کے ذریعے آپ یوں کرتے ہیں کہ برابر کی سماجی محنت کی مقداروں میں تمام مالوں کی ویلیو ظاہر ہو جائے۔ قیمت کی یہ جو حیثیت ہے کہ وہ نقدی کے روپ میں ظاہر ہونے والی ویلیو ہی ہوتی ہے۔ تو اس کا نام آدم اسمتھ نے نیچرل پرائس رکھا ہے اور فرانسیسی Physiocrats (۲۱) نے اسے ”لازمی قیمت“ (Prix nécessaire) کہا ہے۔

اچھا تو ویلیو اور بازار کی قیمتوں میں یا یوں کہیں کہ قدرتی قیمتوں اور بازار کے داموں میں کیا نسبت ہے؟ آپ سب کو معلوم ہے کہ کسی ایک قسم کے تمام مالوں کے بازار دام ایک ہی ہوتے ہیں، چاہے مال تیار کرنے والوں کے اپنے حالات میں کتنا ہی فرق کیوں نہ ہو۔ بازار دام سے صرف اتنا ظاہر ہوتا ہے کہ کسی ایک چیز کی کوئی خاص مقدار بازار میں لانے کے لئے، اس کے پیداوار کے اوسط حالات میں سماجی محنت کی کتنی اوسط مقدار لازم ہوتی ہے۔ کسی ایک خاص قسم کے مال کی پوری کھپ پر بازار دام کا حساب پھیلایا



جاتا ہے۔ یہاں تک تو بازار دام مال کی ویلیو سے میل کھاتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف بازار میں اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے، کبھی قدرتی قیمت یا ویلیو سے بازار اوپر گیا، کبھی نیچے اتر گیا، یہ منحصر ہے مانگ اور سپلائی کے اتار چڑھاؤ پر۔ بازار کے داموں کا پہلے ویلیو کے برابر نہ ٹھہرنا مستقل نظر آتا ہے، لیکن جیسا کہ آدم اسمتھ نے کہا ہے، بات یوں ہے کہ :

”نیچرل قیمت ہی وہ بیچ کی قیمت ہے جس کی طرف تمام مالوں کی قیمتیں ہرپھر کر آتی رہتی ہیں۔ اتفاقی اسباب پیدا ہو جاتے ہیں جو قیمتوں کو کبھی اچھا خاصا اوپر لے جا کر تھامے رکھتے ہیں اور کبھی انہیں نیچے اترنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ لیکن بیچ کی اس بکی قیمت سے ہٹانے والی چاہے کتنی ہی رکاوٹیں کیوں نہ آتی رہیں۔ تاہم بار بار قیمت اسی درمیانی نقطے پر آکر ٹھہرنا چاہتی ہے۔“ (۲۲)

میں فی الحال اس سوال کی زیادہ جہان بین نہیں کرتا۔ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اگر مانگ اور سپلائی میں توازن بنا رہے تو مالوں کے بازار دام ان کی نیچرل قیمتوں سے تال میل رکھتے ہیں، یعنی اس ویلیو سے مناسبت رکھتے ہیں جو کسی مال کی تیاری میں لگنے والی محنت کی مقدار سے ہی طے پاتی ہے۔ مگر سپلائی اور مانگ کو مستقل ایک دوسرے کا پہلے برابر رکھنے میں لگا رہنا چاہئے، حالاں کہ ہوتا یہ ہے کہ کبھی ایک اور کبھی دوسرا پہلے بھاری کر کے، یعنی کبھی تیزی کو مندی سے اور کبھی اس کے برعکس کر کے وہ کمی بیشی کا حساب برابر کر لیتے ہیں۔ اگر ایک دن کی تیزی مندی کو نظر میں رکھنے کے بجائے آپ زیادہ عرصے تک بازار کے داموں کی رفتار کا تجزیہ کریں جیسا کہ مسٹر ٹوک نے اپنی تصنیف ”قیمتوں کی تاریخ“ میں کیا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ بازار کے داموں کا چڑھنا اترنا، ویلیو سے ہٹا رہنا، تیزی اور مندی ایک دوسرے کا اثر زائل کرتی اور باہم تلافی کر لیتی ہے۔ سوائے اس کے کہ اجارہ داری

اور بعض دوسری وجہیں جو اثر انداز ہوا کرتی ہیں، ان سے قطع نظر کرتے ہوئے مجھے اتنا کہنا ہے کہ مالوں کی جتنی قسمیں ہوتی ہیں وہ سب کی سب اوسط میں اپنی قدروں یا نیچرل قیمتوں پر ہی فروخت کی جاتی ہیں۔ اوسط مدت جس کے اندر بازار دام اونچ نیچ کے ذریعے اپنا حساب برابر کر لیتے ہیں، مال کی مختلف قسموں کے معاملے میں مختلف ہوتی ہے، کیوں کہ ایک قسم کا مال سپلائی اور مانگ کے مطابق خود کو زیادہ آسانی سے ڈھال لیتا ہے اور دوسرا زیادہ مشکل سے۔

اب اگر پورے پھیلاؤ کے ساتھ اور بڑی مدت کے لین دین کو نظر میں رکھ کر یہ صحیح ہے کہ مال کی سب قسمیں اپنی اپنی قدروں کے حساب سے بکتی ہیں تو یہ فرض کرنا بے معنی ہوگا کہ خود منافع، ایک آدھ معاملے میں نہیں، بلکہ مختلف کاروباروں میں مستقل اور معمول کے منافع مالوں کی قیمتوں میں اوپر سے نکالے جاتے ہیں یعنی منافع اس طرح وصول ہوتے ہیں کہ چیزوں کو ان کی ویلیو سے بڑھا کر بیچا جاتا ہے۔ اگر آپ اس مفروضے کو پھیلا کر دیکھیں تو اس کی لغویت بالکل ہی سامنے آجائے۔ اگر یوں ہوتا تو آدمی جو منافع بیوپاری کی حیثیت میں اٹھاتا وہ گاہک کی حیثیت میں ہاتھ سے دیتا رہتا۔ یہ کہنے سے تو کام چلے گا نہیں کہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو بیوپاری تو ہیں، گاہک نہیں یا مال اٹھانے والے (صارف) تو ہیں، بنانے والے نہیں۔ مال بنانے والے کو جو کچھ ادا کرنا ہے وہ پہلے مفت میں انہی سے وصول بھی ہونا چاہئے۔ اگر کوئی شخص پہلے آپ سے روپیہ لے لے اور پھر مال خریدنے میں وہی روپیہ آپ کو ادا کر دے تو آپ چاہے اپنا مال اس شخص کے ہاتھ کتنا ہی سہنگا کیوں نہ بیچیں، مالدار ہونے سے رہے۔ اس طرح کے لین دین میں یہ تو ممکن ہے کہ نقصان کم ہو لیکن نفع کی کوئی گنجائش نہیں۔

لہذا منافع کی عام فطرت بیان کرنے کے لئے آپ کو اس کلمے سے شروع کرنا چاہئے کہ اوسط میں سارے مال اپنی اصلی ویلیو پر بیچے جاتے ہیں اور انہیں ان کی ویلیو پر بیچ کر ہی یعنی ان کے اندر جتنی لیبر کھپی ہو اسی کی نسبت سے بیچ کر منافع نکالا جاتا ہے۔



اگر منافع کو ہم اس قاعدہ کلیہ میں نہ ڈھال سکے تو پھر منافع کی کوئی تشریح نہیں ہو سکتی۔ ظاہر یہ ایک قول محال (Paradox) معلوم ہوتا ہے اور روزانہ کے مشاہدے کے خلاف جاتا ہے۔ لیکن یہی کیا اور بھی قول محال ہیں جیسے یہ کہنا کہ زمین سورج کا چکر کاٹتی ہے یا پانی ایسی دو گیسوں سے مل کر بنا ہے جن میں بھڑک اٹھنے کی خاصیت ہے۔ سائنسی حقیقت کو اگر آپ روزمرہ کے اس تجربے سے جانچیں جو چیزوں کا صرف رواں دواں منظر دیکھتا ہے تو وہ ہمیشہ ہی قول محال نکلے گی۔

## ۷۔ محنت کی قوت

جتنا ممکن تھا ویلیو کا، اور کسی بھی مال کی ویلیو کی فطرت کا سرسری تجزیہ کر چکنے کے بعد اب ہمیں اپنی توجہ اس طرف پھیرنی چاہئے کہ محنت کی خاص ویلیو کیا ہوتی ہے۔ اس دفعہ پھر میں ایک ظاہر قول محال پیش کر کے آپ کو حیرت میں ڈالنا چاہتا ہوں۔ آپ سب حضرات کو یقین ہے کہ جو کچھ آپ ہر روز بیچتے ہیں وہ ہے آپ کی محنت، یعنی محنت کی ایک قیمت ہے، اور چون کہ کسی مال کی قیمت اس کی ویلیو کا نقدی میں ظاہر ہونا ہی ہے تو محنت کی ویلیو نام کی کسی چیز کا وجود ضرور ہوا۔ لیکن عام معنوں میں محنت کی ویلیو جیسی کسی چیز کا وجود نہیں ہوتا۔ تاہم چون کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کسی مال کے اندر لازمی محنت کی جو مقدار ٹھوس شکل میں موجود ہے وہی اس کی ویلیو بنتی ہے۔ تب ہم ویلیو کے بارے میں اس کلیے کو اپناتے ہوئے یہ کیسے معین کریں کہ کام کے دن کے دس گھنٹے کی ویلیو کیا ہوئی۔ اس ایک دن میں کتنی محنت پڑی ہے؟ دس گھنٹے کی محنت۔ یہ کہنا کہ کام کے دن کے دس گھنٹے کی ویلیو برابر ہے دس گھنٹے کی محنت کے یا اتنی محنت کے جتنی اس وقت میں سمائی ہوئی ہے، یہ لفظی الٹ پھیر بلکہ

بے معنی بیان ہوگا۔ مانی ہوئی بات ہے کہ جب ”محنت کی ویلیو“ کے صحیح اور درپردہ مفہوم تک ہماری پہنچ ہو چکی ہے تو جیسے اجرام فلکی کی صحیح رفتار کا یقین کر چکنے کے بعد ہم ان کی ظاہر یا محض قاعدے کی پابند حرکت و رفتار کی تشریح بھی کر سکیں گے، اسی طرح اب ہم سمجھا سکتے ہیں کہ ویلیو کی اس انمل بے جوڑ اور بظاہر ناممکن سی عملی صورت کیا ہوتی ہے۔

جو چیز مزدور بیچتا ہے، وہ براہ راست اس کی محنت نہیں ہوتی، بلکہ محنت کرنے کی طاقت (قوت محنت) ہوتی ہے جسے عارضی طور پر وہ سرمایہ دار کے حوالے کر دیتا ہے۔ یہ ایسی نبی تلی بات ہے کہ قانون بنا دئے گئے ہیں۔ مجھے انگلینڈ کے بارے میں تو نہیں معلوم، لیکن کم از کم یورپ کے کئی ملکوں میں ایسے قانون ہیں کہ آدمی اپنی محنت کو زیادہ سے زیادہ اتنے وقت کے لئے بیچ سکتا ہے۔ اگر وقت کی کسی طرح کی قید نہ رکھی جائے تو پھر سے غلامی کا دور دورہ ہو جائے گا۔ اس طرح کی فروخت اگر ساری عمر چلتی رہے تو وہ فوراً انسان کو عمر بھر کے لئے ملازمت دینے والے کا غلام بنا ڈالے گی۔

ایک سب سے پرانے ماہر معاشیات اور نہایت اچھوتے خیالات کے انگریز فلسفی تھومس ہوبس نے اپنی تصنیف »Leviathan« میں بے اختیار اس نکتے کو چھو لیا تھا جسے بعد والوں نے نظر انداز کر دیا۔ وہ کہتا ہے:

”اور سب چیزوں کی طرح، انسان کی ویلیو یا مالیت بھی اس کی قیمت ہے، یعنی جو اس کی طاقت استعمال کرنے کے بدلے دی جاتی ہے۔“

اگر ہم اس بنیاد سے چلیں تو جیسے اور مالوں کی ویلیو نکالتے ہیں، محنت کی ویلیو کا فیصلہ بھی کر سکیں گے۔

لیکن ایسا کرنے سے پہلے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ یہ عجیب و غریب صورت حال کیوں کر سامنے آئی کہ بازار میں ایک طرف تو گاہکوں کا حلقہ ہے جس کے پاس زمین ہے، مشین ہے، کچا مال



ہے، ضروریات زندگی کا سروسامان ہے، اچھوتی زمینوں کے علاوہ ان میں سے ہر چیز محنت کی پیداوار ہے، دوسری طرف بیچنے والوں کی صف ہے جس کے پاس بیچنے کو کچھ ہٹی نہیں سوائے قوت محنت کے، سوائے محنت کرنے والے بازو اور دماغ کے؟ ایک صف ایسی کہ برابر خریداری کرتی چلی جاتی ہے تاکہ منافع سے خود کو مالا مال کرتی رہے، دوسری صف لگاتار بیچتی رہتی ہے تاکہ گزر اوقات کا ذریعہ کمائے۔ اس سوال کی چھان بین کا مطلب ہوگا اس چیز کی تحقیق جسے ماہرین معاشیات نے پہلے کی اور شروع والی جوڑ جمع کہا ہے اور جسے دراصل شروع کا قبضہ\* (Expropriation) کہنا چاہئے۔ اس تحقیق سے ہمیں پتہ چل جاتا کہ وہ جسے شروع والی جوڑ جمع کا نام دیا گیا ہے، اس کا صرف اتنا مطلب ہے کہ تاریخ کے سلسلہ وار عمل نے یہاں تک پہنچا دیا کہ محنت کرنے والے اور محنت کے اوزاروں کے درمیان جو شروع کی یگانگی چلی آتی تھی اس کے جوڑ کھل گئے۔ خیر یہ تحقیق میرے پیش نظر مضمون کے دائرے سے باہر ہے۔ محنت کرنے والے اور محنت کے اوزار کے درمیان یہ جدائی ایک بار ہو گئی تو پھر آگے بھی قائم رہتی ہے اور لگاتار بڑے پیمانے پر خود کو پھیلاتی رہتی ہے یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے جب طریق پیداوار میں ایک نیا اور گہرا انقلاب برپا ہو، اس جدائی کا تختہ الٹے اور نئی تاریخی شکل میں پہلے کی سی یگانگی پھر بن جائے۔ اچھا تو قوت محنت کی ویلیو کیا ہے؟

اور مالوں کی طرح قوت محنت کی ویلیو بھی یوں ہی طے ہوتی ہے کہ اسے پیدا کرنے کے لئے محنت کی کتنی مقدار لازم ہے۔ انسان کی محنت کی طاقت صرف اس میں ہے کہ وجود جیتا جاگتا رہے۔ ضروریات زندگی کی بہت ساری چیزیں ہیں کہ انسان اپنی نشوونما اور زندگی باقی رکھنے کے لئے انہیں استعمال میں لاتا ہے۔ لیکن مشین کی طرح آدمی بھی ٹوٹ کر رہ جاتا ہے، اس کی جگہ لینے کو دوسرا آدمی چاہئے۔ خود اپنا وجود باقی رکھنے کی خاطر جو بہت ساری چیزیں اسے درکار ہوتی ہیں، ان کے علاوہ اسے ضروریات کی ایک اور مقدار بھی حاصل کرنی

ہے تاکہ بچوں کی کسی ایک تعداد کو ہال پوس کر بڑا کرے جو لیبر کے بازار میں اس کی جگہ کھڑے ہو جائیں اور مزدوروں کی یہ دوڑ ہمیشہ چلتی رہے۔ پھر یہ کہ اس کی قوت محنت کو بڑھانے اور کوئی خاص ہنر ہاتھ میں لینے کی خاطر اور بھی کچھ قدریں خرچ کرنی پڑیں گی۔ ہماری موجودہ بحث کے لئے صرف اوسط محنت پر غور کرنا کافی ہوگا جس کی تعلیم اور ترقی پر برائے نام ہی خرچ آتا ہے۔ تاہم اس موقع پر میں یہ جتنا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مختلف قسم کی قوت محنت پیدا کرنے کی لاگت میں چوں کہ فرق ہوتا ہے اس لئے کاروبار کی مختلف شاخوں میں لگی ہوئی قوت محنت کی ویلیو میں بھی فرق ہونا لازم ہے۔ لہذا یہ چیخ پکار کہ اجرتوں میں مساوات ہو، ایک غلط فہمی پر مبنی ہے اور ایسی جنونی تمنا ہے جو کبھی پوری نہیں ہونے والی۔ یہ شوشہ چھوڑا ہوا ہے اس فرضی اور سطحی گرم سیاست کا جو مبادیات تو اپنا لیتی ہے لیکن نتیجوں سے جان چراتی ہے۔ مزدوری کے نظام میں قوت محنت کی ویلیو اسی طرح طے پاتی ہے جیسے دوسرے کسی بھی مال کی۔ اور چوں کہ محنت کرنے کی مختلف طاقتوں کی قدریں بھی مختلف ہوتی ہیں، یا یہ کہ انہیں وجود میں لانے کے لئے محنت کی مختلف مقادیر درکار ہوتی ہیں اس لئے محنت کے بازار میں ان کے دام بھی الگ الگ ہونے لازمی ہیں۔ اجرتوں کے اس نظام کے ہوتے یہ تمنا کرنا کہ محنت کا صلہ سب کو برابر یا کچھ نہیں تو منصفانہ ملنے لگے، یہ ایسی ہی بات ہے جیسے غلامی کے نظام کے ہوتے آزادی کے خواب دیکھنا۔ جس بات کو آپ انصاف کا تقاضا یا منصفانہ سمجھ رہے ہیں اس کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ سوال صرف اتنا ہے کہ ایک مقررہ نظام پیداوار میں کیا ہونا لازمی ہے جس سے مفر نہیں۔

اب تک جو کہا گیا اس سے یہ واضح ہو گیا کہ قوت محنت کی ویلیو طے پاتی ہے ان ضروریات کی ویلیو سے جو محنت کی اس قوت کو پیدا کرنے، بڑھانے، باقی رکھنے اور آئندہ جاری رکھنے میں درکار ہوتی ہیں۔



## ۸ - قدرزائد کی پیداوار

اب ہم فرض کرتے ہیں کہ محنت کرنے والے کی روزمرہ ضروریات کی اوسط مقدار تیار کرنے کے لئے چھ گھنٹے روز کی اوسط محنت درکار ہے۔ یہ بھی فرض کیجئے کہ چھ گھنٹے کی اوسط محنت سونے کی ایک مقدار میں سمائی ہوئی ہے اور یہ مقدار ہے ۳ شلنگ کے برابر۔ تو پھر تین شلنگ قیمت ٹھیری یا اس آدمی کی قوت محنت کے ایک دن کی ویلیو اتنی نقدی میں ظاہر ہوئی۔ اگر وہ چھ گھنٹے روز کام کرے تو روزانہ اتنی ویلیو پیدا کرے گا جتنی روزمرہ ضروریات کی اوسط مقدار خریدنے کے لئے کافی ہے یا محنت کرنے والے کی حیثیت میں اسے باقی رکھنے کو پوری پڑتی ہے۔

لیکن یہ آدمی اجرت پر کام کرتا ہے۔ اس لئے اپنی قوت محنت سرمایہ دار کے ہاتھ بیچنی ہی ہے۔ اگر وہ تین شلنگ روز پر بیچے یا ۱۸ شلنگ فی ہفتہ پر، تو وہ اپنی قوت اس کی ویلیو کے حساب سے بیچ رہا ہے۔ فرض کیجئے، کتائی کا کام کرتا ہے۔ اگر وہ چھ گھنٹے روز کام کرے تو کپاس کی ویلیو میں تین شلنگ روز کی ویلیو بڑھاتا ہے۔ یہ جو ویلیو اس نے بڑھائی ہے، یہ ٹھیک اتنی ہی ہے جتنی اسے اجرت ملتی ہے یا روزانہ اپنی محنت کی قیمت کے طور پر وصول ہوتی ہے۔ اس حالت میں سرمایہ دار کو نہ تو کوئی زائد قدر ہاتھ آئی، نہ زائد پیداوار۔ یہاں ہم الجھن میں پھنستے ہیں۔

جب سرمایہ دار مزدور سے محنت کی طاقت خریدتا ہے اور اس کی قدر ادا کر دیتا ہے تو دوسرے خریداروں کی طرح اسے بھی یہ حق پہنچا کہ اپنے خریدے ہوئے مال کو خرچ یا استعمال کرے۔ آپ ایک آدمی کی قوت محنت خرچ یا استعمال کرتے ہیں اسے کام میں لگا کر، ٹھیک اسی طرح جیسے کسی مشین کو چلا کر اسے صرف یا استعمال کرتے ہیں۔ کام کرنے والے کی قوت محنت کی ویلیو روز کے

روز یا ہفتہ وار ادا کر کے سرمایہ دار نے یہ حق حاصل کیا ہے کہ پورے دن یا ہفتہ بھر کے لئے اس قوت محنت کا استعمال کرے یا اسے کام سے لگائے رکھے۔ اس میں شک نہیں کہ کام کا ایک دن یا ایک ہفتہ بھی کچھ حدود کا پابند ہے لیکن ان حدود پر ہم بعد میں زیادہ نزدیک غور کریں گے۔

فی الحال ایک فیصلہ کن نکتے کی طرف آپ کی توجہ چاہتا ہوں۔ قوت محنت کی ویلیو تو پابند ہے محنت کی اس مقدار کی جو اسے باقی رکھنے یا پھر سے پیدا کرنے کے لئے لازم ہوتی ہے، لیکن اس قوت محنت کا استعمال وہاں تک ہوتا ہے جہاں تک مزدور میں کام کرنے کی طاقت اور جسمانی قوت موجود ہے۔ قوت محنت کی روزانہ کی یا ہفتہ واری ویلیو اور چیز ہے اور اس قوت کا عمل میں آنا کچھ اور، اسی طرح جیسے گھوڑا جو خوراک طلب کرتا ہے، وہ اور جتنی دیر وہ شہسوار کو سواری دیتا ہے، دونوں بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ محنت کی وہ مقدار جس پر کام کرنے والے کی قوت محنت کی ویلیو نے حد کھینچی ہوئی ہے ہرگز محنت کی اس مقدار کو محدود نہیں کرتی جو اس کی قوت محنت انجام دینے قابل ہوتی ہے۔ کتائی کرنے والے کی ہی مثال لے لیجئے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ روزانہ اپنی قوت محنت کو پھر سے پیدا کرنے کے لئے اسے ہر روز تین شلنگ کی ویلیو پیدا کر کے دینی ہے جو چھ گھنٹے کے کام سے وہ پوری کر دیتا ہے۔ مگر اس کے سبب یہ نہیں ہوتا کہ اب دس، بارہ یا بارہ سے زیادہ گھنٹے کام کرنے کے قابل نہیں رہا۔ لیکن کتائی کرنے والے کی قوت محنت کو روزانہ یا ہفتہ واری ویلیو ادا کر کے سرمایہ دار نے یہ حق پایا ہے کہ محنت کی اس قوت کو سارے دن یا سارے ہفتے

استعمال کرے۔ لہذا اب مثال کے طور پر بارہ گھنٹے بھی اس سے کام لے گا۔ ان چھ گھنٹوں کے علاوہ جو اس کی اجرت کی یا قوت محنت کی ویلیو ادا کرنے کے لئے لازم ہیں اسے اوپر سے چھ گھنٹے اور کام کرنے پڑے گا جنہیں میں زائد محنت کے گھنٹے کہتا ہوں یعنی وہ فالتو محنت جو خود کو قدر زائد (Surplus value) اور زائد پیداوار



میں بدل دیتی ہے۔ اگر وہ کٹائی کرنے والا شخص اپنی روز کی چھ گھنٹہ محنت سے کپاس میں تین شلنگ کی ویلیو بڑھاتا ہے، یعنی جتنی اجرت پائی ہے اس کے بالکل مساوی، تو وہ بارہ گھنٹے کام کر کے چھ شلنگ کی مالیت اس کپاس کو دے دیتا ہے اور اسی نسبت سے زائد دھاگا تیار کرتا ہے۔ مگر جب وہ اپنی قوت محنت سرمایہ دار کے

ہاتھ بیچ چکا تو اس نے جتنی بھی ویلیو یا سامان تیار کیا وہ بھی سرمایہ دار کی ملکیت ٹھہرا کیوں کہ وہی وقتی طور پر اس کی قوت محنت کا مالک ہے۔ ظاہر ہے کہ سرمایہ دار تین شلنگ مزدور کو دے کر چھ شلنگ کی ویلیو وصول کرے گا کیوں کہ اتنی ویلیو کے بدلے جس میں محنت کے چھ گھنٹے موجود ہیں، وہ ایسی ویلیو وصول کرتا ہے جس میں محنت کے بارہ گھنٹے جمع ہیں۔ روزانہ اسی عمل کو دوہرا کر سرمایہ دار ہر روز تین شلنگ دیتا اور چھ شلنگ اپنی جیب میں ڈالتا رہے گا جس کا آدھا حصہ پھر اجرت کی شکل میں دیا جائے گا اور باقی آدھا فالتو ویلیو (قدر زائد) بنتا جائے گا جس کے عوض سرمایہ دار کو کچھ ادا نہیں کرنا۔ سرمائے اور محنت کے درمیان تبادلے کا یہ ہے وہ انداز جس پر سرمایہ داری پیداوار یا اجرت کا نظام کھڑا ہوا ہے اور جس کا مستقل نتیجہ یہی ہوگا کہ محنت کرنے والے کو پھر مزدور اور سرمایہ دار کو پھر سرمایہ دار بنانا چلا جائے۔

باقی سب حالات یکساں ہوں تو قدر زائد کی شرح منحصر ہوتی ہے اس پر کہ قوت محنت کی ویلیو پھر سے پیدا کرنے کے لئے کام کے جتنے گھنٹے دینے ضروری ہیں ان میں اور جو زائد وقت یا زائد محنت سرمایہ دار کے لئے دئے گئے ان میں کیا تناسب ہے۔ لہذا جس حد تک مزدور اپنی قوت محنت کی ویلیو یا اجرت کا حساب پورا کرنے کے لئے کام کرتا ہے، ان گھنٹوں سے زائد یا فالتو کام کے جتنے گھنٹے ہوں گے، ان دونوں وقتوں کے تناسب پر قدر زائد کی شرح منحصر رہے گی۔

## ۹۔ محنت کی ویلیو

اب ہمیں اسی بیان کی طرف واپس آنا ہوگا کہ ”محنت کی ویلیو یا اس کی قیمت“۔

ہم نے دیکھ لیا کہ حقیقت میں وہ صرف قوت محنت کی ویلیو ہے جو اس سامان کی قدروں میں ناپ کر دی جاتی ہے جس سامان کا ہونا لازمی ہے قوت محنت باقی رکھنے کے لئے۔ لیکن چوں کہ محنت کرنے والے کو کام پورا کر چکنے کے بعد اجرت ملتی ہے اور پھر وہ خود سمجھتا ہے کہ اس نے سرمایہ دار کو جو کچھ دیا وہ اس کی محنت تھی تو اپنی قوت محنت کی ویلیو یا قیمت اسے لازمی طور سے خود اپنی محنت کی ہی قیمت یا ویلیو نظر آتی ہے۔ اگر اس کی قوت محنت کی قیمت تین شلنگ ہو جس میں چھ گھنٹے کی محنت وصول ہو جاتی ہے اور پھر وہ بارہ گھنٹے کام کرے تو ناچار یہی سوچتا ہے کہ یہ تین شلنگ بارہ گھنٹے کی محنت کی ویلیو یا قیمت ہیں، اگرچہ محنت کے یہ بارہ گھنٹے خود چھ شلنگ کی ویلیو میں لگے ہوتے ہیں۔ اس عمل کی دوہری تاثیر ہوتی ہے:

اول یہ کہ قوت محنت کی ویلیو یا قیمت ایسی نظر آتی ہے گویا خود محنت کی ہی ویلیو یا قیمت ہے۔ حالانکہ اگر سچ پوچھئے تو محنت کی ویلیو یا قیمت کے کچھ معنی نہیں ہوتے۔

دوسرے یہ کہ اگرچہ کام کرنے والے کی روزانہ محنت کا صرف ایک حصہ ہے جس کی اجرت ادا کی گئی، دوسرا حصہ ادائیگی کے بغیر رہا۔ یہی حصہ یا زائد (فالتو) محنت اصل میں وہ ذخیرہ ہے جس میں سے قدر زائد یا منافع نکلتا ہے، لیکن بظاہر یوں نظر آتا ہے گویا مجموعی طور پر محنت کا معاوضہ دیا گیا۔

یہ ظاہر کا دھوکا اجرت پر کی ہوئی مزدوری کو محنت کی دوسری تاریخی شکلوں سے جدا کر دیتا ہے۔ اجرت کا نظام کچھ اس طرح کا بنا ہوا ہے کہ بے معاوضہ محنت بھی اجرت دی ہوئی محنت نظر آتی ہے۔ غلام کا معاملہ اس کے برعکس تھا، اس کی محنت کے جس حصے



کا معاوضہ دیا جاتا تھا وہ بھی دیکھنے میں مفت کی بیگار تھی۔ لازمی بات ہے کہ کام کرنے کی خاطر غلام کو زندہ رہنا چاہئے لہذا محنت کے دن کا ایک حصہ اس ویلیو کو پورا کرنے میں لگ جاتا ہے جو اس کا وجود باقی رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ لیکن چونکہ غلام اور آقا کے درمیان کوئی سودا نہیں ہوتا اور فریقین میں خرید و فروخت کا معاملہ نہیں بنتا تو اس کی ساری محنت یوں نظر آتی ہے گویا مفت گئی۔

اب دوسری طرف زمین سے بندھے ہوئے (نیم غلام) کسان کو لے لیجئے جو ابھی کل تک سارے مشرقی یورپ میں موجود تھا۔ یہ کسان، مثلاً تین دن تو خود اپنے کھیت پر، یا جو کھیت اسے سونپا گیا ہے، وہاں اپنے لئے کام کرتا تھا اور باقی کے تین دن آقا یا مالک کی جاگیر پر جبری محنت یا بیگار بھرتا تھا۔ یہاں پھر محنت کا وہ حصہ جس کا معاوضہ ملا، اور وہ جس کا نہیں ملا، سلیقے کے ساتھ الگ الگ تھے، وقت اور مقام میں بھی جدا جدا تھے۔ ہمارے آزاد خیالوں کو اس پر بے حد غصہ آیا کرتا تھا کہ آدمی سے اور بے معاوضہ محنت لی جائے۔ اس کو وہ اخلاقی گراؤ سمجھتے تھے۔

سچ یہ ہے کہ چاہے ایک آدمی ہفتے کے تین دن خود اپنے کھیت پر اپنے لئے اور باقی کے تین دن مالک کی جاگیر پر بے معاوضہ محنت کرتا ہے، چاہے وہ کسی کارخانے یا ورکشاپ میں چھ گھنٹے روز اپنے لئے اور چھ گھنٹے مالک کے لئے کام کرتا ہے بات ایک ہی ہوئی۔ اگرچہ فیکٹری یا ورکشاپ کے معاملے میں معاوضہ والی اور بے معاوضہ محنت، دونوں ایک دوسری میں ایسی گتھی ہوئی ہیں کہ الگ نہیں کیا جاسکتا، اور اس پورے لین دین کی فطرت پر یہ پردہ پڑا ہوا ہے کہ درمیان میں ایک معاہدے کا دخل ہے اور ادا کی ہوتی ہے ہفتہ پورا ہونے کے بعد۔ بے معاوضہ محنت ایک معاملے میں اپنی مرضی سے پیش کی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور دوسرے معاملے میں زبردستی کی۔ لے دے کر بس اتنا سا فرق ہے ان دونوں میں۔

اب جو میں ”محنت کی ویلیو“ کا لفظ استعمال کروں گا تو محض غلط العام معنوں میں، جس کا مطلب ہے ”قوت محنت کی ویلیو“۔

## ۱۰۔ کسی مال کو اس کی ویلیو پر فروخت کر کے منافع کمایا جاتا ہے

فرض کیجئے۔ محنت کا ایک اوسط گھنٹہ جو ویلیو میں لگا ہوتا ہے، وہ چھہ پینس کے برابر ہے، یا بارہ اوسط گھنٹے چھہ شلنگ کی ویلیو کے برابر ٹھہرتے ہیں۔ آگے فرض کیجئے کہ محنت کی ویلیو تین شلنگ یا اتنے سامان کے برابر ہوئی جتنا چھہ گھنٹے کی محنت نے پیدا کیا ہے۔ اب اگر کچے مال، مشین اوزار وغیرہ میں، جو کسی مال کی تیاری میں استعمال ہوا ہے، چوبیس گھنٹے کی اوسط محنت لگی ہوئی ہے تو اس کی ویلیو بارہ شلنگ تک پہنچے گی۔ اور پھر سرمایہ دار نے جس آدمی کو محنت پر لگایا ہے اس نے پیداوار کے ذریعوں پر اپنی بارہ گھنٹے کی محنت بڑھائی ہو تو ان بارہ گھنٹوں نے چھہ شلنگ کی مزید ویلیو پیدا کی۔ اب اس مال کی پوری ویلیو مل کر وصول شدہ محنت کے چھتیس گھنٹے اور اٹھارہ شلنگ کے برابر ہو گئی۔ مگر چونکہ محنت کی ویلیو یا وہ اجرت جو کام کرنے والے کو دی گئی، صرف تین شلنگ ہوگی تو سرمایہ دار کی طرف سے ان چھہ گھنٹے کی فالتو محنت کے بدلے کچھ نہیں دیا گیا جو مزدور نے کی اور مال کی ویلیو کی صورت میں وصول ہو چکی۔ اس مال کی جو اٹھارہ شلنگ ویلیو بنی ہے، اسی ویلیو پر بیچ کر سرمایہ دار کے ہاتھ تین شلنگ کی ایک ایسی ویلیو آئے گی جس کے بدلے اس نے کچھ نہیں دیا۔ یہی تین شلنگ وہ قدرزائد یا منافع بنا ہے جو اس نے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ سرمایہ دار کو یہ تین شلنگ کا منافع برابر وصول ہوتا رہے گا، ایسا منافع جو وہ اپنا مال اصلی ویلیو سے زیادہ یا اونچی قیمت پر نہیں بلکہ اس کی اصلی ویلیو پر بیچ کر حاصل کرتا ہے۔

کسی مال کی ویلیو محنت کی اس پوری مقدار سے طے پاتی ہے جو اس کے اندر موجود ہے۔ اس محنت کا ایک حصہ وہ ہے جو اس ویلیو



کی صورت میں موجود ہے جس کا مساوی اجرت کی شکل میں ادا کیا جا چکا، لیکن ایک حصہ ایسی ویلیو میں رہا جس کا مساوی کچھ ادا نہیں کیا گیا۔ مال کے اندر جو محنت سمائی ہوئی ہے، اس کا ایک حصہ معاوضہ والی محنت ہے اور دوسرا حصہ بے معاوضہ کی محنت۔ اس لئے جب سرمایہ دار کسی مال کو اس کی اپنی ویلیو پر فروخت کرتا ہے، یعنی محنت کی اس پوری مقدار کو حساب میں لیتا ہے جو اس مال کے اندر ٹھوس شکل رکھتی ہے تو اسے منافع ہونا بہر حال لازم ہے۔ صرف وہی چیز نہیں بیچ رہا ہے جس کے مساوی لاگت آچکی، بلکہ وہ شے بھی فروخت کی جا رہی ہے جس کا اسے خود کچھ نہیں دینا پڑا، البتہ مزدور کی محنت اس میں لگی ہے۔ سرمایہ دار کو جو لاگت کسی مال کی پڑی ہے، وہ ایک چیز ہے اور اس مال کی اصلی ویلیو دوسری چیز۔ چنانچہ اب میں پھر دوہراتا ہوں کہ اوسط یا معمولی منافع کمایا جاتا ہے کسی مال کو اس کی ویلیو سے زیادہ پر بیچ کر نہیں بلکہ اصلی ویلیو پر بیچ کر۔

## ۱۱ - وہ مختلف حصے جن میں قدرزائد بکھر جاتی ہے

قدرزائد یا کسی مال کی پوری ویلیو کا وہ حصہ جس میں مزدور کی فالتو محنت یا بے معاوضہ محنت لگی ہوئی ہے، میں اسے منافع کہتا ہوں۔ یہ پورے کا پورا منافع کام لینے والے سرمایہ دار کی جیب میں نہیں جاتا۔ زمین کا اجارہ زمیندار کو یہ موقع دیتا ہے کہ اس قدرزائد کا ایک حصہ وہ لگان یا کرائے کے نام سے لے جائے، چاہے زمین کاشت کے لئے استعمال ہو، عمارت کے لئے، ریلوے یا کسی اور پیداواری مقصد کے لئے کام آئے۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ جب محنت کے اوزاروں کی ملکیت نے کام لینے والے سرمایہ دار کو اس قابل

بنایا کہ وہ قدر زائد پیدا کر سکے یا یوں کہے کہ بے معاوضہ محنت کی ایک خاص مقدار ہتھیا سکے، تو وہ جس کے پاس محنت کے ذریعوں کی ملکیت تھی اور جو اپنی یہ ملکیت پوری کی پوری یا تھوڑی بہت کام لینے والے سرمایہ دار کو ادھار دیتا تھا، اسے بھی یہ موقع دیا، یعنی ساھوکار سرمایہ دار کو اس قابل کیا کہ وہ سود کے نام سے اسی قدرزائد کے ایک حصے پر خود اپنا حق جما لے۔ چنانچہ ان دونوں کو دینے کے بعد کام لینے والے سرمایہ دار کے پاس جتنا کچھ بچتا ہے وہ صرف اسی قدر ہے جسے صنعتی یا تجارتی منافع کہتے ہیں۔

اب رہا سوال کہ وہ کونسے اصول ہیں جن سے قدر زائد کی ساری مقدار ان تین قسم کے آدمیوں کے درمیان قاعدے سے تقسیم ہوتی ہے، یہ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ البتہ اب تک جو کہا گیا اس سے یہ نتیجے نکلتے ہیں۔

لگان یا کرایہ، سود اور صنعتی منافع یہ الگ الگ نام ہیں کسی مال کی قدر زائد کے مختلف حصوں کے، یا اس محنت کے جو مال کے اندر موجود ہے لیکن جس کا معاوضہ نہیں دیا گیا۔ یہ تینوں اسی ذریعے سے اور صرف اسی ایک ذریعے سے نکالے جاتے ہیں۔ نہ تو خود زمین سے ان کی اگھائی ہوتی ہے اور نہ سرمائے سے، البتہ زمین اور سرمایہ اپنے اپنے مالکوں کو یہ موقع دیتے ہیں کہ وہ اس قدر زائد میں سے اپنا اپنا حصہ وصول کر لیں جو کام لینے والے سرمایہ دار نے مزدور سے نکالی ہے۔ خود مزدور کی نظر میں یہ بات بعد کی ہے کہ وہ قدر زائد جو اس کی زائد یا فالتو محنت یا مفت کی محنت کا حاصل تھی، پوری کی پوری کام لینے والے سرمایہ دار نے جیب میں ڈالی یا اس کے حصے بخرے کرائے اور سود کے نام سے دوسرے فریقوں کو بھی دئے۔ فرض کیجئے جس سرمایہ دار نے کام لیا ہے، سرمایہ بھی اس نے اپنا ہی لگایا اور زمین کا مالک بھی وہ خود تھا تو اس صورت میں پوری قدر زائد اسی کی جیب میں جائے گی۔

کام لینے والا سرمایہ دار ہی ہے جو مزدور سے سیدھے سیدھے قدر زائد نکال لیتا ہے، چاہے بعد میں اس کا کتنا ہی حصہ اپنے پاس رکھ



سکے۔ یہی وہ تعلق ہے، کام لینے والے سرمایہ دار اور مزدوری کرنے والے کا، جس پر سارا اجرتی نظام تو کیا، آج کا پورا نظام پیداوار ڈکا ہوا ہے۔ کچھ حضرات جو یہاں ہماری بحث میں شریک ہوئے ہیں یہ غلطی کر گئے کہ معاملے کی لپٹا پوتی کر کے وہ یہ جتانے کی کوشش میں تھے کہ کام لینے والے سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان یہ تعلق ثانوی حیثیت رکھتا ہے، اگرچہ وہ یہ کہنے میں حق بجانب تھے کہ موجودہ حالات میں قیمتوں کا چڑھنا کام لینے والے سرمایہ دار پر، زمین کے مالک پر، رویہ دینے والے سرمایہ دار پر اور اتنا اور بڑھا لیجئے کہ ٹیکس اگھانے والے پر یکساں نہیں بلکہ مختلف درجوں میں اثر انداز ہوگا۔ یہیں سے ایک اور نتیجہ بھی نکلتا ہے۔

مال کی ویلیو کا وہ حصہ جس میں استعمال شدہ کچے مال، مشینری کی ویلیو، یا مختصر یہ کہ ذرائع پیداوار کی ویلیو شامل ہے وہ آمدنی ہرگز شمار نہیں ہوتا بلکہ صرف لگے ہوئے سرمائے کے حساب میں رکھا جاتا ہے۔ لیکن اس سوال سے قطع نظر یہ کہنا صحیح نہیں کہ مال کی ویلیو کا وہ دوسرا حصہ جو آمدنی شمار ہوتا ہے، یا اجرتوں، منافع، کرائے اور سود کی مدوں میں خرچ کیا جاتا ہے، وہ اجرتوں، کرائے اور منافع وغیرہ کی سب قدروں سے مل کر بنتا ہے۔ اول تو ہم اس بحث سے اجرتوں کا سوال ہی خارج کر دیتے ہیں اور صرف صنعتی منافع، سود اور کرائے پر نظر رکھیں گے۔ ابھی ہم دیکھ چکے ہیں کہ کسی مال میں جو قدر زائد ہوتی ہے، یا اس کی ویلیو کا وہ حصہ جس میں بے معاوضہ محنت لگی ہوتی ہے، تین ٹکڑوں میں متفرق ہو جاتا ہے اور تینوں کے الگ الگ نام ہیں۔ لیکن یہ کہنا حقیقت کے بالکل برعکس ہوگا کہ مال کے اس حصے کی ویلیو ان تینوں اجزا کی الگ الگ قدروں کو اس میں جوڑ دینے سے بنتی ہے یا مرکب ہوتی ہے۔

اگر محنت کا ایک گھنٹہ خود کو چھ پینس کی ویلیو میں سماتا ہے، اگر مزدور کا دن بارہ گھنٹے پر پھیلا ہوا ہے، اور اگر اس بارہ گھنٹے کا آدھا وقت بے معاوضہ محنت میں جاتا ہے تو یہ زائد یا فالتو محنت کسی مال میں تین شلنگ کی قدر زائد کا اضافہ کرتی ہے یعنی

ایسی ویلیو بڑھاتی ہے جس کے عوض کچھ نہیں دیا گیا۔ تین شلنگ کی یہ قدر زائد ہی وہ پورا فنڈ ہے جس کا بٹوارہ زمیندار اور ساھوکار کے ساتھ، جس تناسب سے بھی ہو، کام لینے والا سرمایہ دار کر لے گا۔ ان تین شلنگ میں ویلیو کی وہ حد موجود ہے جس کے اندر تینوں کو حصہ بٹانا ہے۔ کام لینے والا سرمایہ دار کسی مال کی ویلیو میں اپنی طرف سے کوئی ایسی یکطرفہ ویلیو نہیں بڑھاتا جو اپنا منافع نکالنے کے لئے ہو اور اس میں زمیندار وغیرہ کے لئے الگ سے ویلیو بڑھائی جائے، تاکہ اس طرح اوپر سے یکطرفہ بڑھائی ہوئی مقررہ قدریں مل کر ایک مجموعی ویلیو بن جائیں۔ اب آپ نے دیکھا کہ یہ عام خیال کتنا بے بنیاد ہے جسے نظر نہیں آتا کہ ایک مقررہ ویلیو کا تین حصوں میں بکھر جانا اور الگ الگ تین قدروں کا ایک ویلیو میں آکر ملنا کیا فرق رکھتا ہے، یہ سمجھنا غلط ہے کہ ایسی حاصل جمع ویلیو جس میں سے کرایہ بھی ادا کیا جاتا ہے، نفع اور سود بھی نکالا جاتا ہے، جتنی چاہے بڑھائی جا سکتی ہے۔

منافع کی پوری رقم جو سرمایہ دار کو وصول ہوئی اگر سو پونڈ کے برابر ہو تو ہم اس رقم کو اس کی پوری گنجائش نظر میں رکھتے ہوئے، منافع کی رقم کہیں گے۔ لیکن اگر ان سو پونڈ اور اس سرمائے کا تناسب دیکھیں جو پیشگی دیا جا چکا ہے تو ہم اس کو نسبتی یا تقابلی گنجائش سے شرح منافع کا نام دیں گے۔ صاف بات ہے کہ یہ شرح منافع دوسرے طریقے سے خود کو ظاہر کرتی ہے۔

فرض کیجئے سو پونڈ وہ سرمایہ ہے جو اجرت میں پیشگی دیا گیا۔ اگر قدر زائد بھی سو پونڈ کی پیدا کی گئی، تو اس کا مطلب ہے کہ محنت کرنے والے کا آدھا وقت بے معاوضہ محنت میں لگ گیا۔ اب ہم اس منافع کو سرمائے کی اس ویلیو سے ناپیں جو اجرت میں دی گئی، تو ہم کہیں گے کہ شرح منافع سو فیصدی تھی کیوں کہ جتنی ویلیو پیشگی میں گئی وہ سو تھی اور جو ویلیو وصول ہوئی وہ دو سو تھی۔ لیکن دوسری طرف دیکھئے، اگر وہ سرمایہ جو اجرت میں دیا گیا ہم صرف اسی کو شمار نہیں کرتے بلکہ اس تمام سرمائے کو حساب



میں رکھتے ہیں جو پیشگی لگایا گیا، مثال کے طور پر وہ پانچ سو ہوا اور اس میں چار سو وہ ہیں جن میں کچے مال، مشین وغیرہ کی ویلیو شامل ہے تو اب ہم کہیں گے کہ شرح منافع محض بیس فیصدی ہے، کیوں کہ جو سو پونڈ کا منافع ہے وہ پورے لگائے ہوئے سرمائے کا صرف پانچواں حصہ ہے۔

شرح منافع ظاہر کرنے کا صرف پہلا ہی انداز ایسا ہے جس سے آپ پر صحیح نسبت ظاہر ہوتی ہے کہ کتنی محنت کا معاوضہ دیا گیا اور کتنی محنت کا نہیں، یعنی \* exploitation کا (فرانسیسی لفظ کے استعمال کی اجازت دیجئے) صحیح اندازہ بتا دیتا ہے۔ لیکن شرح منافع ظاہر کرنے کا دوسرا انداز عام استعمال میں ہے اور واقعی اس سے بعض مقصد خوب پورے ہوتے ہیں۔ کچھ بھی سہی، یہ انداز بہت مفید ہے یہ چھپانے کے لئے کہ سرمایہ دار محنت کرنے والے سے کتنے درجے مفت کی محنت لے لیتا ہے۔

اب آگے جو خیالات مجھ کو ظاہر کرنے ہیں وہاں لفظ منافع سے میری مراد ہوگی قدر زائد کی وہ پوری مقدار جو سرمایہ دار نکال لیتا ہے، دوسرے فریقوں کے ساتھ وہ جو بھی حصہ بٹائے، مجھے اس سے مطلب نہیں۔ اور لفظ شرح منافع سے میں ہر جگہ منافعوں کو اس سرمائے کی ویلیو سے ناپوں گا جو اجرت میں دیا جاتا ہے۔

## ۱۲۔ منافع، اجرت اور قیمتوں کا باہمی رشتہ

کسی مال کی ویلیو میں سے اتنی ویلیو گھٹائیے جو کچے مال اور دوسرے ذرائع پیداوار کی شکل میں استعمال ہو چکی ہے، یعنی اتنی ویلیو گھٹائیے جو پیچھلی لیبر کی طرف سے اس مال میں شامل ہے۔ اب جو ویلیو بچی وہ محنت کی اس مقدار کا حاصل ہے جسے آخری

\* محنت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا۔ (ایڈیٹر)

محنت کرنے والے نے بڑھایا ہے۔ اگر اس آدمی نے بارہ گھنٹے روز کام کیا اور بارہ گھنٹے کی اوسط محنت خود کو سونے کی اتنی مقدار میں ڈھال لیتی ہے جو چھہ شلنگ کے برابر ہے تو یہ صرف چھہ شلنگ کی ویلیو ہی وہ ہے جسے اس کی محنت نے پیدا کیا ہے۔ یہی ویلیو جو اس کے وقت محنت سے طے پائی ہے ایسا فنڈ ہے جس کے اندر سے محنت کرنے والا اور سرمایہ دار دونوں ہی اپنا اپنا حصہ یا فائدہ نکالتے ہیں؛ یہی ایک ویلیو ہے جو اجرت اور منافع میں تقسیم کی جاتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ویلیو چاہے کسی تناسب کے فرق سے دونوں فریقوں میں بانٹی جائے، اس ویلیو کی مجموعی گنجائش میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور پورے معاملے میں بھی اس بات سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں کہ ایک محنت کرنے والے کی جگہ آپ پوری مزدور آبادی کو رکھ دیں یا مثلاً محنت کے ایک دن کے بجائے آپ ایک کروڑ بیس لاکھ دن شمار کر لیں۔

اب چون کہ سرمایہ دار اور مزدور کو اسی ایک محدود ویلیو میں ساجھا کرنا ہے، یعنی وہی ویلیو بانٹنی ہے جس کا ناپ ہوتا ہے مزدور کی پوری محنت سے، اس لئے دونوں میں سے ایک کو جتنا زیادہ ملے گا دوسرے کو اتنا ہی کم ہاتھ آئے گا یا اس کے برعکس۔ اگر ایک مقررہ مقدار ہو تو اس کا ایک حصہ جتنا بڑھے گا دوسرا حصہ اسی نسبت سے ضرور گھٹے گا۔ اگر اجرتوں میں تبدیلی ہو تو منافع میں الٹی طرف تبدیلی ہوگی۔ اجرت کم ہوگی تو منافع بڑھے گا، اور اجرت بڑھے گی تو منافع گھٹے گا۔ جیسا کہ ہم نے فرض کیا تھا اگر مزدور کو تین شلنگ ملتے ہیں تو جو ویلیو اس نے پیدا کی یہ اس کے آدھے کے برابر ہے، یا اس کی محنت کا پورا دن آدھی معاوضہ والی اور آدھی بے معاوضہ محنت میں جاتا ہے تو شرح منافع سو فیصدی ہوئی کیوں کہ سرمایہ دار کو بھی تین ہی شلنگ ملنے والے ہیں۔ اگر مزدور کو صرف دو شلنگ ملے، یعنی دن بھر کی صرف تھائی محنت اپنی ذات کے لئے استعمال کی تو سرمایہ دار کو چار شلنگ ملیں گے اور شرح منافع ہوگی دو سو فیصدی۔ اگر مزدور کو چار شلنگ ملے تو سرمایہ دار کے ہاتھ صرف دو شلنگ آئیں گے اور شرح منافع پچاس فیصدی



رہ جائے گی۔ یہ اونچ نیچ جتنی بھی ہوتی رہے اس سے مال کی ویلیو پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اس لئے اجرتوں میں عام اضافے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عام شرح منافع گر جائے لیکن اس کا قدروں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اگرچہ مالوں کی یہ قدریں جو آخر میں جا کر ان کے بازار دام گھٹاتی بڑھاتی ہیں، قطعی طور پر طے پاتی ہیں محنت کی اس پوری مقدار سے ہی جو ان مالوں کے اندر لگی ہوئی ہو، اور اس سے کچھ تعلق نہیں رکھتیں کہ کتنی محنت کا معاوضہ ادا ہوا، کتنی بے معاوضہ رہی، لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ کسی ایک مال یا کئی مالوں کی ویلیو جو مثلاً بارہ گھنٹے میں تیار ہوئی ہے وہ ایک ہی حال پر قائم رہتی ہے۔ محنت کے ایک مقررہ وقت یا ایک مقررہ مقدار میں مالوں کی جتنی تعداد یا کھپ بن کر تیار ہوتی ہے اس کا انحصار ہے لگی ہوئی محنت کی قوت پیداوار پر۔ اس پر نہیں کہ کتنا وقت محنت لگا۔ مثال کے طور پر کتائی کے کام میں ایک تو اس درجے کی قوت پیداوار والی محنت ہو سکتی ہے کہ بارہ گھنٹے کے کام سے بارہ پونڈ دھاگا تیار کر دے اور کچھ کم درجے کی قوت پیداوار والی محنت اتنی دیر میں صرف دو پونڈ تیار کر سکتے۔ اب اگر بارہ گھنٹے کی اوسط محنت چھہ شلنگ کی ویلیو میں وصول ہوتی ہے تو ایک موقع پر بارہ پونڈ دھاگے کی قیمت چھہ شلنگ ہوگی اور دوسرے موقع پر دو پونڈ دھاگے کی لاگت بھی چھہ شلنگ آئے گی۔ اس لئے ایک جگہ تو ایک پونڈ دھاگا چھہ پینس کا پڑا اور دوسری جگہ تین شلنگ کا۔ قیمت کا یہ فرق نتیجہ ہے اس بات کا کہ جو محنت لگی تھی اس کی قوت پیداوار میں فرق تھا۔ محنت کا ایک گھنٹہ، اگر قوت پیداوار زیادہ ہو تو ایک پونڈ دھاگا دے گا اور اگر قوت پیداوار کم ہو تو محنت کے چھہ گھنٹے سے ایک پونڈ دھاگا وصول ہوگا۔ چنانچہ ایک موقع پر تو ایک پونڈ دھاگے کی قیمت صرف چھہ پینس ہوگی چاہے اجرت نسبتاً زیادہ ہو اور شرح منافع کم۔ اور دوسرے موقع پر اتنے ہی دھاگے کی قیمت تین شلنگ ہوگی، چاہے اجرت کم ہو اور شرح منافع زیادہ۔ وجہ اس کی یہ کہ ایک پونڈ دھاگے کی

قیمت محنت کی اس پوری مقدار سے ہی گھٹتی بڑھتی ہے جو اس کی تیاری میں لگ چکی ہے، محنت کی وہ پوری مقدار معاوضہ والی اور بے معاوضہ محنت میں چاہے کسی نسبت سے تقسیم ہوتی رہے۔ وہ حقیقت جو میں اوپر بیان کر آیا ہوں کہ زیادہ داموں والی محنت کم قیمت مال تیار کر سکتی ہے اور کم دام والی محنت مہنگا مال، اب اس بیان میں کوئی قول محال نظر نہیں آئے گا۔ اس میں محض ایک عام اصول پیش کیا گیا تھا کہ کسی مال کی ویلیو محنت کی اس مقدار کے مطابق رہتی ہے جو اس مال میں لگی ہو، اور محنت کی مقدار لے دے کر منحصر ہے لگی ہوئی محنت کی قوت پیداوار پر چنانچہ محنت کی پیداواری قوت کے ہر ایک فرق کے ساتھ اس میں بھی فرق پڑے گا۔

### ۱۳۔ وہ خاص موقع جب اجرت کو بڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے یا اسے گرنے سے روکنے کی

اب ہمیں سنجیدگی سے ان موقعوں پر غور کرنا چاہئے جہاں یا تو اجرت بڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے یا اسے گرنے سے روکنے کے لئے مقابلہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قوت محنت کی ویلیو یا عام لفظوں میں محنت کی ویلیو ضروریات زندگی کی ویلیو سے طے پاتی ہے یا محنت کی اس مقدار سے طے پاتی ہے جسے ان ضروریات کی تیاری میں لگانا پڑے۔ اب اگر کسی ملک میں مزدور کی روزمرہ اوسط ضروریات کی ویلیو چھہ گھنٹے کی محنت کے برابر ہے جو تین شلنگ میں ظاہر ہوتی ہے تو مزدور کو چھہ گھنٹے روز کام کرنا ہوگا تاکہ وہ



روز کی گزر اوقات کے مساوی پیدا کر سکے۔ اور اگر کام کا پورا دن بارہ گھنٹے کا ہو تو سرمایہ دار اس کی محنت کی ویلیو تین شلنگ میں ادا کرے گا۔ کام کا آدھا دن بے معاوضہ جائے گا اور شرح منافع ٹھیرے گی سو فیصدی۔ لیکن آگے فرض کیجئے کہ قوت پیداوار کم ہونے کے باعث، یوں کہہیے کہ زرعی پیداوار کی اتنی ہی مقدار اٹھانے کے لئے محنت کی زیادہ مقدار چاہئے۔ اور اس کے سبب روزمرہ اوسط ضروریات کی قیمت تین سے بڑھ کر چار شلنگ ہو جائے گی۔ ایسی حالت میں محنت کی ویلیو ایک تہائی یا  $\frac{1}{3}$  فیصدی بڑھ گئی۔ پہلے کے معیار زندگی سے مزدور کی روز کی گزر اوقات کے مساوی پیدا کرنے کے لئے اب کام کے آٹھ گھنٹے لگانے ضروری ہو جائیں گے چنانچہ زائد یا فالتو محنت چھ سے چار گھنٹے ہی رہ جائے گی اور شرح منافع سو سے گھٹ کر ۵۰ فیصدی پر آجائے گی۔ اپنی اجرت بڑھوانے کے لئے مزدور جب زور دے گا تو وہ اصرار کرے گا محض اس بات پر کہ اس کی محنت کی بڑھی ہوئی ویلیو ادا کی جائے جیسا کہ کوئی بھی مال بیچنے والا، جس کے مال کی لاگت بڑھ چکی ہو، اس کوشش میں رہتا ہے کہ اس کے مال کی بڑھی ہوئی ویلیو ادا کی جائے۔ اگر اجرت نہیں بڑھتی یا تسلی بخش حد تک نہیں بڑھتی کہ ضروریات زندگی کی بڑھی ہوئی ویلیو کو پوری پڑ سکے تو محنت کی قیمت اس کی ویلیو سے نیچے اتر جائے گی اور مزدور کا معیار زندگی بگڑ جائے گا۔

مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تبدیلی مخالف سمت میں ہو۔ محنت کی قوت پیداوار بڑھی ہونے کی بدولت روزمرہ اوسط ضروریات کی اتنی ہی مقدار ممکن ہے کہ تین شلنگ کے بجائے دو شلنگ پر اتر آئے یا یوں کہئے کہ کام کے دن میں چھ کے بجائے صرف چار گھنٹے کافی ہونے لگیں روزمرہ ضروریات کی ویلیو کے مساوی پیدا کرنے کو۔ اب محنت کرنے والا دو شلنگ میں ہی اتنی ضروریات خرید سکے گا جتنی وہ تین شلنگ میں خریدا کرتا تھا۔ محنت کی ویلیو بے شک گری لیکن وہ گری ہوئی ویلیو مال کی اتنی ہی مقدار پر حاوی ہے جتنی پہلے تھی۔ ایسی حالت میں منافع تین سے چار شلنگ ہو جائے گا اور شرح

منافع سو سے دوسو فیصدی۔ اگرچہ مزدور کا قطعی معیار زندگی جہاں تھا وہیں رہا لیکن اس کی نسبتی اجرت اور ساتھ میں اس کی نسبتی سماجی حیثیت سرمایہ دار کے مقابلے میں اور گر گئی۔ اب اگر کام کرنے والا نسبتی اجرت کو اور گرنے سے روکنے کھڑا ہوتا ہے تو وہ صرف اسی کوشش میں ہے کہ خود اپنی محنت کی بڑھی ہوئی قوت پیداوار میں کچھ حصہ بٹائے اور سماجی پیمانے پر اپنی پہلے کی نسبتی حیثیت کو سنبھالے رکھے۔ چنانچہ جب انگلینڈ میں اناج کا قانون منسوخ کیا گیا اور اس قانون کے منسوخ کرانے کے ایجنٹیشن کے دنوں میں جو حلفیہ وعدے کئے گئے تھے ان کی کھلی خلاف ورزی کر کے انگریز مل مالکوں نے عام طور سے اجرتیں دس فیصدی گھٹا دیں تو مزدوروں نے ٹکر لی۔ شروع میں معلوم ہوتا تھا کہ وہ لا حاصل رہی۔ لیکن بعد میں کچھ ایسے اسباب کی بدولت جن کا بیان میں فی الحال نہیں کر سکتا، وہ کئی ہوئی دس فیصدی اجرت پھر وصول کر لی گئی۔ ۲۔ ضروریات زندگی کی ویلیو ممکن ہے وہی رہے جو تھی اور اس کے نتیجے میں محنت کی ویلیو بھی وہی رہے، لیکن ان کی نقد قیمت میں فرق آجائے کیوں کہ روپے کی ویلیو پہلے بدل چکی۔

مثلاً یہ ہو سکتا ہے کہ زیادہ زرخیز کانیں دریافت ہونے یا کسی اور وجہ سے دو اونس سونا حاصل کرنے کی محنت اتنی ہی رہ جائے جتنی پہلے ایک اونس سونے میں لگتی تھی۔ اس صورت میں سونے کی ویلیو گھٹ کر آدھی یا پچاس فیصدی رہ جائے گی۔ اب چونکہ تمام مالوں کی ویلیو پہلے سے دو گنی رقم میں ظاہر کی جائے گی تو محنت کی ویلیو کا بھی یہی ہوگا۔ بارہ گھنٹے کی محنت جو پہلے چھ شلنگ میں ظاہر ہوتی تھی اب بارہ شلنگ میں ہونے لگے گی۔ محنت کرنے والے کی اجرت اگر چھ شلنگ ہونے کے بجائے اب بھی تین ہی شلنگ رہی تو اس کی محنت کی نقد قیمت محنت کی ویلیو سے آدھی رہ جائے گی اور اس کا معیار زندگی بہت بری طرح گرے گا۔ اگر اس کی اجرت بڑھ بھی جائے لیکن اس تناسب سے نہ بڑھے جس سے سونے کی ویلیو گری ہے تب بھی محنت کی نقد ویلیو گرنا کم و بیش ویسا ہی رہے گا۔ ایسے موقع پر اور کچھ نہیں بدلا۔ محنت کی پیداواری قوت، مانگ اور



سیلائی یا مالوں کی قدریں سب جوں کی توں رہیں۔ ان قدروں کے نام جو نقد رقموں کی صورت میں ہوتے ہیں، ان کے سوا کوئی شے تبدیل نہیں ہوئی۔ یہ کہنا کہ اس صورت میں مزدور اپنی اجرت میں بقدر مناسب اضافے کی کوشش نہ کرے، ایسا ہی ہے جیسے کہا جائے کہ چیزوں کے بجائے وہ صرف ناموں میں معاوضہ لے کر قناعت اختیار کرے۔ پچھلی تمام تاریخ ثابت کرتی ہے کہ جب بھی نقد رقم کی قیمت گرنے کا موقع آتا ہے تو سرمایہ دار چوکنے ہو جاتے ہیں اور موقع سے فائدہ اٹھا کر محنت کرنے والوں کو فریب دئے رہتے ہیں۔ سیاسی معاشیات کے ماہرین کا ایک بڑا مکتب فکر ایسا ہے جس کا کہنا ہے کہ سونے والی زمینوں کی نئی دریافتوں کی بدولت، چاندی کی کانوں میں کام کی آسانیوں، اور پارے کی سستی نکاسی کی بدولت قیمتی دھاتوں کی ویلیو پھر گر گئی ہے۔ اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ یورپ میں ہر طرف اور ایک ساتھ کیوں آواز اٹھی ہے اجرتیں بڑھوانے کی۔

۳۔ اب تک عام طور سے ہم یہ فرض کرتے آئے ہیں کہ کام کا دن محدود ہوتا ہے۔ کچھ بھی سہی کام کا دن بجائے خود مستقل حدوں کا پابند نہیں۔ سرمائے کا مستقل رجحان یہی ہے کہ وہ کام کے دن کو جسمانی طور پر جتنا کھینچ سکے کھینچے کیوں کہ اسی حساب سے فالتو محنت لے گا اور اس سے حاصل ہونے والا منافع بھی اتنا ہی بڑھے گا۔ کام کے دن کو لمبا کھینچنے میں سرمائے کو جس قدر کامیابی ہوگی اسی قدر وہ دوسروں کی محنت ہتھیا سکے گا۔ پوری سترھویں صدی میں، بلکہ اٹھارویں صدی کے پہلے دو تہائی برسوں میں بھی پورے انگلستان میں کام کے دس گھنٹے کا معمول تھا۔ جیکوبین کے خلاف جنگ چھڑی جو دراصل برطانوی امیروں نے برطانیہ کے عام مزدوروں کے خلاف چھیڑی تھی (۲۳)، تو لڑائی کے پورے عرصے سرمائے نے خوب بغلیں بجائیں اور کام کا دن دس کے بجائے بارہ، چودہ اور اٹھارہ گھنٹے تک بڑھا دیا۔ سالتھوس، جسے دور دور جذباتی رقت کا الزام نہیں دیا جا سکتا، ۱۸۱۰ء کے شائع شدہ ایک پمفلٹ میں کہتا ہے کہ اگر یہی حالت چلتی رہی تو قوم کی زندگی کی خاص جڑ بنیاد پر چوٹ پڑے گی (۲۴)۔ نو ایجاد مشینری ابھی عام طور سے لگائی نہ گئی تھی

کہ اس سے چند سال پہلے ۱۷۶۰ء کے قریب انگلینڈ میں ایک پمفلٹ شائع ہوا جس کا عنوان تھا: ”صنعت پر ایک مضمون“۔ پمفلٹ کا بے نام مصنف، جو محنت کش طبقوں کا پکا دشمن ہے\*، کھلے لفظوں میں زور دے کر کہتا ہے کہ محنت کے دن کی حدیں پھیلانا بے حد ضروری ہے۔ اس مقصد سے اور باتوں کے علاوہ وہ ایک تجویز یہ بھی رکھتا ہے کہ محنت گھر (۲۵) قائم کئے جائیں جو بقول اس کے ”ہیبت گھر“، ہونے چاہئیں۔ ان ”ہیبت گھروں“ کے لئے محنت کے دن کی حدیں کیا ہوں گی؟ وہ بارہ گھنٹے کی تجویز کرتا ہے، یعنی ٹھیک اتنا وقت جتنا ۱۸۳۲ء میں سرمایہ داروں، سیاسی معاشیات والوں اور وزیروں کے کہنے کے مطابق نہ صرف اس زمانے میں مقرر تھا بلکہ محنت کے لئے کم از کم اتنا ضروری اور بارہ برس تک کی عمر کے بچے پر بھی لازم ہونا چاہئے۔

اپنی قوت محنت بیچ کر، موجودہ نظام میں اسے بیچنا تو ہے ہی، مزدور اس قوت کا استعمال سرمایہ دار کے سپرد کر دیتا ہے لیکن چند معقول حدوں کے اندر۔ وہ اپنی قوت محنت بیچتا ہے تاکہ اسے سنبھال سکے (قدرتی طور پر جتنی گھسائی ہوتی ہے فی الحال اس کا ہم حساب نہیں کرتے) لیکن وہ بالکل ہی برباد نہ ہونے پائے۔ روز کی یا ہفتہ وار ویلیو کے حساب سے اپنی قوت محنت بیچنے میں یہ بات ملحوظ رکھی جاتی ہے کہ ایک دن یا ایک ہفتے کے اندر وہ قوت محنت دو دن یا دو ہفتے کے برابر نہ تو خرچ کی جائے گی، نہ اتنی ضائع ہونے پائے گی۔ کوئی مشین لیجئے جس کی قیمت ایک ہزار پونڈ ہے۔ اگر وہ دس سال کے استعمال سے ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہونی ہے تو جو مال اس سے بنایا جاتا ہے، اس مال میں ہر سال ایک سو پونڈ کی ویلیو کا اضافہ کرے گی۔ اور اگر اسے صرف پانچ سال کے استعمال میں ختم ہونا ہے تو سالانہ دو سو پونڈ کی ویلیو لگے گی، یا یوں کہیں کہ مشین کی سالانہ گھسائی کی ویلیو اتنے عرصے پر پھیلائی جاتی ہے جتنے عرصے میں وہ استعمال سے ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو جائے گی۔ مگر

\* غالباً اس کا مصنف تھا جان کنگھم۔ (ایڈیٹر)



یہاں آدمی اور مشین میں فرق پڑتا ہے۔ مشین کی طاقت ٹھیک اسی نسبت سے ختم نہیں ہوتی جس سے اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف آدمی پر کام کے اوقات بڑھائے جاتے ہیں تو وہ دیکھنے میں جتنا تھکتا ہے، درحقیقت اس سے زیادہ ٹوٹتا یا گھل جاتا ہے۔

جب محنت کرنے والوں کی طرف سے یہ کوشش کی جائے کہ کام کے گھنٹے پہلے کی معقول حدوں تک کم ہوں، یا یہ کہ جب وہ کام کے گھنٹوں کے معمول پر قانونی حد نہیں لگوا سکتے تو اجرت بڑھوا کر کام کی زیادتی پر ایک روک لگانے کی کوشش کرتے ہیں، یعنی فالتو وقت میں جو ان سے کام لیا گیا اجرت اسی کی نسبت سے نہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی بڑھائی جائے (یا اوور ٹائم کی اجرت نسبتاً زیادہ ہو) تو وہ صرف اپنی طرف سے اور اپنی نسل کی طرف سے ایک فرض ادا کرتے ہیں۔ محنت کرنے والے اس طرح صرف حدیں کھڑی کرتے ہیں سرمائے کے بے درد قبضہ مخالفانہ پر۔ وقت انسانی نشوونما کے لئے محض ایک گنجائش ہی تو ہے۔ جس آدمی کو فرصت کا وقت میسر نہ ہو، جس کی ساری عمر، سونے، کھانے وغیرہ کی جسمانی حاجتوں کو چھوڑ کر باقی تمام وقت سرمایہ دار کے لئے محنت کرنے میں کٹ جائے، وہ لداؤ جانور سے بھی بدتر زندگی گزارتا ہے۔ جسمانی لحاظ سے تھکا ہارا اور روحانی لحاظ سے بے حس، وہ ایک ایسی مشین رہ جاتا ہے جس سے غیر کی دولت ڈھالی جائے۔ پھر بھی موجودہ صنعت کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ اگر سرمائے پر پابندی نہ لگائی جائے تو وہ بڑی بے پروائی اور بے رحمی کے ساتھ پورے محنت کش طبقے کو انتہائی پستی کی حالت پر پہنچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے۔

کام کے گھنٹے بڑھانے میں سرمایہ دار زیادہ اجرت دیتے ہوئے بھی محنت کی ویلیو گرا سکتا ہے، اگر وہ اجرت، جو بڑھائی گئی ہے، محنت کی اس بڑھتی ہوئی مقدار سے، جو مزدور سے لی جاتی ہے، اور زیادہ محنت کے کارن قوت محنت میں جو تیزی سے زوال آتا ہے، اس سے بھی میل نہ کھاتی ہو۔ ایک اور ترکیب بھی ہے۔ آپ کے یہ اعداد و شمار نکالنے والے جو درمیانی طبقے سے ہوتے ہیں، بتائیں گے کہ مثلاً لنکاشائر میں فیکٹری کے ملازم خاندانوں کی اوسط اجرتیں بڑھ گئی

ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جہاں پہلے صرف ایک آدمی یعنی خاندان کا بڑا کام کیا کرتا تھا، اب وہیں اس کی بیوی اور تین چار بچے بھی سرمائے کے جگن ناتھ کے رتھ کے نیچے (۲۶) پسنے کو ڈال دئے گئے ہیں اور ان کی اجرت مل کر جتنی بڑھی ہے وہ اس فالتو محنت کے برابر نہیں آتی جو سارے خاندان سے ملا کر لی جاتی ہے۔ اگر کام کے گھنٹوں کی مقررہ حد بھی قائم رہے جیسا کہ آجکل صنعت کی ان تمام شاخوں میں ہے جو فیکٹری قانون کے ماتحت ہیں، تب بھی اجرت کا بڑھنا محنت کی ویلیو کی ادائیگی کا وہی پچھلا معیار قائم رکھنے کی خاطر ضروری ہو جاتا ہے۔ محنت کی شدت بڑھانے سے، یہ ممکن ہے کہ آدمی کو گھنٹے بھر کے وقت میں اتنی محنت خرچ کرنی پڑ جائے جتنی وہ پہلے دو گھنٹے میں کیا کرتا تھا۔ صنعت کی ان شاخوں میں جن پر فیکٹری کا قانون لاگو ہے، کسی حد تک یہ عمل ہو بھی چکا ہے اور وہ اس طرح کہ مشینری اور کام کی رفتار تیز کر کے ایک ایک آدمی کے ذمے زیادہ مشینوں کی دیکھ بھال کر دی گئی۔ اگر محنت کی شدت بڑھانے یا ایک گھنٹے میں جتنی محنت کھپتی ہے اسے بڑھانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوا کرتا کہ کام کے گھنٹوں کی مدت بجا طور پر کم کردی جاتی تب بھی محنت کرنے والا کچھ فائدے میں رہتا۔ اگر وقت محنت کی یہ حد ٹوٹتی ہے تو اس نے ایک شکل میں جو پایا وہ دوسری صورت میں کھو دیا، اور دس گھنٹے کی محنت اتنی ہی جان لیوا بن جائے گی جتنی بارہ گھنٹے کی محنت بنی ہوئی تھی۔ سرمائے کے اس رجحان پر روک لگانے میں جب مزدور کی طرف سے کوشش ہوتی ہے کہ محنت کی بڑھتی ہوئی شدت کے مطابق ہی اس کی اجرت بھی بڑھائی جائے تو وہ صرف اتنا کرتا ہے کہ اپنی محنت کی قیمت گرنے اور اپنی نسل پر زوال آنے کا توڑ کرے۔

۴۔ آپ سب واقف ہیں کہ ایسی وجہوں سے جن کی تفصیل یہاں کچھ ضروری نہیں، سرمایہ دارانہ پیداوار تھوڑے تھوڑے وقفے سے بعض چکروں سے گزرتی رہتی ہے۔ ایک حالت امن چین کی ہوتی ہے، پھر بڑھتی ہوئی ہلچل، خوشحالی، ضرورت سے زیادہ پیداوار، بحران یا سنکٹ اور پھر جمود۔ مال کے بازار دام اور بازار کی شرح منافع کو



بھی انہی دوروں سے گزرنا پڑتا ہے کہ کبھی اوسط سے گر گئے، کبھی بڑھ گئے۔ اگر اس پورے چکر پر نظر رکھیں تو آپ دیکھیں گے کہ بازاردام اگر ایک طرف کو زیادہ ہٹتے ہیں تو پھر دوسری طرف ہٹ کر اپنا حساب برابر کر لیتے ہیں اور پورے چکر کا اوسط نکالا جائے تو مالوں کے بازاردام بالآخر اپنی ویلیو کے ہی پابند رہتے ہیں۔ اچھا تو بازاردام ڈونے کے دور میں، بحران اور جمود کے دنوں میں اگر محنت کرنے والے کو بالکل ہی بے روزگار نہ کر دیا جائے تو اس کی اجرت ضرور گھٹا دی جاتی ہے۔ دام گرتے وقت بھی، فریب سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ محنت کرنے والا سرمایہ دار سے مول تول کرے کہ اجرت گھٹایا جانا ضروری ہے تو کس تناسب سے ضروری ہے۔ اور خوش حالی کے زمانے میں جب خاص کر زائد منافع بن رہا ہو، اگر وہ اپنی اجرت بڑھوانے کے لئے نہیں لڑتے تو صنعتی رفتار کا ایک چکر پورا ہوتے ہوتے جو اوسط پڑے گا اس میں اوسط اجرت یا اپنی محنت کی ویلیو بھی نصیب نہیں ہوگی۔ حماقت کی انتہا ہوگی اگر یہ تقاضہ کیا جائے کہ صنعتی چکر کے برے دنوں کا اجرت پر برا اثر تو ضرور ہی پڑے گا لیکن، جب اچھے دن ہوں، تو خوش حالی میں نعم البدل لینے سے مزدور خود کو علاحدہ ہی رکھے۔ عموماً تمام مالوں کی قدریں صرف اسی طرح وصول ہوتی ہیں کہ مانگ اور سپلائی کی لگاتار اونچ نیچ ہوتے رہنے سے بازار دام اپنی کمی بیشی کا حساب برابر کرتے رہتے ہیں۔ موجودہ نظام کے اصول سے محنت بھی اوروں کی طرح ایک مال ہے۔ چنانچہ اسے بھی کمی بیشی سے گزرنا چاہئے تاکہ اپنی ویلیو کے مناسب اوسط قیمت حاصل کر سکے۔ یہ ایک احمقانہ بات ہے کہ ایک طرف تو محنت کو ایک مال شمار کیا جائے اور دوسری طرف مال کی قیمتوں پر جو اصول لاگو ہوتے ہیں ان سے محنت کو الگ رکھا جائے۔ غلام کو گزراوقات کے لئے ایک مقررہ اور مستقل طلب ملتی رہتی ہے لیکن اجرت پر کام کرنے والے کو نہیں ملتی۔ پس لازم ہے کہ وہ ایک موقع پر اپنی اجرت بڑھوانے کی کوشش کرے تاکہ اور کچھ نہیں تو دوسرے موقع پر اجرت گھٹنے کی تلافی ہو جائے۔ اگر وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائے اور سرمایہ دار کے

مرضی اور حکم کو ہی مستقل معاشی قانون سمجھ کر قبول کر لے تو وہ غلاموں کی سی بدنصیبی کا شکار تو ہو جائے گا، غلام کی سی بے فکری اسے نصیب نہ ہوگی۔

۵۔ اب تک جتنی مثالیں میرے زیر غور آئی ہیں اور ان کی تعداد سو میں ننانوے ضرور ہے، آپ نے دیکھ لیا کہ اجرت بڑھوانے کی جدوجہد اپنے سے پہلے کی تبدیلیوں کی لپیٹ میں قدم بقدم چلتی ہے اور یہ خمیازہ ہے ان پہلے کی تبدیلیوں کا جو رونما ہوتی ہیں پیداوار کی مقدار میں، محنت کی پیداواری طاقت میں، محنت کی ویلیو میں، روپے کی ویلیو میں، جو محنت لی جاتی ہے اس کی گنجائش یا شدت میں، قیمتوں کی اس اونچ نیچ میں جو منحصر ہے مانگ اور سپلائی کی کمی بیشی پر، اور صنعتی رفتار کے پورے چکر کے مختلف مرحلوں سے پوری مطابقت رکھتی ہے۔ مختصر یہ کہ اجرت بڑھوانے کی مانگ لیبر کی جوابی کارروائی ہے سرمائے کی پہلے سے کی ہوئی کارروائی پر۔ اس جدوجہد کو ان تمام حالات سے بے تعلق کر کے دیکھنا، صرف اجرت کی تبدیلی پر نظر رکھنا اور ان تمام تبدیلیوں سے نظر بچا جانا جن سے یہ تقاضہ پیدا ہوتا ہے، ایسا ہے کہ آپ ایک غلط مفروضے سے شروع کرتے ہیں تاکہ آخر میں غلط نتیجے پر پہنچ جائیں۔

## ۱۴۔ سرمائے اور محنت کی کش مکش اور اس کے نتیجے

۱۔ میں دکھا چکا ہوں کہ اجرت گھٹائے جانے کے خلاف مزدوروں کی طرف سے جو تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد مقابلہ کیا جاتا ہے اور بار بار کوشش کی جاتی ہے کہ اجرت بڑھے، یہ بات اس اجرتی نظام کے ساتھ لازم ملزوم ہے اور خود اٹھتی بھی ہے اسی وجہ سے کہ محنت کو مال کا درجہ حاصل ہے، اس لئے وہی قاعدے جو قیمتوں کی عام رفتار پر حاوی رہتے ہیں، محنت بھی انہی کی پابند ہوتی



ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی دکھا چکا ہوں کہ اجرت میں عام اضافے کا اثر یہی ہوتا ہے کہ شرح منافع عام طور سے گھٹ جائے، پھر بھی اس سے مالوں کی اوسط قیمتوں پر یا ان کی قدروں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ تو آخر میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سرمائے اور محنت کی اس مسلسل کش مکش میں محنت کی کامیابی کے آثار کہاں تک ہیں۔ کامیے کی صورت میں تو یہ جواب دے سکتا ہوں اور کہہ سکتا ہوں کہ جیسا اور مالوں کا معاملہ ہے ویسا ہی محنت کا بھی ہے کہ اس کے بازار دام بھی ایک بڑے عرصے کے اندر اپنی ویلیو سے تال میل پیدا کریں گے۔ لہذا چاہے کتنے ہی نشیب و فراز آتے رہیں اور مزدور کچھ بھی کرے، اوسط میں اسے وہی وصول ہوگی جو اس کی محنت کی ویلیو یا جو اس کی قوت محنت کی ویلیو بنتی ہے، اور وہ طے پاتی ہے ان ضروریات کی ویلیو سے جو محنت کو قائم رکھنے اور پھر سے پیدا کرنے کے لئے لازم ہیں۔ یہ ضروریات زندگی کی ویلیو کم و بیش ہوتی رہتی ہے محنت کی اس مقدار سے جو ان چیزوں کے تیار کرنے میں لگتی ہے۔

لیکن بعض خصوصیات ایسی ہیں جو قوت محنت کی یا خود محنت کی ویلیو کو دوسرے تمام مالوں کی قدروں سے امتیاز بخشتی ہیں۔ قوت محنت کی ویلیو دو عناصر سے بنتی ہے: ایک محض جسمانی، دوسرا تاریخی یا سماجی۔ اس کی سب سے نیچلی حد تو جسمانی عنصر سے ہی بنتی ہے، یا یوں کہئے کہ اپنا وجود باقی رکھنے اور پھر سے پیدا کرنے کی خاطر، اپنے جسمانی وجود کو قائم و دائم رکھنے کی خاطر مزدور طبقے کو وہ ضروریات زندگی میسر ہونی چاہئیں جو زندہ رہنے اور نسل بڑھانے کے لئے انتہائی لازمی ہوتی ہیں۔ چنانچہ انہی انتہائی لازمی ضروریات زندگی کی جو ویلیو ہوگی وہی محنت کی ویلیو کی کم از کم حد مقرر ہوگی۔ دوسری طرف دیکھئے تو کام کے دن کے پھیلاؤ پر بھی کوئی نہ کوئی آخری حد ضرور ہوتی ہے، چاہے اس میں کتنی ہی لوچ اور لچک ہو۔ محنت کرنے والے کی جسمانی طاقت ہی اس کی آخری حد بنا دیتی ہے۔ اگر اس کے بدن کی اصلی سکت روزانہ کی کسی حد سے زیادہ خرچ ہونے لگے تو ہر روز نٹھ

سرے سے اتنی ہی نہیں کھپائی جا سکتی۔ لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، اس حد میں بڑی لچک ہوتی ہے۔ اگر کمزور اور کم جینے والی نسلیں یکے بعد دیگرے جلدی جلدی آتی رہیں تو وہ بھی لیبر کے بازار کو اسی طرح بھرا رکھیں گی جیسے مضبوط جسم کی اور زیادہ عمر پانے والی نسلوں کا سلسلہ رکھتا۔

اس جسمانی عنصر کے علاوہ محنت کی ویلیو ہر ایک ملک میں وہاں کے پہلے سے چلتے ہوئے معیار زندگی سے طے پاتی ہے۔ یہ صرف جسمانی زندگی کی بات نہیں، بلکہ ایسی ضروریات کا سہیا کرنا بھی شامل ہے کہ جن سماجی حالات میں لوگ پلتے بڑھتے ہیں یہ ضروریات بھی انہی سے ابھرتی ہیں۔ انگریز کا معیار زندگی آئرلینڈ کے معیار تک گھٹایا جاسکتا ہے۔ کسی جرمن کسان کا معیار زندگی لیونیوالے کسان تک اتارا جا سکتا ہے۔ تاریخی رواج اور سماجی چلن اس سلسلے میں کتنی اہمیت رکھتے ہیں، یہ آپ مسٹر تھارنٹن کی تصنیف ”حد سے زیادہ آبادی پر“، دیکھ کر اندازہ کر سکتے ہیں، جہاں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ انگلینڈ کے مختلف زراعتی ضلعوں میں آج بھی اوسط اجرت مختلف ہے۔ یہ ضلع زمین سے بندھے (نیم غلام) کسان کی حالت سے نکل کر سدھار کے جس جس درجے میں پہنچ پاتے ہیں، اسی درجے کی کم و بیش نسبت سے ان کی اجرتوں میں فرق پڑتا ہے۔

یہ تاریخی یا سماجی عنصر جو محنت کی ویلیو میں دخیل ہوتا ہے، زیادہ پھیل بھی سکتا ہے، سکڑ بھی سکتا ہے، یہاں تک کہ بالکل ناپید بھی ہو سکتا ہے کہ سوائے جسمانی حد کے اور کچھ نہ رہ جائے۔ جس زمانے میں جیکوبی کے خلاف جنگ چل رہی تھی (بڑے میاں جارج روز، جو ٹیکس ہضم کرنے کے پرانے پابی اور مفت کی تنخواہ پانے کے عادی (Sinecurist) تھے، اس جنگ کا مقصد یوں بتایا کرتے تھے کہ یہ ہمارے مقدس مذہب کی خوبیوں کو فرانسیسی بے دینوں کی دست برد سے بچانے کی خاطر ہے) ان دنوں دیندار انگریز کاشتکار نے، جس کا ذکر خیر ہم پہلے کسی موقع پر کر چکے ہیں، زرعی مزدوروں کی اجرتیں گھٹانے گھٹانے اتنی کر دی تھیں کہ خالص جسمانی احتیاج کو بھی کم پڑنے لگیں، اور وہ ضروریات جو نسل



کو باقی اور جاری رکھنے کے لئے درکار تھیں، ان کی کمی پوری کی جاتی اس فنڈ سے جو ”قانون مفلسی“ (۲۷) کی رو سے مقرر تھا۔ یہ شاندار ترکیب تھی اس بات کی کہ اجرت پر کام کرنے والے کو غلام بنا کر اور شیکسپیئر کے پیش کئے ہوئے بانکے کو مفلس تلاش بنا کر رکھ دیا جائے۔

اگر آپ مختلف ملکوں میں یا کسی ایک ہی ملک کے مختلف تاریخی دوروں میں اجرتوں کے معیار یا محنت کی قدروں کا موازنہ کریں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ خود محنت کی ویلیو بھی کوئی جامد چیز نہیں ہے بلکہ جس وقت اور دوسرے مالوں کی قدریں ایک حالت پر قائم ہوں تب بھی محنت کی ویلیو برابر گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ اسی طرح کا موازنہ کرنے سے یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ منافع کے صرف بازار بھاؤ ہی نہیں بدلتے بلکہ اس کا اوسط بھاؤ بھی بدل جاتا ہے۔

تاہم منافع کے معاملے میں کوئی ایسا اصول یا قاعدہ نہیں جو اس کی کم از کم حد مقرر کرتا ہو۔ کہا نہیں جا سکتا کہ منافع آخر میں کہاں تک اتر سکتا ہے۔ یہ حد مقرر کیوں نہیں کی جاسکتی؟ کیوں کہ اجرت کی کم از کم حد تو مقرر کردی جائے لیکن اس کی زیادہ سے زیادہ حد نہیں ٹھہرائی جا سکتی۔ ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ کام کے گھنٹے دئے ہوئے ہوں تو زیادہ سے زیادہ منافع وہاں تھیرے گا جہاں اجرت کی کم از کم جسمانی سطح ہوگی، اور اجرتیں دی ہوئی ہوں تو زیادہ سے زیادہ منافع کام کے گھنٹوں کی اس گنجائش سے میل کھائے گا جسے مزدور کی جسمانی طاقت سہار سکے۔ مطلب یہ کہ زیادہ سے زیادہ منافع ان حدود کے درمیان پہنچ کر ٹھہرتا ہے جہاں اجرتیں کم از کم اتری ہوئی ہوں (Physical minimum of wages) اور کام کے گھنٹے زیادہ سے زیادہ بڑھے ہوتے ہوں (Physical maximum of the working days)۔ ظاہر بات ہے کہ زیادہ سے زیادہ شرح منافع کی ان دو حدود کے درمیان اونچ نیچ کی بے پناہ صورتیں بھی ممکن ہیں۔ واقعی کس درجے پر لا کر منافع ٹھہرایا جائے، یہ طے پاتا ہے صرف اس کش مکش

سے جو محنت اور سرمائے کے درمیان مستقل چلتی رہتی ہے۔ سرمایہ دار برابر اس کوشش میں رہتا ہے کہ اجرتیں گھٹا کر سب سے نیچی جسمانی سطح پر لائی جائیں اور کام کے گھنٹے بڑھا کر سب سے اوپر کی جسمانی سطح تک پہنچائے جائیں، اس پر محنت کرنے والا لگاتار مخالف سمت میں زور ڈالتا رہتا ہے۔

آخر یہ معاملہ حریفوں کی زور آزمائی کا ایک سوال بن کر رہ جاتا ہے۔

۲۔ جہاں تک کام کے گھنٹوں کی حد بندی کا مسئلہ ہے، وہ انگلینڈ میں ہو یا دوسرے ملکوں میں، کبھی طے نہیں ہو سکا سوائے اس کے کہ قانون سازی نے دخل دے کر طے کرایا۔ اگر مزدور باہر سے برابر دباؤ نہ ڈالتے رہتے تو قانون بھی کبھی دخل دینے پر آمادہ نہ ہوتا۔ اور جو بھی ہوتا لیکن اس نتیجے پر کبھی نہیں پہنچا جا سکتا تھا کہ محنت کرنے والے اور سرمایہ دار آپس میں نبٹ لیں اور کام کے گھنٹوں کی حد بندی طے کر لیں۔ عام سیاسی کارروائی کی ضرورت پڑنا خود ہی ثبوت دیتا ہے کہ اگر معاملہ صرف معاشی کارروائی کا ہو تو سرمایہ زیادہ مضبوط فریق ہے۔

رہا محنت کی ویلیو کی حدود کا سوال تو اس کا صحیح فیصلہ صرف مانگ اور سپلائی پر منحصر رہتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ سرمائے کی طرف سے لیبر کی مانگ اور محنت کرنے والوں کی طرف سے لیبر کی سپلائی۔ جن ملکوں میں نوآبادیات بسی ہیں وہاں سپلائی اور مانگ کا اصول مزدور کے حق میں جاتا ہے۔ اسی لئے ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اجرتوں کا معیار اوروں سے اونچا ہے۔ سرمایہ وہاں سارے جتن کرتا ہے لیکن لیبر کے بازار کو بار بار خالی ہونے سے نہیں روک پاتا کیوں کہ اجرت پر کام کرنے والے برابر مزدوری چھوڑ کر آزادانہ اور خود کفایتی کاشتکار بنتے رہتے ہیں۔ امریکہ والوں میں بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو مزدوری صرف پاؤں ٹکانے کے لئے کرتے ہیں جسے تھوڑے بہت عرصے بعد بہر حال چھوڑنا ہی ہے۔ نوآبادی میں حالت کے اس بگاڑ کو سنبھالنے کے لئے برطانیہ کی سریرانہ حکومت نے کچھ زمانے کے لئے وہ برتاؤ اختیار کر لیا جسے



’اجکل کا نوآبادی بسانے کا نظریہ، کہتے ہیں۔ اس نظریے کا حاصل یہ کہ نوآبادیات کی زمین کی قیمت خواہ مخواہ بہت بڑھا چڑھا کر رکھی جائے تاکہ مزدور تیزی کے ساتھ آزاد کاشتکار نہ بن بیٹھے۔

اب زرا پرانے متمدن ملکوں کو لیجئے جہاں پیداوار کے پورے سلسلہ عمل پر سرمایہ حاوی ہو چکا ہے۔ مثال کے طور پر انگلینڈ میں زرعی مزدوریاں ۱۸۳۹ء سے ۱۸۵۹ء تک کی مدت میں کتنی بڑھی ہیں؟ اور اس کا انجام کیا ہوا؟ کاشتکار نہ تو گیہوں کی ویلیو بڑھا سکے اور نہ اس کے بازارِ دام۔ ہمارے دوست ویسٹن صاحب بھی انہیں شاید یہی مشورہ دیتے۔ الٹا ہوا یہ کہ قیمتیں گرنے پر انہیں راضی ہونا پڑا۔ لیکن ان گیارہ برسوں میں انہوں نے ہر قسم کی مشین لگا دی، زیادہ سائنسی طریقے اپنا لئے، قابل کاشت زمینوں کا ایک حصہ چراگاہوں میں بدل دیا، کھیتوں کے سائز بڑھا دئے اور اسی سے پیداوار کا پیمانہ بڑا کر لیا۔ ان تدبیروں کے علاوہ اور ایسے راستے اختیار کر کے، جن سے لیبر کی قوت پیداوار بڑھا کر اس کی مانگ میں برابر تخفیف کی جا سکے، انہوں نے زرعی آبادی کو پھر اتنا کر لیا کہ وہ نسبتاً ضرورت سے زیادہ ہی رہے۔ یہ ہے وہ عام طریقہ جس سے پرانے جمے جمائے ملکوں میں اجرتیں بڑھنے کے مقابلے پر سرمایہ زرا آہستہ یا تیز جوابی کارروائی کرتا ہے۔ ریکارڈو نے سچ کہا تھا کہ مشین کا لیبر سے مستقل مقابلہ چلتا رہتا ہے اور اکثر مشین تبھی لگائی جاتی ہے جب محنت کی قیمت بڑھ کر ایک حد کو پہنچ چکی ہو (۲۸)۔ لیکن مشین لگانا محنت کی پیداواری قوت بڑھانے کی اور بہت ساری تدبیروں سے صرف ایک تدبیر ہے۔ یہی ایک قدم جو عام محنت کو نسبتاً فالتو بنا ڈالتا ہے، یہی دوسری طرف ہنرمند لیبر کو سادہ محنت میں بدل کر اس کی قدر و قیمت بھی گرا دیتا ہے۔

یہی قانون دوسری صورت میں بھی سامنے آتا ہے۔ محنت کی پیداواری طاقت بڑھنے سے، چاہے اجرت کا معیار کچھ زیادہ ہی کیوں نہ ہو، پھر بھی سرمایہ جمع ہونے کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ یہاں سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے، جیسا کہ آدم اسمتھ نے جس کے زمانے میں جدید صنعت ابھی ہاتھ پاؤں نکال رہی تھی، نتیجہ نکالا کہ سرمائے کا تیزی

سے جمع ہونا مزدور کے حق میں فیصلہ کرے گا۔ کیوں کہ اس کی محنت کی مانگ بڑھتی جائے گی۔ اس نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں تو آجکل کے بہت سے اہل قلم حیرت میں رہ جاتے ہیں کہ اگرچہ پچھلے بیس سال کے اندر انگریزی سرمایہ انگریزی آبادی کے مقابلے میں کہیں تیزی سے بڑھا ہے لیکن اجرتوں میں ایسا خاص اضافہ نہیں ہوا۔ کیوں؟ اس لئے کہ سرمائے کا ذخیرہ ہونا جوں جوں بڑھتا ہے اسی کے ساتھ سرمائے کی اندرونی ترکیب بھی رفتہ رفتہ بدلتی جاتی ہے۔ مجموعی سرمائے کا وہ حصہ جو قائم سرمائے میں یعنی مشینری، کچے مال اور ہر ممکن صورت کے ذرائع پیداوار میں لگایا جاتا ہے، وہ درجہ بدرجہ بڑھتا جاتا ہے، بمقابلہ اس حصے کے جو اجرتوں میں یا محنت کی خریداری میں پھیلا یا جاتا ہے۔ یہ قانون تھوڑے بہت نیچے تلے انداز میں مسٹر بارٹن، ریکارڈو، سسمانڈی، پروفیسر رچرڈ جونس، پروفیسر ریمزے، شربولیئے اور دوسرے حضرات نے بیان کر دیا ہے۔ اگر سرمائے کے ان دونوں اجزا کی نسبت شروع میں ایک اور ایک تھی تو صنعت کی ترقی میں اب یہ نسبت پانچ اور ایک کی ہو جاتی ہے، اور اسی طرح آگے بھی۔ اگر مجموعی سرمایہ چھ سو لگاہے اور اس میں تین سو اوزاروں میں، کچے مال وغیرہ میں اور تین سو اجرتوں پر پھیلا ہوا ہے تو مجموعی سرمائے کے صرف دو گنا ہونے کی دیر ہے کہ تین سو کے بجائے چھ سو محنت کرنے والوں کی ضرورت پڑے گی۔ لیکن اگر چھ سو کے مجموعی سرمائے میں پانچ سو مشین میں، کچے مال اور دوسری چیزوں میں لگا ہے اور صرف سو اجرتوں پر پھیلا ہوا ہے تو سرمائے کو چھ سو سے بڑھ کر تین ہزار چھ سو (۳۶۰۰) پر پہنچنا چاہئے تب جا کر تین سو کے بجائے چھ سو محنت کرنے والوں کی مانگ ہوگی۔ لہذا صنعت کی ترقی میں لیبر کی مانگ سرمائے کے جمع ہونے کے ساتھ ساتھ قدم نہیں بڑھاتی ہے۔ یہ مانگ بڑھے گی تو ضرور، لیکن سرمائے کے بڑھنے کی رفتار سے برابر اس کا تناسب کم ہوتا جائے گا۔ یہ چند اشارے اتنا دکھانے کو کافی ہیں کہ جدید صنعت کا بڑھنا ہی رفتہ رفتہ محنت کرنے والے کے مقابلے میں سرمایہ دار کا پلہ بھاری کرتا جاتا ہے اور نتیجے میں سرمایہ داری پیداوار کا عام



رجحان یہ نہیں ہوتا کہ اجرت کا اوسط معیار بلند کیا جائے بلکہ یہ معیار تنہا میں اتار دیا جائے، یا محنت کی ویلیو کم و بیش وہیں پہنچائی جائے جہاں اس کی سب سے نیچی حد ہو۔ جب اس نظام کے ہوتے چیزوں کا جھکاؤ یوں ہو تو کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ مزدور طبقے کو چاہئے کہ وہ سرمائے کی دست درازی کا مقابلہ کرنا چھوڑ دے اور اپنی عارضی بہتری کا جو اتفاقی موقع ہاتھ آتا ہے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوششوں سے منہ پھیر لے؟ اگر محنت کش ایسا کرنے لگیں تو وہ بے بسی اور بے کسی کا ایک انبوہ ہو کر رہ جائیں گے جس کے سامنے نجات کی کوئی راہ نہ ہو۔ امید ہے کہ میں اب تک یہ دکھا چکا ہوں کہ اجرت کے معیار کی خاطر محنت کشوں کی جدوجہد ایسا فعل ہے جسے اجرتوں کے نظام زندگی سے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا، سو میں سے ننانوے واقعات ایسے ہوتے ہیں جب اجرت بڑھانے کے لئے ان کی کوششیں دراصل صرف اس لئے ہوتی ہیں کہ محنت کی مقررہ ویلیو سنبھلی رہے اور یہ کہ سرمایہ دار سے اپنا مول تول کرنے کی ضرورت ان کی اس حالت کی رگ رگ میں بھری ہے جو حالت بکاؤ مال کی طرح ان سے اپنے آپ کو بکواتی ہے۔ اگر وہ بے ہمتی کے مارے سرمائے کے ساتھ اپنے روزانہ کے ٹکراؤ سے منہ موڑ لیں تو پھر ان میں اتنی سکت ہی نہ رہ جائے گی کہ کسی بڑی وسیع تحریک لے کر پہل کر سکیں۔

اسی کے ساتھ یہ بھی کہ، اجرت پر کام کرنے کا یہ نظام جو محنت کشوں کو عام طور سے دبا کر رکھتا ہے، اس سے قطع نظر، مزدور طبقے کو چاہئے کہ وہ آئے دن کے ان مقابلوں کے آخری انجام کو بہت بڑھا چڑھا کر نہ دیکھے۔ اسے یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ابھی لڑائی صرف اثرات سے چل رہی ہے، ان اثرات کی جڑ میں جو اسباب ہیں، ان سے نہیں چل رہی، وہ نشیب کی طرف ڈھلان کو روک رہی ہے، لیکن اس کی پوری سمت نہیں بدل رہی؛ وہ صرف بیماری کو تھامنے کی کوشش میں ہے، اس کا علاج کرنے میں نہیں۔ لہذا سرمائے کی انتھک دست درازی کے کارن یا بازار کی تبدیلیوں کے باعث جو یہ حالت پیدا ہو جاتی ہے کہ ہر بار اسے چارو ناچار چھاپہ مار لڑائی

لڑنی پڑتی ہے، اسی میں ڈوب کر نہ رہ جائے۔ اسے یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ موجودہ نظام محنت کشوں پر چاہے کتنی ہی مصیبتیں نازل کر لے لیکن ساتھ ساتھ ایسے مادی حالات اور سماجی صورتوں کو بھی جنم دیتا ہے جو پورے سماج کی معاشی کاپلاٹ کرنے کے لئے لازمی ہیں۔ قدامت پسندی کے اس کلمے کے بجائے کہ ”ایمانداری کی محنت کے دن کے بدلے ایمانداری کی مزدوری!“، انہیں اپنے پرچم پر یہ انقلابی پلول چڑھا لینی چاہئے کہ ”مزدوری پر کام کا نظام مردہ باد!“،

اس طول طویل، بلکہ تھکاڈالنے والے تفصیلی بیان کے بعد، جو مجھے بنیادی سوال پر روشنی ڈالنے کی خاطر مجبوراً دینا پڑا اب میں تقریر ختم کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کرتا ہوں:

(۱) اجرتوں کی شرح کا عام اضافہ عام شرح منافع کم کرنے کا سبب بنتا ہے۔ لیکن یوں دیکھئے تو مالوں کی قیمتوں پر اس کا اثر نہیں پڑتا۔

(۲) سرمایہ داری پیداوار کا عام رجحان یہی ہے کہ اجرت کا اوسط معیار بڑھائے نہیں بلکہ تنہا تک اتار دے۔

(۳) ٹریڈ یونینیں سرمائے کی دست درازی سے ٹکر لینے کا مرکز بن کر مفید کام انجام دیتی ہیں۔ لیکن وہ اپنی طاقت کا صحیح استعمال نہ کر کے جزوی طور پر نقصان اٹھاتی ہیں۔ عام طور سے ان کی ناکامی اس میں ہے کہ موجودہ نظام کے اثرات کا مقابلہ کرنے میں خود کو صرف چھاپہ مار لڑائی تک محدود کر لیتی ہیں، بجائے اس کے کہ ساتھ ساتھ اس نظام کو بدلنے کی کوشش کی جائے، اپنی منظم طاقتوں سے کام لے کر انہیں مزدور طبقے کی آخری رہائی کے لئے یعنی مزدوری پر کام کرنے کے اس نظام کے بالکل خاتمے کے لئے اصلی پرزہ بنا لیا جائے۔

مارکس نے آخر مئی اور ۲۷ جون  
۱۸۶۵ء کے درمیان تحریر کیا۔

پہلی بار لندن سے ۱۸۹۸ء میں شائع ہوا۔  
حرف بحرف چھاپا گیا۔

انگریزی زبان کے  
مسودے کے مطابق



یہ بات کہ ابتدا مشکل ہوتی ہے، ہر ایک علم کے بارے میں صحیح ہے۔ چنانچہ پہلا باب اور اس میں بھی خاص کر وہ سیکشن جس میں مالوں کا تجزیہ کیا گیا ہے، پڑھنے والے کو سب سے زیادہ مشکل نظر آئے گا۔ وہاں بھی خاص کر اتنا بیان جہاں ویلیو (قدر) کی اصلیت اور اس کی وسعت سے بحث کی گئی ہے، جہاں تک مجھ سے بن پڑا، میں نے عام فہم \* بنایا۔ ویلیو کی شکل، جس کی پوری طرح ترقی یافتہ صورت ہے روپے کی شکل، بہت ہی ابتدائی اور سادہ ہوتی ہے۔ لیکن ذہن انسانی کو اس کی تہہ میں اترنے کی بے فائدہ کوشش کرتے دو ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا۔ لیکن جو شکلیں زیادہ مرکب اور زیادہ پیچیدہ تھیں ان کے کامیاب تجزیے میں اندازہ قریب قریب صحیح رہا۔ وجہ یہ کہ مجموعی ساخت کے لحاظ سے اگر جسم کا مطالعہ کیا جائے تو یہ مطالعہ آسان ہے لیکن اسی جسم کے خلیوں کا الگ الگ مطالعہ مشکل ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ معاشی شکلوں کے تجزیے میں نہ تو خوردبین کام آتی ہے، نہ کیمیائی مادوں کی تاثیر سے کام لیا جاتا ہے۔ دونوں کی جگہ مطلق کلیوں کا زور چلتا ہے۔ محنت سے تیار ہونے والے سامان کی یہ شکل کہ وہ مال ہے،

\* یہ اس لئے اور بھی ضروری ہے کہ لاسال کی تصنیف کے اس حصے میں بھی، جو شولتسے دیلیچ کے توڑ پر لکھا گیا ہے، اور جہاں بقول مصنف اس موضوع پر (۳۱) میری ریسرچ کا ”ذہنی لب لباب“ پیش کیا گیا ہے، وہاں بھی غلط بیانی موجود ہے۔ یوں کہنا چاہئے کہ: اگر فرڈنینڈ لاسال نے اپنی معاشی تحریروں کے عام نظریاتی اصول بیان کرنے میں، مثلاً سرمائے کے تاریخی کردار، پیداواری تعلقات اور طریق پیداوار کے درمیان باہمی رشتوں کے بیان وغیرہ میں میری تحریروں کو حوالہ دئے بغیر لفظ بلفظ نقل کر لیا ہے، یہاں تک کہ میری وضع کی ہوئی اصطلاحیں بھی اٹھالی ہیں تو اس کا مطلب یہ نکلا کہ ایسا محض پروپیگنڈے کی نیت سے کیا گیا۔ میری مراد ان جزوی بیانات سے نہیں ہے اور نہ ان کے عملی اطلاق سے، جن سے میرا دور دور کوئی واسطہ نہیں۔

## کارل مارکس

### ”سرمایہ“ کی پہلی جلد کے پہلے جرمن ایڈیشن کا دیباچہ<sup>۲۹</sup>

یہ تصنیف جس کی پہلی جلد پبلک کے سامنے لا رہا ہوں، میری اسی تصنیف کا سلسلہ ہے جو »Zur Kritik der Politischen Oekonomie« (”سیاسی معاشیات کی تنقید پر“) کے نام سے ۱۸۵۹ء میں شائع ہو چکی ہے۔ پہلے حصے اور اس کے سلسلے کے درمیان جو اتنا لمبا وقفہ آگیا، اس کی وجہ لگاتار کئی سال کی بیماری ہے جو بار بار میرے کام میں خلل ڈالتی رہی۔

پہلے کی تصنیف کا نچوڑ موجودہ جلد کے پہلے باب میں خلاصہ کر کے دے دیا گیا ہے (۳۰)۔ غرض صرف اتنی نہیں تھی کہ سلسلہ قائم رہے اور تکمیل کردی جائے، بلکہ اصل مضمون کا بیان بھی کچھ اور بہتر ہوا ہے۔ جہاں تک اور جیسے بھی حالات نے اجازت دی، ایسے کئی نکتے جنہیں پہلے کی تصنیف میں صرف چھیڑا گیا تھا، یہاں زیادہ بھرپور طریقے سے آتے ہیں اور اس کے برخلاف جو نکتے وہاں زیادہ تفصیل سے بیان ہوئے تھے، موجودہ جلد میں ان کا سرسری ذکر آیا ہے۔ ویلیو اور روپے کے نظریوں کی تاریخ پر جو باب وہاں لکھے جا چکے ہیں، یہاں انہیں بالکل چھوڑ دیا گیا۔ جو لوگ پہلے کی تصنیف پڑھ چکے ہیں انہیں موجودہ کتاب کے باب اول کے حاشیے پر کچھ اور ایسے حوالے ملیں گے جن کا تعلق ویلیو اور روپے کے نظریات کی تاریخ سے ہے۔



سے زیادہ ترقی یافتہ ہوگا، وہ اپنے سے کم ترقی یافتہ ملک کے سامنے خود اپنے مستقبل کی ہی مثال پیش کرے گا۔

لیکن اس سے قطع نظر ایک اور بات: اگرچہ جرمنوں میں سرمایہ دارانہ پیداوار کا چلن عام ہوچکا ہے (مثلاً کارخانوں کے صدر مقامات پر) لیکن رنگ ڈھنگ انگلینڈ سے کہیں بدتر ہیں، وجہ یہ کہ فیکٹری کے قانونوں کی دیکھ بھال جرمنی میں ناپید ہے۔ مغربی یورپ کے دوسرے ملکوں کی طرح ہم بھی باقی تمام میدانوں میں صرف سرمایہ داری پیداوار کے پروان چڑھنے کا ہی شکار نہیں ہوئے بلکہ ابھی یہ عمل پوری طرح پروان نہیں چڑھا، اس کے بھی مارے ہوئے ہیں۔ نئے زمانے کی لعنتوں کے علاوہ وہ لعنتیں بھی ہمارے سر پر سوار ہیں جو اوپر کی نسلوں سے چلی آرہی ہیں، اور جو نتیجہ ہیں اس کا کہ دقیانوسی طریق پیداوار بھی گردن ڈالے ساتھ ساتھ جا رہے ہیں اور اپنی پیٹھ پیچھے سماجی اور سیاسی اہمیت کے جوڑپن کی ایک پوری قطار کھینچے چل رہے ہیں۔ ہمارے سر پر صرف وہ لدا ہوا نہیں جو زندہ ہے بلکہ وہ بھی جو مر چکا۔ Le mort saisit le vif! (زندہ بدست مردہ!)۔

جرمنی کے اور خود مغربی یورپ کے ملکوں کے سماجی اعداد و شمار کی ترتیب، انگلینڈ سے مقابلہ کر کے دیکھئے تو بہت پست حالت میں ملتی ہے۔ پھر بھی نقاب اتنا ضرور سرکا ہوا ہے کہ ہم کو میدوزا کے سر کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ اگر انگلینڈ کی طرح یہاں بھی ہماری حکومتیں اور پارلیمنٹیں معاشی حالات کی جانچ پرتال کے لئے وقتاً فوقتاً تحقیقاتی کمیشن بٹھایا کرتیں، اگر ان کمیشنوں کو اصلیت کی تہہ میں اترنے کے لئے وہی بے روک اختیارات حاصل ہوتے، اگر اس مقصد کے لئے ایسے لوگوں کا ملنا ممکن ہوتا جو انگریز فیکٹری انسپکٹروں کی طرح اہل اور لائق بھی ہوتے، بے مروت، بے لوث اور بے لاگ بھی ہوتے، انگلینڈ والوں کی طرح لوگوں کی صحت کے بارے میں میڈیکل رپورٹ دینے والے، عورتوں اور بچوں کی محنت سے ناجائز فائدہ اٹھانے، مکان اور خوراک کی حالت کی چھان بین کرنے کے کمیشنوں کے ممبر موجود ہوتے تو ہمارے یہاں بھی ایسا خوفناک منظر کھلتا جسے دیکھ کر

یا یہ کہ ہر ایک مال میں ویلیو کی شکل موجود ہوتی ہے، یہی بورژوائی سوسائٹی کا معاشی خلیہ ہے۔ سرسری نظر ڈالنے والے کے نزدیک ان شکلوں کا تجزیہ بال کی کھال نکالنا معلوم ہوگا۔ اور اصل میں یہاں واسطہ بھی بال کی کھال سے ہی ہے، لیکن یہ اس قماش کی باریکی ہے جیسی خوردبین سے جسم کے رگ و ریشے میں دیکھی جاتی ہے۔ پس اس جلد میں جہاں ویلیو کی شکل پر بحث کی گئی ہے، اس سیکشن کے علاوہ کسی اور جگہ دشواری کا الزام نہیں لگے گا۔ البتہ اتنا ہے کہ میری نظر کے سامنے ایسا پڑھنے والا رہا جو نئی بات معلوم کرنے کی دھن میں ہو اور خود بھی اپنے ذہن پر زور ڈالتا ہو۔ طبیعیات کا عالم مطالعے کے لئے یا تو ایسے مظاہر چنتا ہے جو بالکل نمونہ بن چکے ہوں اور ان پر باہر سے کسی اور طرح کا عمل دخل نہ ہو، خلل نہ پڑے، یا پھر جہاں ممکن ہوتا ہے وہ ان حالات میں تجربے کرتا ہے جن حالات میں وہ مظاہر اپنے معمول پر چلتے رہتے ہوں۔ زیر نظر تصنیف میں مجھے یہ جانچنا تھا کہ سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کیا ہے، اس طریق پیداوار کی نسبت سے مال کی تیاری اور تبادلے کے حالات و شرائط کیا ہیں۔ وہ سرزمین جہاں اس طریق پیداوار نے جڑ پکڑی ہے، بحالات موجودہ انگلینڈ ہے۔ اسی سبب سے میں نے اپنے نظریاتی خیالات کو ابھارنے اور نکھارنے میں خاص نمونہ انگلینڈ کو بنایا۔ اب اگر جرمن پڑھنے والا کاندھے جھٹک کر کہے کہ انگریز صنعتی اور زرعی مزدور کے حالات سے مجھے کیا سروکار، یا خوش فہمی کی بدولت اس زعم میں مبتلا ہو جائے کہ ہمیں اس سے کیا، جرمنی میں تو حالات اتنے بگڑے ہوئے نہیں ہیں، تو میں اس سے صاف صاف کہہ دیتا ہوں کہ «De te fabula narratur!» (روئے سخن تمہاری طرف ہے مرے عزیز!)

سرمایہ داری پیداوار کے قدرتی قانونوں کا جو نتیجہ سماجی تناہی کی صورت میں نکلتا ہے، یہ تناہی اوپر کے درجے کو پہنچی ہوئی ہے یا ابھی نیچے کی سطح پر ہے، اصل سوال بذات خود یہ نہیں۔ اصل سوال تو خود ان قانونوں کا ہے، ان رجحانوں کا ہے جو اٹل طریقے سے ایک لازمی نتیجے پر پہنچ کر رہتے ہیں۔ جو ملک صنعتی لحاظ



ہم لرز جاتے۔ قصہ کہانیوں کے پیرسٹی نے جادو کی ٹوپی پہن رکھی تھی تاکہ شکار کرتے وقت دیو اسے دیکھ نہ سکے۔ ہم لوگوں نے جادو کی ٹوپی سے آنکھ کان ڈھانپ رکھے ہیں تاکہ بھوت یا دیو کا گمان ہی نہ گزرنے پائے۔

اس جگہ ہمیں خود فریبی میں مبتلا نہ ہونا چاہئے۔ جیسا کہ اٹھارویں صدی میں ہوا کہ امریکہ کی جنگ آزادی نے (۳۲) یورپی درمیانی طبقے میں بگل بجا دیا تھا، اب انیسویں صدی میں امریکہ کی خانہ جنگی نے یورپ کے مزدور طبقے کے لئے بگل بجایا ہے۔ انگلینڈ میں سماج کے عناصر کا بکھراؤ نظر کے سامنے بڑھتا جا رہا ہے۔ جب وہ بڑھتے بڑھتے ایک حد کو پہنچے گا تو یورپ پر بھی اثر انداز ہوگا۔ خود مزدور طبقے کی ترقی جس درجے پر ہوگی اسی کے مطابق یورپ میں یہ بکھراؤ زیادہ بے دردی یا زیادہ رواداری کی شکل اختیار کرے گا۔ لہذا اعلیٰ مقاصد کے علاوہ کچھ ایسے فوری اور اہم مفاد حکمران طبقوں کے سامنے ہوتے ہیں جو ان کو اس پر آمادہ کرتے ہیں کہ مزدور طبقے کی آزادانہ اٹھان کی راہ میں جو رکاوٹیں ایسی ہیں کہ قانونی طور پر دور کی جا سکیں وہ ان تمام رکاوٹوں کو دور کر دیں۔ خاص اس سبب سے اور دوسری وجہوں سے بھی میں نے موجودہ جلد میں اتنی زیادہ جگہ دے کر انگلش فیکٹری قانون سازی کی تاریخ، تفصیل اور اس کے نتیجوں کا بیان کیا ہے۔ ایک قوم دوسری قوم سے سیکھ سکتی ہے اور اسے سیکھنا بھی چاہئے۔ جب کوئی سماج اپنی حرکت و رفتار کے قدرتی قانون کا پتہ چلانے میں صحیح ڈگر پر قدم اٹھا رہا ہو، اور اس تصنیف کا منشا یہی ہے کہ موجودہ سماج کی حرکت کا معاشی قانون کھول کر پیش کر دیا جائے، تب بھی یہ ممکن نہیں کہ لمبی چھلانگیں لگا کر یا قانون سازی کے ذریعہ ان رکاوٹوں کو پار کر جائے جو خود اسی کی عام اٹھان کے یکے بعد دیگرے کئی مرحلوں نے کھڑی کر دی ہیں۔ وہ صرف اتنی ہی تدبیر کر سکتا ہے کہ دردزہ کی شدت یا مدت کم ہو جائے۔

یہاں غلط فہمی ہو سکتی ہے، اسے روکنے کے لئے چند لفظ اور۔ میں نے سرمایہ دار یا جاگیردار کی تصویر کھینچنے میں کسی طرح کی

رنگ آمیزی نہیں کی۔ افراد سے ہمارا واسطہ یہاں صرف اتنا ہے جتنا ان کا وجود مختلف معاشی خانوں کو ظاہر کرتا ہے، یا ان کے دم سے خاص طبقاتی تعلقات یا طبقاتی مفادوں مصلحتوں کی نمائندگی ہوتی ہے۔ وہ نقطہ نظر جس سے میں نے سماج کے معاشی رنگ روپ اختیار کرتے رہنے کو قدرتی تاریخ کا ایک عمل مسلسل سمجھ کر دیکھا ہے، وہ کسی ایک شخص کو دوسرے سے کم ذمہ دار قرار نہیں دیتا ان تعلقات کا جنہوں نے سماجی طور پر خود اسے بھی جنم دیا ہے، چاہے وہ شخص اندر سے خود کو ان تعلقات سے کتنا ہی بلند برتر کیوں نہ سمجھتا ہو۔

سیاسی معاشیات کے دائرے میں آزادانہ علمی تلاش کو صرف انہی دشمنوں سے واسطہ نہیں پڑتا جو دوسرے دائروں میں موجود رہتے ہیں۔ یہ علم جس سروسامان کو ہاتھ لگاتا ہے، خود اسی کی یہ تاثیر ہے کہ میدان جنگ میں انسانی فطرت کے نہایت کثر، سنگین، نیچ اور کمینے جذبات کو ابھار کر لے آتا ہے، یعنی ذاتی مفاد کے غیظ و غضب کو۔ انگلستان کا کلیسائے اعلیٰ وغیرہ (جرمن لفظ Hochkirche) (۳۳) اپنے ایمان کے ۳۹ ارکان میں سے ۳۸ پر تو حملہ آسانی سے معاف کر دے گا لیکن اپنی آمدنی کے ۳۹ ویں حصے پر آنچ نہیں آنے دے گا۔ آجکل خدا سے انکار کرنا موجودہ ذاتی ملکیت کے تعلقات پر نکتہ چینی کرنے کے سامنے معمولی سا گناہ رہ گیا ہے۔ اوپر ’وغیرہ، کا اشارہ ہے اس نیلی کتاب (۳۴) کی طرف جو پچھلے چند ہفتوں میں نکلی ہے جس کا عنوان ہے: ”صنعتی سوال اور ٹریڈ یونینوں کے متعلق سرکار عالیہ کے غیرملکی مشنوں کے ساتھ خط و کتابت“، \*۔ تاج برطانیہ کے نمائندے دوسرے ملکوں میں بیٹھے ہوئے، لفظوں کی بھرمار کے ساتھ اعلان کر رہے ہیں کہ جرمنی میں، فرانس میں، مختصر یہ کہ براعظم یورپ کی تمام مہذب ریاستوں میں سرمایہ اور محنت کے موجودہ تعلقات میں ویسی ہی بڑی الٹ پلٹ کے آثار یقینی نظر آ رہے ہیں جیسی انگلستان میں ہو چکی ہے۔ اسی زمانے میں بحراوقیانوس کے

\*Correspondence with Her Majesty's Missions Abroad, regarding Industrial Questions and Trades Unions.



دوسرے کنارے پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے نائب صدر مسٹر ویڈ عام جلسوں میں اعلان کر رہے ہیں کہ غلامی کے خاتمے کے بعد سرمایہ اور زمینی جائداد کے تعلقات میں زبردست تبدیلی آنے والی ہے۔ یہ ہیں زمانے کی وہ نشانیاں جنہیں نہ تو گرجا کے وعظ چھپا سکتے ہیں، نہ زبردست کا گھونسا دبا سکتا ہے۔ یہ اس بات کے آثار نہیں کہ کل کوئی معجزہ ظہور میں آجائے گا۔ ان سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ خود اختیار طبقوں کے اندر لوگوں کو کل کی فکر پڑی ہوئی ہے اور یہ کہ آج کا سماج کوئی ایک حالت پر رہنے والی ٹھوس چیز نہیں، بلکہ ایک متحرک جسم ہے تبدیلی کی صلاحیت رکھنے والا، ایسا کہ برابر بدلتا رہتا ہے۔

اس تصنیف کی دوسری جلد میں سرمائے کی گردش کے عمل پر بحث کی جائے گی (کتاب دوم) اور سرمائے نے اپنے اٹھان کے زمانے میں کیا کیا شکلیں اختیار کی ہیں (کتاب سوم)، تیسری اور آخری جلد (کتاب چہارم) میں نظریے کی تاریخ بیان کی جائے گی۔

علمی تنقید کی بنا پر جو بھی رائے دی جائے میں اس کا استقبال کرتا ہوں۔ اور جسے رائے عامہ کہا جاتا ہے، جہاں تک اس کے تعصبات کا تعلق ہے، جن کے ساتھ میں نے کبھی رعایت نہیں برتی، ان سے پہلے کی طرح اب بھی میں فلورینٹینی جملے کی زبان میں یہی کہتا ہوں: «Segui il tuo corso, e lascia dir le genti!»

(”اپنا راستہ لو، جو کہتے ہیں انہیں کہنے دو!“، دانتے کی ”طریہ خداوندی“ کے الفاظ۔)

کارل مارکس

لندن، ۲۵ جولائی ۱۸۶۷ء

اس مضمون کا ترجمہ لندن سے ۱۸۸۷ء میں شائع ہونے والے انگریزی ایڈیشن کے مطابق، جسے اینگلس نے مرتب دیا، کیا گیا ہے۔

پہلی بار یہ عبارت اس کتاب میں شائع ہوئی: K. Marx. «Das Kapital, Kritik der politischen Oekonomie». Erster Band. Hamburg, 1867.

## کارل مارکس سرمایہ

### سرمائے کا نام نہاد ابتدائی سمٹاؤ

(جلد اول کا ۲۴ واں باب)

۷۔ سرمایہ دارانہ سمٹاؤ کا تاریخی رجحان

سرمائے کا ابتدائی سمٹاؤ، یعنی اس کا تاریخی مادہ خود کو کس سانچے میں ڈھالتا ہے؟ جہاں تک وہ فوراً غلاموں یا نیم غلام کسانوں کو مزدوری پر کام کرنے والے نہیں بنا ڈالتا، اور یوں محض روپ بدلنے کا کام انجام نہیں دیتا، سرمائے کے ابتدائی سمٹاؤ کا مطلب صرف یہ ہے کہ خود سامان تیار کرنے والے کا اس سے پردخل ہو جانا یعنی اس ذاتی ملکیت کا ٹوٹنا جس کی بنیاد میں مالک کی محنت پڑی ہے۔

سماجی یا پنچائتی ملکیت کے برخلاف، ذاتی ملکیت کا وجود صرف وہیں ہوتا ہے جہاں محنت کے ذرائع اور باہر کے حالات دونوں ہی پرائیویٹ لوگوں کی ملکیت ہوں۔ رہا یہ کہ پرائیویٹ لوگوں نے خود محنت کی ہے یا خود نہیں کی ہے، اس کے مطابق ذاتی ملکیت کے کردار میں بھی فرق پڑ جاتا ہے۔ پہلی ہی نظر میں جو ذاتی ملکیت کے پر شمار ہلکے گہرے رنگوں کا فرق دکھائی دیتا ہے وہ ان دونوں



انتہائی فاصلوں (خود کی محنت اور غیر کی محنت) کے درمیان پھیلے ہوئے مختلف مرحلوں کا پتہ دیتا ہے۔

پیداوار کے ذریعوں پر محنت کرنے والے کی پرائیویٹ ملکیت ہونا چھوٹی صنعت کی بنیاد ہے، چاہے وہ زراعتی ہو یا کچھ اور سامان تیار کرنے والی، یا دونوں۔ پھر یہ چھوٹی صنعت ایک لازمی شرط ہے سماجی پیداوار کے بڑھنے کی اور خود محنت کرنے والے کی آزادانہ حیثیت کی۔ اس میں شک نہیں کہ چھوٹے پیمانے کا یہ طریق پیداوار غلامی میں بھی موجود تھا، نیم غلام کسانوں میں بھی اور دوسرے پابندی کے حالات میں بھی چلتا رہتا ہے۔ لیکن پھلتا پھولتا اسی وقت ہے، اپنے پورے کس بل تبھی دکھاتا ہے، اپنے عروج کو تبھی پہنچتا ہے جب محنت کرنے والا خود مالک ہو محنت کے ان ذریعوں کا جنہیں وہ خود کام میں لگاتا ہے: کسان مالک ہو اس زمین کا جسے وہ زیر کاشت لاتا ہے، کاریگر مالک ہو ان اوزاروں کا جنہیں وہ اپنے ہاتھ تلے رکھتا ہے۔

اس طریق پیداوار کی اول شرط یہ ہے کہ زمین کاشتکاریوں میں بٹی ہوئی ہو اور پیداوار کے دوسرے ذریعے بھی بکھرے ہوئے ہوں۔ جس طرح پیداوار کے ان ذریعوں کا ایک جگہ اکٹھا ہو جانا اس کی حد میں شامل نہیں، اسی طرح مل جل کر کام کرنا، سامان تیار کرنے کے کسی ایک شعبے میں محنت کی تقسیم ہونا، قدرتی طاقتوں پر سماج کا کنٹرول ہونا اور ان کے پیداواری استعمال پر سماج کا عمل دخل ہونا، سماجی پیداواری طاقتوں کی آزادانہ اٹھان یہ سب اس کے دائرے سے خارج ہے۔ وہ تو پیداوار کے صرف اسی سسٹم میں، صرف ایسی سوسائٹی میں چلنے قابل ہے جو تنگ سی چار دیواری میں یا کم و بیش ابتدائی درجے کی حد بندیوں میں زندہ ہو۔ اسے ہمیشہ قائم رکھنے کا مطلب، بقول پیکر (Pecqueur) یوں ہوگا کہ ”چو طرفہ ٹٹ پونجیاپن کا قانون عام کر دیا جائے“، (۳۵)۔ اس طرف پیداوار کے بڑھتے بڑھتے ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں وہ خود اپنے انجریٹس ڈھیلے کرنے کا مادی سامان تیار کر دیتا ہے۔ اسی وقت سے سماج کی گود میں نئی طاقتیں اور نئی ترنگیں ہمکنے لگتی ہیں لیکن پہلے کا طریق پیداوار انہیں

جکڑ بندیوں میں ڈال کر دبائے رکھتا ہے۔ اس ڈھانچے کا صفایا ہونا چاہئے اور صفایا ہو جاتا ہے۔ اس ڈھانچے کا صفایا ہونا، الگ الگ اور بکھرے ہوئے ذرائع پیداوار کا سماجی طور پر سمٹ جانا، بہت سوں کی چھوٹی موٹی ملکیتوں کا چند ہاتھوں کی بڑی بھاری ملکیت میں بدل جانا، آبادی کی بہت بڑی تعداد کا زمین سے، گزر اوقات کے ذریعوں سے، محنت کے ذریعوں سے بے دخل و محروم کیا جانا۔ عام جنتا کی یہ خوفناک اور دردناک بے دخلی ہی سرمائے کی تاریخ میں شروع کا منظر ہے۔ اس کے اندر ایک پورا سلسلہ ہے زبردستی کے ہتھکنڈوں کا، جن میں صرف وہی سرسری طور پر ہماری نظر میں آئے ہیں جو عہد آفریں تھے اور سرمائے کے ابتدائی سمٹاؤ کی ترکیبوں کے بطور اپنا کام کر گئے۔ جو آدمی خود سامان تیار کرتا تھا اس کی بے دخلی بڑی بے رحمانہ چال بازیوں سے انجام کو پہنچائی گئی ہے، اور وہ بھی ایسی ایسی تمناؤں کے جوش میں، جو نہایت گندی، نابکار، گھٹیا، ذلیل اور جنونی تمنائیں تھیں۔ یہ خود کی کمائی ہوئی پرائیویٹ ملکیت، جو کہنا چاہئے کہ الگ الگ آزادانہ محنت کرنے والے افراد اور ان کے محنت کے اوزاروں اور ذرائع، دونوں کو ضم کر دینے سے بنی تھی، اس سرمایہ دارانہ پرائیویٹ ملکیت کے ہاتھوں بے دخل ہوتی ہے، جس کا پایہ رکھا ہوا ہے دوسروں کی برائے نام آزادانہ محنت کے ناجائز استعمال پر، یعنی مزدوری پر کام کرنے والوں کی محنت پر۔ \*

جیسے ہی کاپیٹل کا یہ عمل پرانے سماج کو اوپر سے نیچے تک اچھی طرح نڈھال کر چکتا ہے، جیسے ہی وہ وقت آتا ہے کہ محنت کرنے والا صرف پرولتاری (صنعتی مزدور) ہو کر رہ جائے اور اس کی

\* ”ہم ایسی حالت میں ہیں جو سماج کے لئے بالکل اجنبی ہے... ہماری ساری کوشش یہ ہے کہ ملکیت کی ہر ایک شکل کو محنت کی ہر ایک شکل سے الگ کر دیں۔“ (Sismondi. «Nouveaux Principes de l'Économie Politique», t. II [Paris, 1827], p. 434).



محنت کا سروسامان سرمایہ بن جائے اور سرمایہ داری طریق پیداوار اپنے قدموں پر کھڑا ہو جائے، تب جا کر محنت کا اور بھی زیادہ سماجی ہو جانا، زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار کا ایسی چیز بن جانا جو پورے سماج کے استعمال میں آئے، یا یہ کہ وہ مشترکہ ذریعہ پیداوار بن جائے اور پرائیویٹ مالکوں کا اور بھی بے دخل کیا جانا ایک نئی شکل اختیار کرتا ہے۔ اب جس کی بے دخل و محروم کئے جانے کی باری ہے وہ خود اپنی ذات کے لئے محنت کرنے والا نہیں بلکہ وہ ہے سرمایہ دار جو خود بہت سے مزدوروں کا استحصال کر رہا ہے۔

سرمایہ داری پیداوار کے اندرونی قانون آپ ہی آپ اثر انداز ہو کر، سرمائے کو چند ہاتھوں میں مرکوز کر کے اس بے دخلی کو انجام تک پہنچا دیتے ہیں۔ ایک سرمایہ دار کئی ایک کو مار ڈالتا ہے۔ سرمائے کے اس ارتکاز (سمٹنے) کے ساتھ ساتھ، یا بہت سے سرمایہ داروں کی چند سرمایہ داروں کے ہاتھوں بے دخلی کے دوش بدوش برابر بڑھتے ہوئے پیمانے پر محنت کے عمل میں مل کر کام کرنے کی شکل ابھرتی جاتی ہے، سائنس کو سوجھ بوجھ کے ساتھ کام میں لانے، زمین کو زیادہ سلیقے کے ساتھ کاشت کرنے، اور محنت کے اوزاروں کو ایسے اوزاروں میں تبدیل کرنے کی صورت بڑھنے لگتی ہے جو صرف مشترکہ محنت میں کام آسکیں، پیداوار کے تمام ذریعوں کو اس طرح کام میں لا کر کہ وہ ملی جلی مشترکہ محنت کا ذریعہ پیداوار بن جائیں، ان کے خرچ میں کفایت بڑھتی جاتی ہے، اور تمام قوموں یا لوگوں کا ایک عالمی بازار کے جال میں الجھنا اور پھر اسی کے ساتھ سرمایہ دارانہ عملداری کا انٹرنیشنل کردار بننا بھی زیادہ سے زیادہ ابھرتا جاتا ہے۔ جب سرمائے کے ان جغادریوں کی تعداد لگاتار گھٹتی ہی چلی جائے جو دھاندلی کرتے ہیں اور اس کا یا کلپ کے عمل کے سارے پھل خود بشور لیتے ہیں تو تباہ حالی اور بری طرح پھیلتی ہے، زور زبردستی، غلامی، ابتری اور ناجائز منافع کشی عام ہو جاتی ہے۔ لیکن اسی

کے ساتھ مزدور طبقے کی بغاوت بھی اٹھتی ہے، اس طبقے کی بغاوت جس کی تعداد ہمیشہ بڑھتی ہے، جس کا ڈسپلن، اتحاد اور تنظیمی طور طریقہ بھی خود سرمایہ دارانہ پیداوار کی ساخت کی تاثیر سے بنتا رہتا ہے۔ یہ طریق پیداوار جو سرمائے کے ساتھ ساتھ اور اسی کے سائے میں پروان چڑھا تھا، اب سرمائے کی اجارہ داری اس کے پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے۔ ذرائع پیداوار کا چند ہاتھوں میں مرکوز ہوتے رہنا اور محنت کے عمل کا سماجی ہوتے جانا آخر اس نوبت کو پہنچ جاتا ہے جب سرمایہ داری جوڑ بند اس کا بوجھ نہیں سنبھال پاتے اور پھٹ پڑتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نجی ملکیت کے کوچ کا نقارہ بجتا ہے۔ اوروں کو بے دخل کرنے والے خود بے دخل کر دئے جاتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ حصول کا طریقہ جو سرمایہ دارانہ طریق پیداوار سے نکلتا ہے سرمایہ دارانہ نجی ملکیت کو جنم دیتا ہے۔ یہ پہلی نفی ہے اس ذاتی ملکیت کی، جو آدمی کی اپنی محنت سے بنتی ہے۔ مگر قانون فطرت جو ٹالے نہیں ٹلتا خود سرمایہ دارانہ پیداوار سے بھی اس کی نفی پیدا کرتا ہے۔ یہ ہے نفی کا جواب نفی میں۔ سامان تیار کرنے والے کی ذاتی ملکیت کا حق تو پھر سے نہیں جماتا البتہ سرمایہ داری دور کی پروان چڑھنے کی بنیاد پر انفرادی ملکیت بحال کر دیتا ہے، یعنی یہ کہ زمین اور ذرائع پیداوار کسی ایک کے نہیں بلکہ تعاون سے اور مشترکہ ملکیت سے ہوا کریں۔

بکھری ہوئی پرائیویٹ ملکیت جو ذاتی محنت سے بنی ہو، اس کا سرمایہ دارانہ پرائیویٹ ملکیت میں تبدیل ہو جانے کا عمل قدرتی طور پر ایسے مرحلوں سے گزرتا ہے جو کہیں زیادہ ٹیڑھے میڑھے، سخت اور دشوار گزار ہوتے ہیں، ان کے مقابلے میں سرمایہ دارانہ پرائیویٹ ملکیت کا، جو پہلے ہی سے ملی جلی سماجی پیداوار بن چکی ہے، سماجی ملکیت میں ڈھل جانا کچھ بھی سخت یا دشوار نہیں۔ پہلے تو یوں ہوا تھا کہ تھوڑے سے غاصبانہ قبضہ کرنے والوں نے جتنا کی بہت بڑی



تعداد کو بے دخل کر دیا تھا اور اب یہ ہوتا ہے کہ جتنا کی بڑی تعداد تھوڑے سے غاصبانہ قبضہ کرنے والوں کو بے دخل کر دیتی ہے۔\*

اس مضمون کا ترجمہ لندن سے ۱۸۸۷ء میں شائع ہونے والے انگریزی ایڈیشن کے مطابق، جسے اینگلز نے ترتیب دیا، کیا گیا ہے۔

پہلی بار یہ عبارت اس کتاب میں شائع ہوئی: K. Marx. «Das Kapital. Kritik der politischen Oekonomie». Erster Band. Hamburg, 1867.

\* ”صنعت بڑھتی ہے تو، اگرچہ بورژوازی ہی اس کا غیاراتی کارندہ ہوا کرتی ہے اور اس کا توڑ نہیں کرسکتی، اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جہاں مزدور، باہمی مقابلے کے سبب ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہتے تھے، اب اس کی جگہ جماعت بندی کے سبب انقلابی میل جول پیدا کر لیتے ہیں۔ چنانچہ جدید انڈسٹری کی ترقی خود بورژوازی کے پاؤں تلے کی زمین یا وہ جڑ ہی کھود ڈالتی ہے جس پر کھڑے ہو کر وہ سامان تیار بھی کراتی اور تیار کرنے والوں سے ہتھیاتی بھی تھی۔ لہذا بورژوازی جو کچھ تیار کرتی ہے وہ سب سے مقدم اسی کی قبر کھودنے والے ہیں۔ اس کا زوال اور پرولتاریہ کی فتح دونوں یکساں ناگزیر ہیں۔ ان تمام طبقوں میں جو آج بورژوازی کے مقابل کھڑے ہیں، پرولتاریہ ہی اصل میں ایک انقلابی طبقہ ہے۔ دوسرے طبقے جدید انڈسٹری کے مقابلے میں ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو جاتے ہیں لیکن پرولتاریہ اسی کی خاص اور لازمی پیداوار ہے۔ نیچے کے درمیانی طبقے: چھوٹے پیمانے کے مال بنانے والے، دوکاندار، کاریگر، کسان۔ یہ سب کے سب بورژوازی کے مقابلے پر نکلتے ہیں تاکہ درمیانی طبقے کی ٹکڑیوں کی حیثیت سے اپنا وجود سلامت رکھیں۔ لہذا یہ انقلابی نہیں بلکہ رجعت پرست ہوئے کیوں کہ تاریخ کا پیہیہ الٹا گھمانے کی کوشش کرتے ہیں، (مارکس نے یہ عبارت اپنی اور اینگلز کی مشترکہ تصنیف ”کمیونسٹ پارٹی کا مینی فسٹو“ سے لی ہے۔ ملاحظہ ہو اس ایڈیشن کا حصہ اول، صفحات ۹۵-۹۳)۔

## فریڈرک اینگلز

”جرمنی میں کسانوں کی جنگ،“  
کا دیباچہ<sup>۳۲</sup>

۱۸۷۰ء کے دوسرے ایڈیشن کے لئے

یہ مقالہ لندن میں ۱۸۵۰ء کی گرمیوں میں ایسے وقت لکھا گیا تھا جب مخالف انقلاب (counter-revolution) اپنے انجام کو پہنچا ہی تھا اور اس کا اثر تازہ تھا۔ رسالے «Neue Rheinische Zeitung Politisch-ökonomische Revue» (۳۷) کے پانچویں اور چھٹے شماروں میں، جس کے ایڈیٹر خود کارل مارکس تھے، یہ ہمبرگ سے ۱۸۵۰ء میں شائع ہوا تھا۔ جرمنی میں میرے دوستوں نے چاہا کہ اسے پھر سے چھاپا جائے، چنانچہ میں اسی کی تعمیل کر رہا ہوں اور افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ مقالہ آج بھی بروقت ہے۔

یہاں اس بات کا دعوا نہیں کہ مقالے کا مواد ذاتی تحقیق سے نکالا گیا ہے۔ نہیں، بلکہ کسانوں کی بغاوتوں اور تھومس میونسٹر کا نفس مضمون زیرمین (۳۸) کے یہاں سے لیا ہوا ہے۔ اگرچہ اس کی کتاب میں یہاں وہاں کچھ خلا رہ گئے ہیں، تاہم اصل واقعات کے جمع کرنے میں آج بھی سب سے اچھی کتاب وہی ہے۔ پھر یہ بھی کہ پہلے والے زیرمین کو اپنے موضوع کی ایک لگن تھی۔ اس کے خمیر میں جو انقلاب پڑا تھا، جس نے دہے کچلے طبقوں کی طرف سے بولنے پر کمر بستہ کیا، وہی آگے چل کر رنگ لایا اور فرینکفرٹ میں اسے انتہائی بائیں بازو والوں میں (۳۹) نہایت نمایاں کر دیا۔



تاہم زیمرمین کے بیان میں جو اندرونی ربط کی کمی رہ گئی ہے، اگر وہ اس زمانے کے سیاسی اور مذہبی نزاعوں میں اپنے وقت کی طبقاتی کشمکشوں کے چلتے پھرتے سائے دکھانے میں ناکام رہا، اگر وہ طبقاتی کشمکشوں کے اندر صرف ظالم و مظلوم ہی دیکھتا رہا، صرف اچھے اور برے آدمی ہی نظر آئے اور آخر میں شر نے خیر پر فتح پالی، اگر ان سماجی رشتوں کا بیان ناقص رہ گیا جن کی بدولت یہ جنگ چھڑی اور اس کا یہ نتیجہ نکلا، تو اس میں زیمرمین کا نہیں، اس وقت کا قصور ہے جس وقت میں یہ کتاب لکھی گئی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنے دور کے لحاظ سے کتاب نہایت حقیقت پسندانہ ہے اور تاریخ پر جرمن عینیت پرست (idealist) تصنیفوں سے الگ راہ نکالنے میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔

اس کشمکش کے کھلے ہوئے نمایاں واقعات میں تاریخی بہاؤ کا نقشہ کھینچتے وقت میں نے اپنے بیان میں یہ کوشش کی ہے کہ کسانوں کی جنگ کی شروعات واضح کردوں، اس جنگ میں شریک ہونے والی مختلف پارٹیوں کی پوزیشن دکھا دوں، ان سیاسی اور مذہبی نظریوں کی وضاحت کر دوں جن سے یہ پارٹیاں خود اپنے ذہن میں اپنی حیثیت اجاگر کرنا چاہتی تھیں، اور آخر میں یہ بتا دوں کہ خود اس کشمکش کا جو نتیجہ نکلا ان طبقوں کی سماجی زندگی کے تاریخی حالات کے لحاظ سے وہی نتیجہ نکلنے والا تھا۔ اس طرح سے میں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اس زمانے کے جرمنی کا سیاسی ڈھانچہ، اس ڈھانچے کے خلاف بغاوتیں، اور معاصرانہ سیاسی اور مذہبی نظریے یہ سب وجہ نہیں تھے بلکہ نتیجہ تھے ترقی کے اس مرحلے کا جہاں تب کا جرمنی زراعت، صنعت، زمین اور پانی کی راہوں، مال اور روپے کے لین دین میں پہنچ چکا تھا۔ تاریخ کا یہ جو تن تنہا مادی تصور ہے، اس کی پہل میں نے نہیں، مارکس نے کی ہے۔ اسے فرانسیسی انقلاب ۱۸۴۸ء ۴۹ء کے بارے میں مارکس کی تصنیف \* جو اسی «Revue» میں

\* کارل مارکس "فرانس میں طبقاتی جدوجہد ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۰ء" (ایڈیٹر)

شائع ہوئی ہے اور "لوئی بوناپارٹ کی اٹھارویں برومیئر"، \* میں بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۸۴۵ء کے اور اب ۴۹ء - ۱۸۴۸ء کے جرمن انقلابوں میں اس قدر کھلی مشابہت تھی کہ اس وقت انکار ممکن نہیں تھا۔ واقعات کی رفتار میں اتنی یکسانی کے باوجود کہ جگہ جگہ کی بغاوتیں اور شورشیں ایک ہی رجاوے کی فوج کے ہاتھوں یکے بعد دیگرے کچل دی گئیں، اور حالانکہ دونوں موقعوں پر شہری برگروں (چودھریوں) کے روئے میں اکثر ایک سی مضحکہ خیز حالت رہی، پھر بھی تب اور اب کی بغاوتوں میں صاف اور قطعی فرق موجود ہے :

"۱۸۴۵ء کے انقلاب سے کس کا فائدہ ہوا؟ رجاوے کا۔ اور ۱۸۴۸ء کے انقلاب سے کس نے فیض اٹھایا؟ سہارا جاؤں نے، آسٹریا اور پروشیا نے۔ ۱۸۴۵ء کے چھوٹے موٹے راجاؤں کے پیچھے درمیانی حیثیت کے برگر لوگ کھڑے تھے جنہوں نے ان راجاؤں، تعلقہ داروں کو ٹیکسوں کی زنجیر میں اپنے ساتھ جکڑ رکھا تھا۔ لیکن ۱۸۵۰ء کے سہارا جاؤں کی، آسٹریا اور پروشیا کی پشت پر نئے زمانے کی بڑی بورژوازی کھڑی ہے جو قومی قرضوں کے ذریعے بڑی تیزی سے انہیں اپنے شکنجے میں کستی جا رہی ہے۔ اور بڑی بورژوازی کے پیچھے کھڑے ہیں پرولتاری لوگ۔" \*\*

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اوپر کے جملے میں جرمن بورژوازی کو اس کے حق سے کچھ زیادہ داد مل گئی۔ آسٹریا اور پروشیا دونوں جگہ اسے واقعی یہ موقع مل گیا تھا کہ موروثی بادشاہت کو "قومی قرضوں کے ذریعے تیزی سے اپنے شکنجے میں کس لیتی"، لیکن اس نے کہیں بھی اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا۔

۱۸۶۶ء کی جنگ (۴۰) نے آسٹریا کو بورژوازی کی جھولی میں ڈال دیا۔ مگر اسے حکومت کرنا نہیں آتا۔ بورژوازی میں نہ کسی بات کی سکت ہے، نہ قابلیت۔ وہ بس ایک ہی کام کر سکتی ہے۔ مزدوروں

\* دیکھئے اس ایڈیشن کا حصہ اول، صفحات ۲۹۷ - ۱۵۰۔  
\*\* فریڈرک اینگلس - "جرمنی میں کسانوں کی جنگ"، (ایڈیٹر)



میں ہلچل کے آثار دیکھتے ہی وحشیانہ حملہ کر بیٹھنا۔ اگر اب بھی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہے تو صرف اس وجہ سے کہ ہنگری والوں کو اس کی ضرورت ہے۔

اور پروشیا میں کیا حال ہے؟ یہ سہی کہ قومی قرضے دن دونے بڑھتے جاتے ہیں، خسارہ مستقل ہو کر رہ گیا ہے، سرکاری خرچ سال بہ سال بڑھ رہا ہے، ایوان میں بورژوازی کے ممبروں کی اکثریت ہے اور ان کی رضامندی کے بغیر نہ ٹیکس بڑھائے جاسکتے ہیں، نہ قرضہ چالو کیا جا سکتا ہے، پھر بھی اسٹیٹ پر اس کا قابو کہاں ہے؟ ابھی کچھ مہینے ہوئے کہ بجٹ میں پھر گھاٹا پڑنے لگا تو بورژوازی بہت اچھی پوزیشن میں تھی۔ اگر وہ صرف تھوڑی دیر اپنا ہاتھ کھینچے رہتی تو خوب لمبی چوڑی سہولتیں جیتنے میں کامیاب ہو جاتی۔ لیکن اس نے کیا کیا؟ اتنا ہی غنیمت سمجھا کہ حکومت نے اسے قریب ۹۰ لاکھ کی رقم اپنے قدموں میں ڈالنے پر راضی کر لیا ہے، ایک سال کے لئے نہیں، جی نہیں، ہر سال کے اور آئندہ ہمیشہ ہمیش کے لئے۔

میں نہیں چاہتا کہ ایوان کے بچارے ”نیشنل لبرلوں“ (۴۱) کو اس سے زیادہ دوش دوں جس کے وہ سزاوار ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ جو لوگ پشت پر تھے، یعنی عام سرمایہ دار خود انہوں نے بیچ منجدار میں ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ یہ عام سرمایہ دار حکومت کرنا ہی نہیں چاہتے۔ ۱۸۴۸ء کی ہڈی ابھی تک ان کے گلے میں اٹکی ہوئی ہے۔

جرمن بورژوازی یہ حیرت انگیز بزدلی کیوں دکھا رہی ہے؟ آگے چل کر ہم اس پر بحث کریں گے۔

اوپر کے بیان کی باقی دوسرے پہلوؤں سے پوری طرح تصدیق ہو چکی ہے۔ ۱۸۵۰ء سے ہی یہ ہو رہا ہے کہ چھوٹی ریاستیں زیادہ سے زیادہ پس منظر کے دھندلکے میں کھسکتی جا رہی ہیں اور اب آسٹریا اور پروشیا کی تکریموں میں کیل کا نٹا بن کر رہ گئی ہیں۔ آسٹریا اور پروشیا کے درمیان اقتدار کی ساری باگ ڈور ہاتھ میں لینے کے لئے سخت سے سخت مقابلہ ہوتا رہا ہے۔ آخر ۱۸۶۶ء میں بزور طاقت فیصلہ ہوا جس کے بعد سے آسٹریا کے سارے صوبے اسی کے ہاتھ میں رہے لیکن پروشیا کو براہ راست یا بالواسطہ پورے شمال پر بالا دستی

مل گئی اور جنوب مغرب کی تین ریاستیں \* فی الحال اپنے حال پر چھوڑ دی گئیں۔

اس تمام شاندار تماشے میں جرمن مزدور طبقے کے سامنے لے دے کے صرف یہ باتیں اہم ہیں کہ:

اول تو یہ کہ عام رائے دہندگی کے حق کی بدولت مزدوروں کو براہ راست قانون ساز اسمبلی میں اپنے نمائندے بھیجنے کا راستہ مل گیا۔ دوسرے یہ کہ پروشیا نے فضل خدا سے تین تاج و تخت \* \* \* ہضم کر کے ایک اچھی مثال قائم کر دی ہے۔ اب نیشنل لبرلوں کو بھی یہ بھروسہ نہیں رہا کہ اس حرکت کے بعد پروشیا کے سر پر ویسا ہی بے داغ اور خداداد تاج باقی ہے جیسا وہ پہلے دعوا کیا کرتا تھا۔ تیسرے یہ کہ اب جرمنی میں انقلاب کا صرف ایک ہی جاندار دشمن رہا اور وہ ہے پروشیا کی سرکار۔

چوتھے یہ کہ جرمن آسٹریاؤں کو اب آخر کار یہ فیصلہ کرنا ہی پڑے گا کہ وہ کیا بن کر رہنا چاہتے ہیں، جرمن یا آسٹریائی۔ جرمنی سے وابستہ ہونا بہتر سمجھتے ہیں یا باہر لیتھان پار کے دم میں بندھے ہوئے ملکوں سے۔ بہت زمانے سے یہ بات صاف تھی کہ انہیں دونوں میں سے کسی ایک کو چھوڑنا ہے۔ لیکن چھوٹی حیثیت کے بورژوا ڈیموکریٹ اس حقیقت سے برابر آنکھیں چراتے رہے ہیں۔

جہاں تک ۱۸۶۶ء کے بارے میں دوسرے اہم اختلافی نکتوں کا تعلق ہے، اور جن پر ایک طرف نیشنل لبرلوں اور دوسری طرف ”پیوپلز پارٹی“ والوں (۴۲) کے درمیان اس عرصے میں انتھک بحثا بحثی ہو چکی ہے، اگلے چند برسوں کی تاریخ نے ثابت کر دیا کہ ان دونوں نظریوں کے آپس میں اسی لئے اتنی سخت کشاکش تھی کہ دونوں ایک ہی تنگ نظری کی دو مقابل انتہاؤں پر کھڑے تھے۔

۱۸۶۶ء کے سال نے جرمنی کے سماجی ڈھانچے میں ایسی کچھ تبدیلی نہیں کی۔ تھوڑے بہت جو سرمایہ دارانہ سدھار ہوتے ہیں،

\* تین ریاستوں سے مراد ہے بایریا، بیڈن، ویورٹمبرگ۔ (ایڈیٹر)  
\*\* تین ریاستوں سے مراد ہے ہنوویر، ہیسے کاسیل، نساؤ۔ (ایڈیٹر)



مثلاً ناپ تول کا ایکسار ہونا، آندورف کی، پیشہ اختیار کرنے کی آزادی، وہ نوکرشاہی کی قابل قبول حدوں کے اندر ہی رہ جاتے ہیں اور اس درجے کو بھی نہیں پہنچتے جو مغربی یورپ کے دوسرے ملکوں کی بورژوازی بہت عرصہ پہلے حاصل کر چکی۔ اور تو اور، جو بڑی خرابی ہے، یعنی خاص اختیارات کا نوکرشاہی سسٹم (۴۳)، اسے ہاتھ تک نہیں لگاتے۔ پرولتاریہ کے حق میں پولیس کی روزمرہ کی کارروائیاں ان سارے قانونوں کو ڈھول کا پول بنا دیتی ہیں جیسے آندورف کی آزادی، شہریت اختیار کرنے کی آزادی اور پاسپورٹ کی رکاوٹ کا خاتمہ وغیرہ۔

۱۸۶۶ء کے شاندار تماشے سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ ترقی جو ۱۸۴۸ء سے آج تک جرمن صنعت اور تجارت، ریلوے، ٹیلی گراف، اور بحری جہازرانی میں ہوئی ہے۔ اسی عرصے میں انگلینڈ کا، بلکہ فرانس تک کا قدم جہاں پہنچا ہے اس کے مقابلے میں چاہے یہ ترقی کتنی ہی پیچھے کیوں نہ نظر آئے، تاہم جرمنی کے حق میں تو یہ انہونی بات ہے اور بیس برس کے اندر اتنا کچھ کر کے دکھا دیا جتنا پچھلے سو برس میں نہیں ہو سکا تھا۔ اب جاکر جرمنی اس قابل ہوا ہے کہ عالمی تجارت میں سنجیدگی سے قدم رکھے اور ایسے کہ پھر رشتہ نہ ٹوٹ سکے۔ صنعت کاروں کا سرمایہ تیزی سے کئی گنا ہوا ہے اور بورژوازی کی سماجی حیثیت بھی اسی نسبت سے بلند ہوئی ہے۔ صنعتی خوشحالی کی پکی نشانی، سٹہ بازی زوروں میں چل رہی ہے اور اس نے تعلقہ داروں اور نوابوں کو اپنے فتحمنند رتھ میں جوت لیا ہے۔ جرمن سرمایہ آجکل روسی اور رومانیائی ریلوے بنانے میں لگا ہے۔ خدا اس کی عاقبت بغیر کرے! — اور یہ ابھی پندرہ سال پہلے کی بات ہے کہ خود جرمن ریلوے انگریز کاروباریوں کے آگے جھولی پھیلائے کھڑی تھی۔ پھر ایسا کیوں ہے کہ بورژوازی نے سیاسی طاقت اپنی مٹھی میں نہیں لے لی اور وہ حکومت کے سامنے اتنی بزدلی دکھا رہی ہے؟ جرمن بورژوازی کی بدقسمتی یہ ہے کہ جرمنوں کی پسندیدہ عادت کے مطابق اس نے پہنچنے میں زرا دیر کر دی۔ اس کے پروان چڑھنے کے دن ایسے زمانے میں آئے ہیں جب دوسرے مغربی ملکوں کی بورژوازی کو

سیاسی گہن لگ چکا۔ انگلینڈ میں بورژوازی اپنے سچے نمائندے مسٹر برائٹ کو حکومت میں تبھی شامل کرا سکی جب رائے دہندگی کا دائرہ اور پھیلا دیا (۴۴) اور اسی کا خمیازہ یہ بھگتنا پڑے گا کہ بورژوا حکمرانی کا رہا سہا امکان بھی ختم ہو جائے۔ فرانس میں جہاں بورژوازی، یوں کہئے کہ پورے طبقے کی حیثیت سے صرف دو سال ۱۸۴۹ء اور ۱۸۵۰ء میں ہی اپنا اقتدار رپبلک کے سائے میں قائم رکھ سکی، لوئی بوناپارٹ اور فوج کے حق میں سیاسی طاقت سے دست بردار ہو کر ہی اپنا سماجی وجود بچا سکی۔ اب چوں کہ یورپ کے تین سب سے ترقی یافتہ ملکوں کے درمیان عمل درعمل کا سلسلہ دور تک ایک دوسرے سے جڑا ہوا چلا گیا ہے تو بورژوازی کے لئے یہ ممکن نہیں رہا کہ ایسے وقت جب انگلینڈ اور فرانس میں اس کا سیاسی اقتدار نکما ہو چکا، جرمنی میں اسے سنبھال کر اطمینان سے بیٹھ سکے۔

آج تک جتنے طبقوں نے حکومت کی ان سب سے الٹی تاثیر بورژوازی کی یہ ہے کہ ترقی کی راہ پر ایک موڑ ایسا آتا ہے جس کے بعد اس کی طاقت کی تمام ایجنسیوں کا کوئی بھی پھیلاؤ، اور اسی باعث سرمائے کا مزید پھیلاؤ بورژوازی کو روز بروز سیاسی طاقت سنبھالنے کا نااہل بناتا چلا جاتا ہے۔ ”بڑی بورژوازی کی پیٹھ پیچھے پرولتاریہ کھڑا ہے“، بورژوازی اپنی صنعت، تجارت اور آندورف کے ذریعوں کو ترقی دینے میں پرولتاریہ طبقے کو جنم دیتی ہے۔ ہوتے ہوتے ایک مقام ایسا آتا ہے، کچھ ضروری نہیں کہ ہر جگہ ایک ہی وقت میں آئے اور نہ یہ ضروری ہے کہ ترقی کے اسی مرحلے پر پہنچ کر پیش آئے، بہر حال اس مقام پر پہنچ کر بورژوازی کو سوجھتا ہے کہ اس کا پرولتاری جوڑی دار خود اس سے آگے بڑھا جا رہا ہے۔ بس اسی لمحے سے وہ طاقت جواب دینے لگتی ہے جو خاص اپنے ہاتھ میں سیاسی اقتدار رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ یہ طبقہ ہر طرف نظر ڈالتا ہے کہ کون بنتا ہے ہمارا حلیف جسے حالات کا تقاضا دیکھ کر یا تو اپنے اختیارات میں شریک کر لیں یا پورے اختیارات سونپ دیں۔

جرمنی میں یہ موڑ ۱۸۴۸ء میں ہی آچکا تھا۔ حق تو یہ ہے کہ اس وقت جرمن بورژوازی کو جرمن پرولتاریہ سے اتنا خوف نہیں



تھا جتنا فرانسیسی پرولتاریہ سے۔ پیرس میں جون ۱۸۴۸ء کی خونریز ٹکرنے (۴۵) بورژوازی کو جتا دیا کہ آگے کیا آنے والا ہے۔ جرمن پرولتاریہ میں بھی بے چینی کے آثار یہ دکھانے کو کافی تھے کہ جس بیچ سے اس طرح کی فصل آتی ہے، وہ بیچ جرمنی کی مٹی میں بویا جا چکا ہے۔ اسی دن سے بورژوازی کی تمام سیاسی کارستانیوں کی دھار مڑ کر رہ گئی۔ بورژوازی مڑ کر ہر طرف اپنے حلیف یا اتحادی ڈھونڈھنے لگی، قیمت کا خیال کئے بغیر خود کو ان کے ہاتھ بیچنے لگی اور تب سے آج تک اس نے ایک قدم بھی نہیں بڑھایا ہے۔

یہ سارے حلیف اپنی فطرت سے رجعت پرست ہیں: موروٹی بادشاہت جس کے ساتھ اپنی فوج اور نوکر شاہی ہے، بڑے بڑے جاگیرداری شرفاء، چھوٹے چھوٹے یونکر سردار (۴۶) اور تو اور پادری بھی شریک ہیں۔ ان سب کے ساتھ بورژوازی نے سمجھوتے اور سودے کئے، کچھ نہیں تو اپنی کھال بچانے کے لئے سہی، یہاں تک کہ بدلنے کے لئے بھی اس کے پاس کچھ نہیں رہ گیا۔ پرولتاریہ جتنا بڑھتا گیا، جتنا وہ خود کو ایک طبقے کی حیثیت سے دیکھتا اور ایک طبقے کی طرح عمل کرتا گیا، اتنا ہی بورژوازی کا دل بیٹھتا چلا گیا۔ آخر جب سادووا میں (۴۷) پروشیالوں کی تعجب خیز بری تدبیر (strategy) نے آسٹریا والوں کی حیرت انگیز بدتر تدبیر پر فتح پائی تو یہ پتہ چلانا مشکل تھا کہ دونوں میں سے کس نے اطمینان کا زیادہ گہرا سانس لیا، پروشیا کی بورژوازی نے۔ کہ اسے بھی سادووا میں ہار ہوئی تھی، یا آسٹریا کی بورژوازی نے۔

۱۸۷۰ء کی ہماری بڑی بورژوازی آج بھی وہی حرکت کر رہی ہے جو ۱۸۴۵ء میں درمیانی حیثیت کے برگروں نے کی تھی۔ جہاں تک چھوٹی حیثیت کی بورژوازی، یعنی دستکاروں اور دوکانداروں کا تعلق ہے، یہ کبھی نہیں بدلنے والے۔ انہیں امید رہتی ہے کہ جھوٹ یا سچ کیسے بھی بڑھ کر بڑی بورژوازی میں مل جائیں گے؛ ڈر لگتا ہے کہ نیچے گر کر کہیں پرولتاریہ میں نہ پہنچ جائیں۔ امید اور خوف کے درمیان ڈولتے ہوئے یہ لوگ، جب بھی رن پڑے گا اپنی چیمپتی کھال بچانے کی فکر میں رہیں گے اور لڑائی کے بعد جیتنے والے کے ساتھ ہو لیں گے۔ یہی ہے ان کی فطرت۔

۱۸۴۸ء سے جس رفتار سے صنعت بڑھتی جاتی ہے اسی رفتار سے پرولتاریہ کی سماجی اور سیاسی سرگرمیاں بھی بڑھ رہی ہیں۔ آج ٹریڈیونینوں میں، کوآپریٹو سوسائٹیوں میں، سیاسی انجمنوں اور جلسوں میں، چناؤ اور رائے ستاگ (پارلیمنٹ) نام کے ایوان میں جرمن مزدور جو رول ادا کر رہے ہیں وہ اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ جرمنی پچھلے بیس برسوں میں قطعی طور سے کتنا کچھ بدل گیا ہے۔ جرمن مزدوروں کو اس بات کی داد ملنی چاہئے کہ مزدوروں اور مزدور نمائندوں کو پارلیمنٹ میں بھیجنے کی کامیابی صرف انہی کو نصیب ہوئی۔ یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو آج تک نہ تو فرانسیسی دکھا سکے، نہ انگریز۔ لیکن پرولتاریہ بھی ابھی تک ۱۸۴۵ء والی متوازی لائنوں سے باہر نہیں نکل سکا۔ ساری عمر صرف محنت مزدوری پر بسر کرنے والے اس طبقے کو بھی جرمن آبادی کی اکثریت بننے میں بہت دیر ہے۔ اس لئے وہ بھی اپنے حلیف ڈھونڈھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ حلیف چھوٹی بورژوازی میں، شہروں کے آوارہ گرد پیشہ وروں (lumpenproletariat) میں، چھوٹے کسانوں اور کھیت مزدوروں میں ہی مل سکتے ہیں۔

چھوٹی بورژوازی کے لوگ، جس کا ذکر اوپر کیا ہے، بالکل بھروسے قابل نہیں ہوتے، سوائے اس وقت کے جب لڑائی فتح ہو چکی ہو؛ تب وہ تاڑی خانوں میں بیٹھ کر بے پناہ شور مچاتے ہیں۔ پھر بھی انہی لوگوں میں نہایت اعلا درجے کے لوگ ملیں گے جو خود اپنی مرضی سے مزدوروں کا ساتھ دیتے ہیں۔

سبھی طبقوں کے اجڑے ہوئے لوگوں کا یہ بہنگم کوڑا کرکٹ جو آوارہ گرد پیشہ وروں کے نام سے، خاص کر بڑے بڑے شہروں میں اکٹھا ہو جاتا ہے، جتنے حلیف مل سکتے ہیں ان سب میں بدتر یہی ہے۔ یہ ہزاری ہزاری لوگ کرائے کے ٹٹو اور بالکل بے غیرت ہوتے ہیں۔ اگر فرانسیسی مزدوروں نے ہر ایک انقلاب کے موقع پر مکانوں کی دیواروں پر یہ لکھ کر لگا دیا کہ «Mort aux voleurs» — ”چور، اچکے، مردہ باد!، بلکہ بعض کو تو گولی سے بھی اڑا دیا تو یہ اس وجہ سے نہیں کہ مال و متاع کا بڑا پاس تھا، بلکہ انہوں نے ٹھیک ہی سوچا کہ سب سے مقدم اس گروہ سے نجات پانا ضروری ہے۔ مزدوروں



کا جو بھی لیڈر ان پاجیوں کو نگرانی کے کام پر لگاتا ہے یا ان کی مدد پر بھروسہ کرتا ہے وہ اپنی اسی حرکت سے خود کو تحریک کا غدار ثابت کر دیتا ہے۔

رہے چھوٹے کسان تو وہ کئی طرح کے ہوتے ہیں (بڑے کاشتکار بورژوازی کے ساتھ جاتے ہیں) ان میں یا تو جاگیرداری کسان ہیں اور ابھی تک اپنے ان داتا، مالک کے لئے بیگار بھرتے رہتے ہیں۔ چونکہ ان لوگوں کو نیم غلامانہ کسانوں سے چھٹکارا دلانے میں بورژوازی نے اپنا فرض ادا نہیں کیا، اس لئے انہیں یہ یقین دلانا مشکل نہیں ہوتا کہ صرف مزدور طبقے کے ہاتھوں ہی ان کے بندھن ٹوٹ سکتے ہیں۔

یا پھر مزارع (جو زمیندار سے زمین لے کر کاشت کرتا ہے)۔ اس صورت میں بہت کچھ آئرلینڈ کا سا حال ہے۔ لگان یا کرائے اتنے بڑھ چکے ہیں کہ اوسط درجے کی فصل سے کسان اور اس کا کنبہ بمشکل اپنا پیٹ پال سکتا ہے۔ فصل بگڑ جائے تو روٹی کے لالے پڑ جاتے ہیں، لگان بھی نہیں بھر پاتا اور انجام یہ کہ زمیندار کے رحم و کرم پر رہ پڑتا ہے۔ بورژوازی ایسے لوگوں کے لئے کچھ بھی نہیں کرتی جب تک کہ کرنے پر مجبور نہ ہو جائے۔ تب وہ اپنی گلوخلاصی کے لئے مزدوروں سے آس نہ لگائیں تو کس سے لگائیں؟ اب چھوٹی موٹی کاشت کے خود کاشت والے کسان کو لیجئے۔

اکثر تو ان پر رهن ناموں (۸۸) کا اتنا بوجھ لدا ہوتا ہے کہ سودخوار مہاجنوں کے ہاتھ میں وہ بھی اتنے ہی بے بس ہیں جتنے مزارع مالک زمین کے ہاتھ میں۔ لے دے کر ان کے لئے تھوڑی سی مزدوری رہ جاتی ہے۔ اوپر سے یہ کہ کسی سال فصل اچھی ہوئی تو کسی سال بگڑ گئی، جس کے باعث مزدوری کی یہ حقیر آمدنی بھی کچھ پکی نہیں ہوتی۔ ان لوگوں کو بورژوازی کا آسرا ہو بھی تو کیا ہو، کیوں کہ بورژوازی، یہی سرمایہ دار سودخوار ہیں جو اس کی شہرگ کا لہو چوس لیتے ہیں۔ پھر بھی ان میں سے زیادہ تر کاشتکار اپنی زمین جائداد سے چمٹے رہتے ہیں، حالانکہ سچ پوچھیے تو وہ ان کی

نہیں، سود خوار مہاجن کی ملکیت ہوتی ہے۔ ان خودکاشت کسانوں کو یہ ذہن نشین کرانا پڑے گا کہ سودخوار کے پنجے سے صرف اسی صورت میں رہائی مل سکتی ہے جب سرکار عوام کے سہارے کھڑی ہو کر ہر ایک رهن نامے کو سرکاری قرضے میں بدل ڈالے اور اس طرح سود کی شرح گرا دے۔ اور یہ بات مزدور طبقے کے کئے ہی ہو سکتی ہے۔

جہاں جہاں اوسط درجے یا بڑے پیمانے کی جاگیریں حاوی ہیں، وہاں دیہات میں کھیت مزدوروں کا طبقہ آبادی میں سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ پورے شمالی اور مشرقی جرمنی کا یہی حال ہے۔ اور یہیں سے شہر کے صنعتی مزدوروں کو اپنے سب سے کثیر تعداد اور سب سے قدرتی حلیف میسر آتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جیسے سرمایہ دار کو صنعتی مزدور کا سامنا ہے، جاگیردار یا بڑے کاشتکار کے مقابل کھیت مزدور کھڑا ہے۔ وہی تدبیریں جو ایک کے کام آتی ہیں، دوسرے کا بھلا کریں گی۔ صنعتی مزدور خود اپنا بوجھ اتارنے کی تدبیر صرف یہی کرتے ہیں کہ بورژوازی کے سرمائے کو، یعنی کچے مال کو، مشینوں اوزاروں کو، اور گزراوقات کے اس سامان کو، جو پیداوار کے کام میں انہیں درکار ہوتا ہے، پورے سماج کی ملکیت بنا ڈالیں، یا یوں کہیے کہ خود اپنی ملکیت جسے وہ مل جل کر استعمال کریں۔ اسی طرح کھیت مزدور بھی مصیبت کے اس شکنجے سے تبھی نکالے جاسکتے ہیں جب اول وہ چیز جس پر ان کی محنت لگتی ہے، یعنی خود زمین ہی بڑے کاشتکاروں اور ان سے بھی بڑے تعلقدار جاگیرداروں کی ذاتی ملکیت کے بندھن سے چھڑا کر عام ملکیت میں تبدیل کردی جائے اور کھیت مزدوروں کے سپرد کردی جائے کہ وہ کوآپریٹو سوسائٹیوں کی صورت میں مل جل کر اپنے طور پر کاشت کریں۔ یہاں ہمارے سامنے بازل میں ہونے والی انٹرنیشنل ورکنگ سینٹر کانگریس کا مشہور فیصلہ آتا ہے جس کے مطابق طے پایا تھا کہ زمین جائداد کو مشترکہ قومی ملکیت بنانے میں سماج کا بھلا ہے (۹۸)۔ یہ تجویز خاص کر ان ملکوں کے بارے میں پاس ہوئی تھی جہاں بڑی بڑی زمین جائداد کا رواج ہے، نتیجہ یہ کہ ان جاگیروں



پر ایک تو صاحب جائداد ہوتا ہے اور بہت سے مزدور - آج بھی بڑی حد تک جرمنی میں یہی صورت حال قائم ہے - لہذا، انگلینڈ کے فوراً بعد جرمنی کا ہی نمبر آتا ہے جس کے متعلق یہ فیصلہ نہایت بروقت ہے - زمین پر کام کرنے والا پرولتاریہ، کھیت مزدور ہی وہ ایک طبقہ ہے جس کے اندر سے راجاؤں کی فوج کا بڑا حصہ بھرتی کیا جاتا ہے - اور یہی وہ طبقہ ہے کہ عام رائے دہندگی کے حق کی بدولت بہت سے جاگیرداروں اور یونکروں کو چن کر پارلیمنٹ میں بھیج دیتا ہے - لیکن یہ وہ طبقہ بھی ہے جو شہر کے صنعتی مزدوروں کے سب سے زیادہ نزدیک ہے، انہی کے سے حالات میں زندگی بسر کرتا ہے اور ان سے بھی بدتر مصیبتوں کا شکار رہتا ہے - یہ طبقہ جو ٹکڑوں میں بٹے ہوئے اور بکھرے ہوئے کے کارن بیجان پڑا ہے، اس طبقے میں پھر سے جان ڈالنا اور تحریک میں کھینچ لانا جرمن مزدور تحریک کا فوری اور سب سے ضروری فرض ہے - حکومت اور جاگیردار شرفا اس طبقے کی درپردہ طاقت سے اس قدر باخبر ہیں کہ اسکولوں کو جان بوجھ کر خستہ حالت میں ڈالے رہتے ہیں تاکہ یہ کھیت مزدور جاہل کے جاہل رہیں - جس دن کھیت مزدور اپنے فائدے کی بات سمجھنا سیکھ لیں گے، اس روز جرمنی میں رجعت پرست - جاگیردارانہ، نوکرشاہی یا سرمایہ دارانہ حکومت کا رہنا ناممکن ہو جائے گا۔

اینگلز نے ۱۱ فروری ۱۸۷۰ء کے قریب لکھا۔

اصل مسودے کے مطابق شائع کیا گیا۔

لیپزگ سے، اکتوبر ۱۸۷۰ء میں ”جرمنی میں کسانوں کی جنگ“ کے دوسرے ایڈیشن میں شائع ہوا۔

## ۱۸۷۰ء کے تیسرے ایڈیشن کے لئے ۱۸۷۰ء والے دیباچے کا تکملہ

پہلے والے دیباچے کا مضمون لکھے ہوئے چار سال سے زیادہ ہو گئے - وہ آج بھی کارآمد ہے - سادووا کی لڑائی اور جرمنی کی تقسیم کے بعد جو بات صحیح نکلی تھی، آج سیدان کی لڑائی (۵۰) اور پروشیائی قوم کی مقدس جرمن سلطنت قائم ہو جانے (۵۱) کے بعد اس کی تصدیق ہو رہی ہے - نام نہاد اونچی سیاست کے میدان میں ”دنیا کو ہلا دینے والے“، شاندار تماشے بھلا تاریخ کے بہاؤ کو کہاں بدلتے ہیں!

لیکن ہاں یہ شاندار تماشے اتنا ضرور کر سکتے ہیں کہ تاریخ کا یہ بہاؤ اور تیز کر دیں - اور اس معاملے میں مذکورہ ”دنیا کو ہلا دینے والے واقعات“ کے جنم داتاؤں کو وہ کامیابی نصیب ہوئی جس کی نہ تو خود انہوں نے آرزو کی تھی اور نہ اب وہ کسی طرح انہیں پسند آسکتی ہے، مگر، اچھا ہو یا برا، بہر حال قبول کرتے ہی بنے گی۔

۱۸۶۶ء کی جنگ نے پرانے پروشیا کی جڑ بنیاد تک ہلا دی - ۱۸۴۸ء کے بعد، مغربی صوبوں کے سرکش صنعتی عناصر کو، بورژوازی اور پرولتاریہ دونوں کو ہی، پھر سے پرانے رعب داب میں رکھنا اس کے لئے بہت کٹھن ہو چلا تھا - پھر بھی یہ معرکہ سر کر لیا گیا، اور مشرقی صوبوں کے یونکروں کا مفاد، فوج کے مفاد سے کاندھا ملا کر، ساری اسٹیٹ پر پھر سے مسلط ہو گیا ہے - ۱۸۶۶ء میں قریب قریب تمام شمالی مغربی جرمنی پروشیائی ہو گیا - خدا کے فضل سے دوسروں کے تین تاج \* اچک لینے کے باعث خود پروشیا کے تاج کو خدا کے فضل سے جو ناقابل تلافی اخلاقی صدمہ پہنچا، اس کے علاوہ یہ

\* ہنویر، ہیسے کاسیل، نساؤ - (ایڈیٹر)



بھی ہوا ہے کہ بادشاہی کا مرکز ثقل اب بہت دور پیچہم کی طرف کھسک گیا۔ رائن لینڈ اور ویسٹ فالیہ کے پچاس لاکھ باشندوں میں وہ چالیس لاکھ جرمن اور جرّ گئے تھے جنہیں سیدھے سیدھے ان میں ملا دیا گیا اور وہ ساٹھ لاکھ بھی جنہیں بالواسطہ شمالی جرمن یونین (۵۲) کا نام لے کر انہی میں ضم کر دیا گیا۔ ۱۸۷۰ء میں ۸۰ لاکھ جنوب مغربی جرمن اور ان میں جوڑے گئے (۵۳)۔ اس طرح کہ ”نئے رائیج“، (نئی جرمن ریاست) میں ایک کروڑ پینتالیس لاکھ پرانے پروشیائیوں کے مقابلے میں (جس میں چھ مشرقی ایلبا صوبوں کی آبادی کے علاوہ بیس لاکھ پولینڈوالے بھی شامل ہیں) کوئی دو کروڑ پچاس لاکھ وہ لوگ موجود ہیں جو ایک زمانہ پہلے ہی پرانے وقتوں کی پروشیائی یونکر جاگیرداری کے اثر سے باہر نکل چکے ہیں۔ چنانچہ خود پروشیائی فوج کی فتوحات نے پروشیا کے پورے ریاستی ڈھانچے کی بنیاد اپنی جگہ سے ہلادی ہے۔ یونکروں کا دباؤ خود گورنمنٹ کے لئے ناقابل برداشت ہو گیا۔ لیکن چوں کہ ساتھ میں صنعتی ترقی کی رفتار بہت تیز تھی تو نتیجہ یہ ہوا کہ سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان کشمکش نے بڑھ کر یونکروں اور بورژوازی کے درمیان کشمکش کو پیچھے ڈال دیا۔ اور اس طرح اندر سے بھی پرانی اسٹیٹ کی سماجی بنیاد کی پوری کایا پلٹ ہو گئی۔ بادشاہی جسے ۱۸۴۰ء سے ہی گھن لگ چکا تھا، اس کے بجے رہنے کی ایک ہی بنیادی شرط تھی کہ جاگیرداری اشرافیہ اور بورژوازی میں تنانتی چلتی رہے اور توازن بادشاہی کے ہاتھ میں رہے۔ جب اشرافیہ کو بورژوازی کی یلغار سے بچاؤ کی کچھ ضرورت نہ رہ گئی اور یہ لازم قرار پایا کہ تمام صاحب جائداد طبقوں کو مزدور طبقے کی چڑھائی سے بچانے کا انتظام کیا جائے تو پرانی مختار کل بادشاہت کو اسٹیٹ کے اس روپ میں پوری طرح بدل جانا پڑا جو خاص اسی غرض سے وضع کیا گیا تھا۔ اور یہ تھی بوناپارٹ والی بادشاہی۔ پروشیا کا بوناپارٹ کے طرز کی حکومت میں بدل جانا میرے یہاں دوسری جگہ زیر بحث آیا ہے (”رہائش کا مسئلہ“، دوسرا ایڈیشن)۔ مجھے جس نکتے پر وہاں زور دینے کی ضرورت نہ تھی یہاں اس کی اہمیت بڑی ہے، وہ یہ کہ

۱۸۴۸ء سے پروشیا نے جتنی کچھ ترقی کی اس میں یہ تبدیلی ہی سب سے بڑا قدم تھی۔ جدید طرز کی ترقی میں پروشیا اس قدر پیچھے رہ گیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ پروشیا ابھی تک ایک نیم جاگیردارانہ اسٹیٹ رہی ہے جہاں بوناپارٹ ڈھنگ کی حکومت چاہے کچھ بھی سمی، ایک جدید طرز حکومت ہے اور اس کے دم قدم سے جاگیرداری کا خاتمہ ہونا یقینی ہوگا۔ لہذا پروشیا کو جاگیرداری کے بہت سارے باقیات سے جان چھڑانا اور یونکر شاہی کو قطعی قربان کرنا پڑا ہے۔ قدرتی امر ہے کہ یہ کام نہایت دے دے اور اس پسندیدہ قول کے مطابق کیا گیا کہ: ”ہمیشہ دھیرے دھیرے آگے بڑھو“۔ مثلاً وہ بدنام زمانہ ضلع آرڈی نینس لیجئے۔ یہ آرڈی نینس الگ الگ یونکروں کے جاگیردارانہ اختیارات کا ان کی اپنی جاگیر کے تعلق سے تو خاتمہ کرتا ہے لیکن انہی اختیارات کو پورے ضلع کے سبھی بڑے جاگیرداروں کے مجموعی اختیارات کے طور پر پھر بحال کر دیتا ہے۔ بات وہی رہی۔ صرف اتنا ہے کہ جاگیرداری کے بجائے اب اس کا سرمایہ داری چولا رنگ دیا جاتا ہے۔ پرانے وقتوں کا پروشیائی یونکر زبردستی کچھ ویسا بنایا جا رہا ہے جیسے انگریز اسکوائر (صاحب بہادر) اور اس میں فیل مچانے یا چوں چرا کرنے کی کیا ضرورت تھی کیوں کہ دونوں ایک ہی طرح الٹی کھوپڑی کے ہیں۔

اس طرح پروشیا کی عجیب قسمت نکلی کہ وہ بورژوائی انقلاب کو، جو ۱۸۰۸ء سے ۱۸۱۳ء تک شروع ہوا، پھر ۱۸۴۸ء میں ایک حد تک آگے بڑھا، آخر بوناپارٹ طرز کی سہانی صورت میں اس صدی کے آخر تک انجام کو پہنچائے۔ اگر سب کچھ ٹھیک رہا، دنیا میں سکھ چین بنا رہا، اور ہم لوگ بھی دیر تک جیتے رہے تو اپنی آنکھوں دیکھ لیں گے، شاید ۱۹۰۰ء تک دیکھنا نصیب ہو جائے کہ پروشیا کی سرکار سبھی جاگیرداری اداروں کا صفایا کر دے گی اور ہوتے ہوئے پروشیا وہاں پہنچ جائے گا جہاں فرانس ۱۷۹۲ء میں پہنچ چکا تھا۔ جاگیرداری کے خاتمے کو اگر مثبت طریقے سے کہا جائے تو مطلب یہ کہ سرمایہ دارانہ حالات کا قائم کیا جانا۔ جاگیرداری اشرافیہ کے خاص اختیارات کو جتنا زوال آتا جائے گا، قانون سازی اتنا



ہی سرمایہ دارانہ رنگ پکڑتی جائے گی۔ اور یہیں جرمن بورژوازی اور حکومت کے باہمی تعلق پر کانٹے کی بات آتی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ گورمنٹ ان چھوٹی چھوٹی معمولی سی اصلاحوں کو نافذ کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ تاہم بورژوازی کے ساتھ بیوہار میں ان چھوٹی سی رعایتوں کو بھی یوں بڑھا چڑھا کر دکھاتی ہے گویا بورژوازی کے حق میں ہی کوئی بڑی قربانی دے دی، گویا صاحب تاج و تخت کے ہاتھ سے یہ رعایت بمشکل تمام چھینی گئی ہے، جس کے بدلے میں گورمنٹ کے سامنے بورژوازی کو بھی کہیں مٹھی ڈھیلی کرنی چاہئے۔ اور اگرچہ معاملات کی اصلیت بورژوازی پر بالکل کھلی ہوئی ہے، پھر بھی خود کو بے وقوف بننے دیتی ہے۔ یہیں سے اس ملی بھگت کا پتہ چلتا ہے جو برلن میں رائخ ستاگ اور پروشیائی ایوان کی بحثوں کی تہہ میں درپردہ کارفرما ہے۔ ایک طرف یہ ہو رہا ہے کہ حکومت بورژوازی کی خاطر قانونوں کی اصلاح میں بہت آہستہ قدم اٹھا رہی ہے، ان جاگیردارانہ رکاوٹوں کو ہٹا رہی ہے جو صنعت کی راہ میں، یا بہت ساری چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے کارن کھڑی ہوئی تھیں، سکھ، ٹکسال، ہاٹ ترازو ناپ کو یکساں کر رہی ہے، پیشے کی آزادی دیتی ہے، ایک جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ جانے کی آزادی مان کر جرمنی کی قوت محنت کو بے روک ٹوک سرمائے کے سپرد کرتی ہے، تجارت اور بے ایمانی کی کمائی کی طرفدار ہے۔ دوسری طرف بورژوازی نے اصلی سیاسی طاقت گورمنٹ کے ہاتھ میں چھوڑ رکھی ہے، ٹیکسوں، سرکاری قرضوں اور فوجی بھرتی کے حق میں ووٹ دیتی ہے، تمام نئے اصلاحی قانون بنوانے میں کچھ اس صورت سے مدد کرتی ہے کہ ناپسندیدہ لوگوں پر پورا اختیار، طاقت اور اثر اسی پرانی پولیس کے ہاتھ میں باقی رہ جائے۔ سرمایہ دار طبقہ سیاسی طاقت سے فوراً دست برداری لکھ کر اپنی رفتہ رفتہ سماجی خیریت کے دام چکا رہا ہے۔ قدرتی بات ہے کہ بورژوازی کے اس لین دین پر راضی ہونے کی اصل وجہ یہ نہیں کہ وہ گورمنٹ سے ڈرتی ہے بلکہ دراصل پرولتاریہ کا خوف اس پر طاری ہے۔ سیاسی میدان میں سرمایہ دار طبقہ چاہے کتنا ہی بے آبرو ہو چکا ہو لیکن انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جہاں تک صنعت اور تجارت

کا تعلق ہے، آخر وہ اپنا فرض ادا کئے جا رہا ہے۔ صنعت اور تجارت کی وہ تیز رفتار ترقی جس کا دوسرے انڈیشن کے دیباچے میں ذکر آچکا ہے\*، تب سے اور بھی زوروں میں جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں رائن اور ویسٹفاليا کے صنعتی حلقے میں ۱۸۶۹ء سے اب تک جو کچھ ہوا ہے، وہ جرمنی کے لئے انہونی بات ہے، اسے دیکھ کر انگلستان کے کارخانے والے ضلعوں میں اس صدی کے شروع میں جو بہت ابھار آیا ہوا تھا اس کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ یہی بات سیکسونیا، شمالی سائلیشیا، برلن، ہنوویر، اور بندرگاہوں کے بارے میں صادق آتی ہے۔ آخر اب ہم بھی عالمی تجارت رکھتے ہیں، واقعی ایک بڑی صنعت موجود ہے اور واقعی جدید طرز کی بورژوازی بھی ہے۔ لیکن اس کے بدلے میں ہمارے یہاں بھی ایک سچ سچ کا بحران آچکا ہے اور اسی طرح یہاں بھی صحیح معنوں میں ایک طاقتور پرولتاریہ کا ظہور ہو چکا ہے۔

آئندہ کا مورخ ۱۸۶۹ء سے ۱۸۷۴ء کے دور کی جرمن تاریخ میں شبی خیرن، مارسلاتور (۵۴) اور سیدان کی جنگوں کے شور پکار کو اور ان سے جتنی بھی باتیں متعلق ہیں ان سب کو بہت کم حیثیت دے گا بمقابلہ جرمن پرولتاریہ کے اس بے نام و نمود، چپ چاپ مگر مستقل بڑھتے ہوئے قدم کے۔ ۱۸۷۰ء میں ہی جرمن مزدوروں کو سخت امتحان سے گزرنا پڑا: بونا پارٹ کی طرف سے جنگی اشتعال دلایا گیا، پھر اس کا قدرتی اثر ہوا کہ جرمنی میں قومی جوش کی لہر دوڑ گئی۔ جرمنی کے اشتراکی مزدوروں نے خود کو دم بھر کے لئے گمراہ نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے قومی عصبیت کے سیلاب سے خود کو بچائے رکھا۔ جب فتح حاصل ہونے پر خوشی کے مارے لوگ دیوانے ہوئے جا رہے تھے ایسے وقت میں جرمن اشتراکی مزدوروں نے اپنے حواس قائم رکھے اور یہ مانگ کی کہ ”فرانسسی رپبلک کے ساتھ انصاف کی صلح کی جائے اور کوئی علاقہ چھین کر نہ ملایا جائے“، یہاں تک کہ فوجی عملداری (مارشل لا) بھی ان کی زبان بند نہ کر سکی۔ ان پر نہ تو جنگی شان و شکوہ

\* دیکھئے اس ایڈیشن کا حصہ دوم، صفحات ۱۱۲-۱۰۱۔ (ایڈیٹر)



کا کچھ اثر ہوا، نہ جرمنی کی ”شاہانہ عظمت“ کی باتوں کا۔ اب بھی ان کی ایک ہی منزل مقصود تھی کہ سارے یورپی پرولتاریہ کے سر کا بوجھ اتارا جائے۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آج تک کسی اور ملک میں نہ تو مزدوروں کو اتنی کڑی آزمائش کا سامنا کرنا پڑا اور نہ وہ اس شان سے اپنی ذمہ داری ادا کر سکے۔

جنگ کے زمانے میں مارشل لا کے بعد وطن دشمنی، سرکار دشمنی، افسروں کی توہین کے الزام میں مقدمے چلائے گئے اور پولیس کی وہ قانونی پینترے بازی جو امن کے زمانے میں ہوا کرتی ہے، برابر بڑھتی گئی۔ عام طور سے »Volksstaat« (عوامی ریاست) (۵۵) اخبار کے تین اور چار ایڈیٹر تک بیک وقت جیل میں رہنے لگے اور اسی طرح دوسرے اخباروں کے بھی۔ پارٹی کی طرف سے کوئی بولنے میں زرا بھی نمایاں ہوتا تو سال میں کم از کم ایک بار عدالت میں حاضری دینی پڑتی اور ہر بار سزا ہو جاتی۔ جلاوطنی، ضبطی اور جلسوں کا توڑا جانا یہ سب ایک کے بعد ایک بے تحاشا بڑھتا گیا۔ مگر سب رائنگل۔ جب بھی کوئی گرفتار ہوتا یا جلاوطن کیا جاتا تو اس کی جگہ بھرنے کے لئے فوراً دوسرا سامنے آ جاتا تھا۔ اگر ایک میٹنگ توڑی جاتی تو اس کے بدلے دو میٹنگیں طلب کی جاتیں اور اس طرح پولیس کی یکطرفہ زبردستی، قوت برداشت اور سخت قانونی پاس و لحاظ کے مقابلے میں جا بجا تھک ہار کر بیٹھ رہی۔ ظلم و زیادتی کا جو مقصد تھا، وہ الٹا پڑا: مزدوروں کی پارٹی کے ٹوٹنے یا جھکنے کی تو نوبت کیا آتی، ہوا یہ کہ اس کی بدولت اور نئے لوگ پارٹی میں داخل ہوتے گئے اور تنظیم پہلے سے بھی مضبوط ہو گئی۔ مزدوروں نے ارباب اختیار کے مقابلے میں اور الگ الگ سرمایہ داروں سے مقابلہ کرنے میں بھی خود کو ذہنی اور اخلاقی لحاظ سے بلند و برتر ثابت کر دکھایا اور وہ جو ”روزگار دینے والے“، یعنی مالک لوگ کہلاتے ہیں، خاص طور سے ان کے ساتھ ٹکراؤ میں تو یہ بھی ثبوت دے دیا کہ مزدور اب ایک تعلیم یافتہ طبقہ ہیں اور سرمایہ دار کوڑھ مغز۔ وہ اپنی لڑائی بھی زیادہ تر ہنستے کھیلتے چلاتے ہیں جو بہت عمدہ ثبوت ہے اس بات کا کہ اپنے حق پر انہیں کتنا بھروسہ ہے اور اپنی برتری کا کس قدر اعتبار

ہے۔ وہ زمین جو تاریخی لحاظ سے تیار ہو چکی ہے جب اس پر یوں سنگھرش چلے تو ظاہر ہے کہ نتیجہ بھی اچھا ہی نکلے گا۔ جنوری کے سپینے میں ہونے والے الکشنوں کی کامیابی آج کے مزدوروں کی تحریک میں اپنی کوئی مثال نہیں رکھتی (۵۶) اور سارا یورپ جو اس پر حیرت سے منہ تکتا رہ گیا، وہ بھی بالکل برحق تھا۔

جرمن مزدوروں کو باقی یورپ کے مزدوروں پر دو اہم سہولتیں حاصل ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ ایسی قوم سے تعلق رکھتے ہیں جو یورپ کی سب سے زیادہ نظریاتی قوم ہے اور انہوں نے نظریے کی وہ سوچ بوجھ سنبھال کر رکھی ہے جسے جرمنی میں نام کے ”تعلیم یافتہ“، طبقے اپنے ہاتھ سے قریب قریب دے چکے ہیں۔ اگر جرمن فلسفہ، خاص کر ہیگل کا فلسفہ نہ ہوتا تو دنیا کے تن تنہا سائنسی سوشلزم، یعنی جرمن سائنٹفک سوشلزم کا وجود ہی نہ ہونے پاتا۔ اگر مزدوروں میں نظریے کی سوچ بوجھ نہ ہوتی تو وہ سائنسی سوشلزم ان کے گوشت پوست کا حصہ نہ بن سکتا جیسا کہ وہ بن چکا ہے۔ یہ کتنی بڑی سہولت ہے اس کا اندازہ ایک طرف تو اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انگلینڈ کی مزدور تحریک، الگ الگ پیشوں میں شاندار تنظیم رکھنے کے باوجود چیونٹی کی چال سے چل رہی ہے تو اس کا ایک بڑا کارن یہی ہے کہ اسے نظریے کی کچھ زیادہ پروا نہیں، دوسری طرف اس بات سے کہ پرودھوں فلسفی کے خیالات نے اپنی اصلی شکل میں فرانس اور بلجیم والوں کے درمیان اور باکونین کے ہاتھوں اور زیادہ مسخ ہونے کے بعد اسپین اور اٹلی والوں میں کیا کچھ فتنے برپا کئے ہیں اور کتنی الجھنیں ڈال دی ہیں۔ دوسری سہولت یہ کہ زمانے کے حساب سے دیکھئے تو مزدور اندولن میں جرمن سب کے بعد آئے۔ جس طرح جرمنوں کا نظریاتی سوشلزم یہ کبھی نہیں بھول سکتا کہ وہ سین سائمن، فورے، اور رابرٹ اووین کے، یعنی ان تین آدمیوں کے کاندھوں پر کھڑا ہے جو اپنی پرواز تخیل اور ہوائی قلعوں کے باوجود، ہر زمانے کے سب سے عظیم مفکروں میں اپنا مقام رکھتے ہیں، جن کی فراست نے ایسی بے شمار باتوں کو وقت سے پہلے جتا دیا تھا جن کی سچائی آج ہم علمی طریقے سے ثابت کر رہے ہیں، اسی طرح جرمنی میں عملی مزدور تحریک



کو یہ کبھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ وہ انگلینڈ اور فرانس کی مزدور تحریکوں کے بل پر بڑھی ہے، جو تجربے ان کو سہنگے پڑ چکے تھے، اسی سے جرمن تحریک نے فیض اٹھایا ہے اور اب ان غلطیوں سے اپنا دامن بچا سکتی ہے جن سے بچنے کی تب زیادہ تر کوئی صورت نہ تھی۔ انگریزی ٹریڈ یونینوں اور فرانسیسی مزدوروں کے سیاسی سنگھرشوں، خاص کر پیرس کمیون کی زبردست چوٹ کی مثال ہماری نظر کے سامنے نہ ہوتی تو آج ہم کہاں ہوتے؟

جرمن مزدوروں کو اس بات کی داد ملنی چاہئے کہ انہوں نے اپنے موقع کی سہولت کا بے مثال سمجھداری سے استعمال کیا ہے۔ جب سے مزدور تحریک کا وجود ہے تب سے پہلی بار جدوجہد تینوں پہلوؤں پر: نظریاتی، سیاسی اور عملی لحاظ سے معاشی (یعنی سرمایہ داروں کے مقابلے میں) ایک تال میل، باہمی ربط ضبط اور باقاعدہ طریقے سے چلائی جا رہی ہے۔ کہنا چاہئے کہ جرمن تحریک کی طاقت اور اس کا اٹوٹ ہونا خاص اسی ایک بھرپور حملے میں پوشیدہ ہے۔

ایک سمت سے تو اپنے موقع کی سہولت کی بدولت، اور دوسری سمت سے کچھ تو یوں کہ انگریزوں کی تحریک میں جزیرہ بند خصوصیات ہیں اور کچھ یوں کہ فرانسیسی تحریک کو بزور طاقت کچلا گیا، آج جرمن مزدور، پرولتاری صف آرائی میں ہراول دستے کی جگہ کھڑا ہے۔ ابھی نہیں کہا جاسکتا کہ آئندہ واقعات کا رخ کیا ہوگا اور وہ کب تک انہیں اس عزت کے مقام پر رہنے دیں گے۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ جب تک جرمن پرولتاری اس حالت میں رہیں گے وہ اپنا منصب قابلیت کے ساتھ نبھائیں گے۔ اس کے لئے لازم ہے کہ جدوجہد اور پرچار کے ہر ایک میدان میں وہ اور دوگنا زور لگادیں۔ خاص طور سے لیڈروں کا فرض ہے کہ وہ تمام نظریاتی سوالوں میں اور گہری نظر پیدا کریں، دنیا کو دیکھنے کے پرانے طریقے سے جو بنے بنائے جملے انہیں وراثت میں ملے ہیں، ان گھسے پٹے جملوں کے اثر سے خود کو اور بھی آزاد کرتے رہیں اور اس بات کا برابر دھیان رکھیں کہ اب چوں کہ سوشلزم ایک سائنس بن چکا ہے لہذا اس کا تقاضہ ہے کہ اسے سائنس یا باضابطہ علم کی طرح برتا جائے، یعنی اس کا مطالعہ کیا جائے۔ اس

طرح جو زیادہ سے زیادہ بصیرت پیدا ہوگی اسے عام مزدوروں کے درمیان اور بھی جوش و خروش سے پھیلانا اور یوں پارٹی اور ٹریڈ یونین دونوں کی تنظیم کو زیادہ مضبوط گرہ لگانا، یہ ہوگا ان کا فرض۔ جنوری کے الکشنوں میں اشتراکیوں کو جو ووٹ ملے ہیں اگرچہ ان سے اچھی خاصی فوج بن سکتی ہے، پھر بھی وہ مزدور طبقے کی اکثریت بننے سے کوسوں دور ہیں۔ دیہات کی آبادی میں پروپیگنڈے سے بھی خاصی کامیابیاں ہوئی ہیں لیکن اس میدان میں ابھی کچھ کرنا باقی ہے۔ اس لئے ہمیں یہ بات گرہ میں باندھ لینی چاہئے کہ ہم مقابلے کو دھیما نہ کریں اور دشمن کے پنجے سے ایک شہر کے بعد دوسرا شہر، ایک چناؤ حلقے کے بعد دوسرا حلقہ چھینتے چلے جائیں۔ اصل نکتہ یہ ہے کہ اس انٹرنیشنل جذبے کو قائم اور صحیح سالم رکھیں جو کسی قسم کے اندھے قومی تعصب کو ابھرنے نہیں دیتا اور جو شوق سے ہر ایک پرولتاری تحریک کے بڑھتے ہوئے قدم لیتا ہے، چاہے یہ قدم کسی قوم نے بڑھائے ہوں۔ اگر جرمن مزدور اسی طرح بڑھتے رہے تو یہ کچھ ضرور نہیں کہ وہ تحریک کے سرگروہ بن کر سب سے آگے مارچ کریں، اس تحریک کی مصلحت بھی اس میں نہیں ہے کہ کسی ایک ملک کے مزدور سب کے سرگروہ اور آگے ہوں، لیکن ہاں وہ مزدور جدوجہد کی صف بندی میں ایک باعزت مقام پر ضرور کھڑے ہوں گے۔ وہ ایسے وقت میں ہتھیاروں سے لیس کھڑے ہوں گے جب یا تو اچانک کوئی گمبھیر مشکل کا وقت آجائے یا واقعات ایسا رخ اختیار کر لیں کہ جرمن مزدوروں کو اور زیادہ ہمت اور زیادہ اٹل ارادے اور طاقت سے کام لینا پڑے۔

لندن، پہلی جولائی ۱۸۷۳ء

فریڈرک اینگلز

اصل مسودے کے مطابق  
شائع کیا گیا۔

Friedrich Engels, «Der Deutsche Bauernkrieg». Leipzig, 1875  
کتاب میں چھپا گیا تھا۔



سے بڑے تاریخی واقعات کے مزاج، ان کے آثار اور اثر تاثیر کو ایسے وقت اپنی ذہنی گرفت میں لے لیا جب یہ واقعات ہماری نظروں کے سامنے چل رہے تھے اور انہیں گزرے ابھی کچھ عرصہ نہ ہوا تھا۔ آخری وجہ یہ کہ مارکس نے ان واقعات کے جو نتیجے پہلے سے جتا دئے تھے، آج بھی ہمیں جرمنی میں ان کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

پہلے خط میں جو بات کہی گئی تھی کیا وہ سامنے نہیں آگئی کہ اگر لوئی بوناپارٹ کے مقابلے میں جرمنی اپنا بچاؤ کرنے کی جنگ سے پھسل کر فرانسیسیوں کا علاقہ قبضانے میں مبتلا ہوا تو پھر وہ ساری مصیبتیں جو نام نہاد آزادی کی جنگ (۵۹) کے بعد اس کے سر پڑی تھیں وہ پھر نئے سرے اور زیادہ شدت کے ساتھ ٹوٹ پڑیں گی۔ کیا ہمیں بسمارک کی حکمرانی کے اور بیس سال نہیں بھگتنے پڑے؟ کیا ہنگامی قانون (۶۰) اور اشتراکیوں کو پھنسانے کی کارروائی نے پولیس کی ویسی ہی دھاندلی اور قانونی زور زبردستی عام نہیں کر دی تھی جو Demagogue لوگوں (۶۱) کے ساتھ روا رکھی جاتی تھی؟

اور کیا یہ پیش گوئی لفظ بلفظ پوری نہیں ہو گئی کہ الزاس لارین علاقے کو جرمنی میں ملانے کا اثر یہ ہوگا کہ ”فرانس مجبور ہو کر روس کی دھائی دے، اور علاقہ ملا لینے کے بعد جرمنی کو یا تو روس کا کھلے عام پیروکار بننا پڑے گا یا تھوڑی سی سہلت کے بعد اسے ایک اور جنگ کے لئے کمر بستہ ہونا پڑے گا؟ جنگ بھی کیسی؟ ”متحدہ سلاف اور رومن نسلوں سے نسلی جنگ،\*۔ کیا فرانسیسی صوبوں کو ادھر ملا لینے کے باعث فرانس کو روس کی گود میں نہیں پہنچا دیا گیا؟ کیا بسمارک نے پورے بیس سال تک زار روس کو خوش کرنے کی فضول کوششیں نہیں کیں؟ اور ان کوششوں میں اس پست سطح تک اتر گیا کہ چھوٹے سے پروشیا نے بھی ”یورپ میں اول نمبر کی طاقت، بننے سے پہلے ”روس مقدس“ کے قدسوں میں اتنا ماتھا نہیں رگڑا تھا۔ اور کیا ہمارے سر پر اب بھی ہر وقت جنگ کا خطرہ نہیں منڈلاتا رہتا ہے، کہ اگر وہ جنگ چھڑی

\* ملاحظہ ہو اسی جلد کا صفحہ ۱۵۶ - (ایڈیٹر)

کارل ماکس

## فرانس میں خانہ جنگی

### ۱۸۹۱ء کا فریڈرک اینگلز کا دیباچہ

مجھے پہلے سے خیال نہ تھا کہ ”فرانس میں خانہ جنگی“ پر انٹرنیشنل کی جنرل کونسل کے خط کا نیا ایڈیشن تیار کرنے کو اور اس پر دیباچہ لکھنے کو مجھ سے کہا جائے گا۔ چنانچہ میں یہاں نہایت اہم نکتوں پر مختصراً ہی کچھ کہہ سکوں گا۔

اوپر جس تفصیلی مضمون کا ذکر آیا ہے، اس کے دیباچے کی صورت میں جنرل کونسل کے ان دو مختصر خطوں کو استعمال کئے لیتا ہوں جو فرانس اور پروشیا کی جنگ کے بارے میں لکھے گئے تھے\*۔

پہلی وجہ تو یہ کہ ان دونوں میں سے دوسرا خط، جو خود بغیر پہلے کے پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکتا، اس کا حوالہ ”خانہ جنگی“ والے اصل مضمون میں آیا ہے۔ پھر ایک اور وجہ یہ کہ دونوں خط جن کا خاکہ بھی مارکس کے قلم کا ہی نتیجہ ہے، مصنف کی اس خداداد قابلیت کا غیر معمولی نمونہ ہونے میں ”خانہ جنگی“ والے مضمون سے کچھ کم درجہ نہیں رکھتے جو اول تو ”لوئی بوناپارٹ کی اٹھارویں برومیئر،\*\* میں ثابت ہو چکی، کہ مارکس نے کس خوبی اور صفائی

\* ملاحظہ ہو اسی جلد کے صفحات ۱۳۸-۱۴۱ اور ۱۵۹-۱۴۹۔ (ایڈیٹر)

\*\* ملاحظہ ہو حصہ اول، صفحات ۲۹۳-۱۵۰۔ (ایڈیٹر)



تو پہلے ہی دن والیان ریاست کے سارے پکے کئے ہوئے عہدنامے ہوا میں اڑ جائیں گے، ایسی جنگ ہوگی جس کے بارے میں کچھ بھی یقینی نہیں سوائے اس کے کہ نتیجہ قطعی غیر یقینی ہوگا، ایسی نسلی جنگ چھڑے گی جو ڈیڑھ یا دو کروڑ ہتھیار بند فوجیوں کے ہاتھوں پورے یورپ کو تباہی و بربادی کا نشانہ بنادے گی، اور اگر ابھی تک نہیں چھڑی ہے تو صرف اس لئے کہ بڑی بڑی فوجی طاقتوں میں جو سب سے مضبوط ہے، وہ بھی یہ سوچ کر گھبراتی ہے کہ نجانے یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے۔

اس لئے ہم پر یہ اور بھی فرض ہو گیا ہے کہ جرمن مزدوروں میں ۱۸۷۰ء کی انٹرنیشنل مزدور طبقے کی پالیسی کی دوراندیشی کے وہ روشن ثبوت عام کر دیں جو وہ بھولتے جارہے ہیں۔

جو بات میں نے ان دونوں خطوں کے بارے میں کہی ہے وہی ”فرانس میں خانہ جنگی“، والے اصل مضمون پر بھی صادق آتی ہے۔ پیرس کمیون کے آخری جانباز ۲۸ مئی کو بیلویل کی ڈھلوانوں پر اپنے سے زیادہ طاقتور فوج کے سامنے موت کے گھاٹ اتر گئے۔ اور صرف دو دن بعد ۳۰ مئی کو جنرل کونسل کے سامنے مارکس نے وہ مضمون پڑھ کر سنایا جس میں پیرس کمیون کا تاریخی مرتبہ، مختصر لفظوں، جاندار اشاروں لیکن ایسے پرمغز اور تہہ دار بیان اور خاص کر ایسی سچائی کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ اس موضوع پر جو بہت سا انبار لکھا جا چکا ہے، وہاں کہیں اس کا جواب نہیں ملتا۔

فرانس میں ۱۸۷۹ء کے بعد سے جو معاشی اور سیاسی ترقی ہوئی ہے، اس کی بدولت پچھلے پچاس سال سے پیرس کی ایسی پوزیشن ہو گئی ہے کہ وہاں ہونے والا کوئی انقلاب پرولتاری کردار لئے بغیر، یعنی اس کے بغیر نہیں رہ سکتا کہ پرولتاری طبقہ جو فتح کی راہ میں اپنا لہو بہاتا تھا وہ فتح کے بعد اپنے مطالبے آگے نہ بڑھائے۔ پیرس کے مزدور جس جس مقام پر ترقی کر کے پہنچتے گئے، اس کی نسبت سے دیکھا جائے تو ان کے مطالبے کم و بیش دھندلے بلکہ الجھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تاہم لے دے کے حاصل سب کا یہی نکلتا ہے کہ سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان طبقاتی تضاد کا خاتمہ کیا جائے۔ یہ صحیح

ہے کہ تب کسی کو خبر نہ تھی کہ طبقاتی تضاد کا یہ خاتمہ ہو تو کیوں کر ہو۔ پھر بھی خود یہ مانگ، چاہے اسے کتنے ہی بے ڈھنگے طریقے سے کیوں نہ پیش کیا گیا ہو، سماج کے موجودہ نظام کے لئے خطرے سے خالی نہیں تھی۔ اس مانگ کو پیش کرنے والے مزدور ابھی تک ہتھیار بند تھے۔ اس لئے مزدوروں سے ہتھیار رکھوا لینا اس بورژوازی کے لئے ایک غیبی حکم تھا جو اسٹیٹ کی باگ دوڑ سنبھالے ہوئے تھی۔ یہی سبب ہے کہ مزدوروں کے جیتے ہوئے ہر ایک انقلاب کے بعد ایک نئی کشمکش ہوتی تھی جس کا انت ہوتا تھا مزدوروں کی ہار پر۔

پہلی بار یہ واقعہ ۱۸۴۸ء میں ہوا۔ پارلیمنٹ میں فریق مخالف آزاد خیال بورژوازی نے کئی ایک دعوتیں کر ڈالیں تاکہ رائے دہندگی کے حق میں اصلاحوں پر لوگوں کو راضی کیا جائے اور اس طرح اپنی پارٹی کی بالادستی پکی کر لی جائے۔ گورنمنٹ سے کھینچاٹانی میں انہیں زیادہ سے زیادہ مجبور ہو کر عوام سے رجوع کرنا پڑا اور رفتہ رفتہ ان لوگوں کو آگے آنے کا موقع دیتے گئے جو بورژوازی اور چھوٹی بورژوازی میں ریڈیکل اور ریپبلکن خیالات رکھتے تھے۔ مگر ان کے پیچھے انقلابی مزدور کھڑے تھے اور ۱۸۳۰ء کے بعد سے (۶۲) ان انقلابی مزدوروں نے اتنی سیاسی خودمختاری حاصل کر لی تھی جو بورژوازی تو کیا، ریپبلکنوں کے بھی گمان سے باہر تھی۔ گورنمنٹ اور مخالف پارٹی میں سنکٹ پڑا تو مزدوروں نے گلی کوچوں میں ہتھیار سنبھال لئے۔ بادشاہ لوئی فلپ غائب ہو گیا اور اسی کے ساتھ رائے دہندگی کی اصلاح بھی ہوا ہو گئی۔ اس کی جگہ ایک ریپبلک اٹھنے لگی، واقعی ایسی ریپبلک جسے فتح مند مزدوروں نے خود ہی ”سماجی“، ریپبلک کا رنگ ڈھنگ دیا تھا۔ کسی کے ذہن میں یہ بات صاف نہ تھی کہ اس سماجی ریپبلک کی عملی صورت کیا ہوگی، خود مزدوروں کو بھی خبر نہ تھی۔ لیکن ان کے پاس ہتھیار تھے اور ریاست میں ان کی قوت بنی ہوئی تھی۔ اس لئے جیسے ہی ان بورژوازی ریپبلکنوں نے، جن کے ہاتھ میں اختیارات تھے، اپنے پاؤں جمے دیکھے تو سب سے پہلا نشانہ یہ تھا کہ مزدوروں کو نہتا کیا جائے۔ یہ



موقع ایسے ہاتھ لگا کہ مزدوروں کو جون ۱۸۴۸ء کی عام شورش میں باہر نکالا گیا۔ سبب یہ ہوا کہ ان سے وعدے کی صاف خلاف ورزی کی گئی اور اس کھلی بے ایمانی سے جو لوگ بے روزگار ہو گئے تھے انہیں دوردراز صوبے میں جلاوطن کر دینے کی ٹھانی۔ سرکار نے پہلے سے اہتمام کر رکھا تھا کہ وقت پر اس کی طاقت زبردست رہے۔ پانچ دن کی جاں بازانہ جنگ کے بعد مزدوروں کو شکست ہو گئی۔ اس کے بعد نہتے قیدیوں کے خون کی ایسی ہولی کھیلی گئی کہ روسی رپبلک پر زوال لانے والی خانہ جنگیوں کے بعد سے کبھی اتنا خون نہیں بہایا گیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب سرمایہ دار طبقے نے دکھا دیا کہ اگر پرولتاریہ اس کے مقابلے پر ایک علاحدہ طبقے کی حیثیت سے خود اپنے مفاد اور اپنی مانگیں لے کر اٹھنے کی جرات کرے، تو وہ پرولتاریہ سے کیسا جنونی اور بے رحمانہ انتقام لینے پر کمر بستہ ہو سکتا ہے۔ پھر بھی دیکھا جائے تو ۱۸۴۱ء میں بورژوازی پر جیسا جنون سوار ہوا اس کے مقابلے میں ۱۸۴۸ء کے خونی واقعات بچوں کا کھیل معلوم ہوں گے۔

بورژوازی کو اس کی ہاتھوں ہاتھ سزا بھی مل گئی۔ اگر ابھی پرولتاریہ میں فرانس کی حکومت سنبھالنے کا دم خم نہ تھا تو بورژوازی میں بھی نہیں تھا۔ کم سے کم اس دور میں تو سرمایہ دار طبقہ اس قابل نہیں تھا کیوں کہ اس میں اکثر کے دل بادشاہی طرز حکومت میں اٹکے ہوئے تھے، وہ تین شاہی خاندان والی پارٹیوں میں بٹے ہوئے تھے (۶۳) اور چوتھی رپبلکن پارٹی تھی۔ اندرونی چیقلش نے ایک منچلے لوئی بوناپارٹ کو یہ موقع دے دیا کہ حکم چلانے کے سارے تار، فوج، پولیس اور سرکاری انتظامی محکمے اپنے ہاتھ میں لے لے اور دوسری دسمبر ۱۸۵۱ء کو (۶۴) بورژوازی کے آخری گڑھ یعنی قومی اسمبلی کو ہی اس نے دھماکے سے اڑا دیا۔ فرانس کی دوسری سلطنت شروع ہوئی۔ یہ تھی فرانس کی لوٹ کھسوٹ سیاسی اور مالی ہاتھ مارنے والے ایک ٹولے کے ہاتھوں۔ لیکن ساتھ ساتھ صنعتی ترقی نے بھی وہ زور باندھا کہ لوئی فلپ کے اس ٹٹ پونجیا دور حکومت میں جہاں مٹھی بھر بڑے بڑے سرمایہ داروں کا گروہ سفید و سیاہ کا مالک و مختار بنا ہوا تھا،

ہرگز اتنی ترقی نہیں ہو سکتی تھی۔ لوئی بوناپارٹ نے سیاسی طاقت سرمایہ داروں سے لی تھی اس بہانے کہ وہ بورژوازی کو مزدوروں کے فتنے سے بچائے گا اور مزدوروں کو ان سے۔ لیکن اپنی باری کو اس کی حکومت نے سٹہ بازی اور صنعتی سرگرمی کا زور باندھا یا مختصر یہ کہ پوری بورژوازی میں طاقت اور دولت کی ایسی روح پھونک دی جس کی پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ اس سے بھی بڑے پیمانے پر بے ایمانی، بدعنوانی اور چوری کا بازار گرم ہو گیا جس کا مرکز تھا شاہی محل کہ وہ خود اس بہتی دولت میں اپنا کافی حصہ لگا لیتا تھا۔

مگر یہ دوسری سلطنت فرانس کے قومی تعصب کو ایک بہلاوا تھی، یہ ایک تقاضا تھی اس بات کا کہ پہلی سلطنت کی وہی سرحدیں بحال کی جائیں جو ۱۸۱۴ء کی شکست میں ہاتھ سے نکل گئی تھیں یا کم از کم پہلی رپبلک کی ہی سرحدیں قائم ہوں۔ ایسی فرانسیسی سلطنت جو پچھلی بادشاہت کی حدوں میں، ۱۸۱۵ء کی اس سے بھی کٹی پھٹی سرحدوں کے اندر بند ہو کر رہ جائے زیادہ عرصے چلنے والی بات نہیں تھی۔ اسی لئے بار بار جنگوں کی اور سرحدیں پھیلانے کی نوبت آئی۔ لیکن فرانسیسی کٹر قوم پرستوں کے خیالوں میں جگمگانے والی سب سے بڑی توسیع وہ تھی جو دریائے رائن کے بائیں کنارے پر جرمنوں کی طرف کی جائے۔ رائن کنارے ایک مربع میل سرحد بڑھا لینا ان کے نزدیک کوہ الپس یا کسی اور طرف دس میل بڑھ جانے سے کہیں بہتر تھا۔ جب دوسری سلطنت نصیب ہو گئی تو یہ جلد یا بدیر ہونے ہی والا تھا کہ رائن کے بائیں کنارے کی سرحد ایک دم یا آہستہ آہستہ بحال کرنے کا تقاضا کر دیا جائے۔ چنانچہ آسٹریا اور پروشیا میں جب ۱۸۶۶ء کی جنگ چھڑی تو وہ لمحہ آپہنچا۔ بسمارک سے ”علاقوں کی تلافی“ کی جو آس تھی، اس میں دھوکا کھا کر، اور خود اپنی ضرورت سے زیادہ چالاک اور ڈانواڈول پالیسی کے ہاتھوں دغا پاکر اب لوئی بوناپارٹ کے سامنے جنگ کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا، اور ۱۸۷۰ء میں جنگ کا شعلہ بھڑکا تو پہلے سیدان تک اور پھر ولہلم سہوئے تک اسے اپنی لپیٹ میں لے گیا۔



اس کا خمیازہ بھگتنا ہی تھا، سو ۳ ستمبر ۱۸۷۰ء کو پیرس میں انقلاب ہو گیا۔ سلطنت تاش کے پتوں کی طرح بکھر گئی اور پھر سے فرانسیسی ریپبلک کا اعلان ہو گیا۔ لیکن دشمن دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ سلطنت کی فوجیں یا تو میتر کے مقام پر بری طرح گھری ہوئی تھیں یا جرمنی میں قید پڑی تھیں۔ ایسے توڑ کے وقت جتنا نے پچھلی قانون ساز اسمبلی میں پیرس کے نمائندوں کو یہ اختیار دیا کہ وہ مل کر ”قومی بچاؤ کی حکومت“ بنالیں۔ بغیر کسی حیل حجت کے یہ بات یوں مان لی گئی کہ پیرس کے وہ تمام لوگ جو ہتھیار اٹھانے قابل تھے، نیشنل گارڈ میں اپنا نام لکھوا چکے تھے، ہتھیار سچ چکے تھے، اور ان میں مزدوروں کی بڑی زبردست اکثریت ہو گئی تھی۔ لیکن جلد ہی سرکار، جو قریب قریب پوری طرح سرمایہ داروں کی تھی اور ہتھیاربند پرولتاریہ کے درمیان کھلے عام ٹکر کی نوبت آگئی۔ ۳۱ اکتوبر کو مزدوروں کی ہتھیاربندوں نے ٹاؤن ہال پر یلغار کر دی اور گورنمنٹ کے کچھ ممبروں کو نرغے میں لے لیا۔ مگر ہوا یہ کہ دغا بازی سے، وعدہ کر کے گورنمنٹ کے صاف مکر جانے کی وجہ سے اور چھوٹی بورژوازی کی کچھ ہتھیاربندوں کے بیچ میں پڑ جانے سے انہیں پھر چھوڑ دیا گیا اور اس اندیشے سے کہ اس شہر میں جو غیرملکی فوجی طاقت کے محاصرے میں پھنسا ہے، کہیں خانہ جنگی نہ پھوٹ پڑے اسی پرانی سرکار کو اپنی جگہ رہنے دیا گیا۔

آخر ۲۸ جنوری ۱۸۷۱ء کو بھوکوں مرتے پیرس نے ہتھیار ڈال دیے۔ لیکن یہ کام اس شان کے ساتھ کیا کہ جنگ کی تاریخ میں کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ قلعے حوالے کر دیے، شہر کی فصیل پر سے توپیں ہٹا لیں، چھاوونی رجمنٹوں کے اور گشتی گارڈ کے ہتھیار دشمن کے سپرد کر دیے، اور خود کو جنگی قیدی شمار کرا دیا۔ لیکن نیشنل گارڈ نے اپنے ہتھیار بھی بچا لئے اور توپیں بھی — اور فاتح فوجوں کے ساتھ صرف جنگ بندی مان لی جس کے باعث وہ پیرس میں فاتحانہ شان سے داخل نہیں ہو سکیں۔ انہیں صرف اتنی جرات ہوئی کہ پیرس کے ایک چھوٹے سے گوشے میں اپنی چھاوونی ڈال لیں اور جب وہ گوشہ طے ہونے لگا تو اس میں ایک حصہ عام پارکوں کا شامل کر دیا جہاں یہ

فوجیں صرف چند روز قابض رہ سکیں۔ جتنے دن یہ فاتحانہ فوج وہاں پڑی رہی، جس نے ۱۳۱ دن سے پیرس کو نرغے میں لے رکھا تھا، وہ خود ہی پیرس کے ہتھیاربند مزدوروں کے نرغے میں آگئی، جنہوں نے اس پر سخت پھرہ بٹھا دیا کہ کوئی ”پروشیائی“ اس تنگ حلقے کی حد نہ بھلانگنے پائے جو غیرملکی فاتح کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ اپنا ایسا نقش بٹھا دیا پیرس کے مزدوروں نے اس فوج کے دلوں پر جس فوج کے سامنے سلطنت کی تمام فوجوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے کہ پروشیائی یونکر جو انقلاب کے گھر پر انتقام لینے آئے تھے وہ ادب سے کھڑے ہونے اور عین اسی مسلح انقلاب کو سلامی دینے پر مجبور ہو گئے۔ جب تک لڑائی چلتی رہی، پیرس کے مزدوروں کا مطالبہ صرف اس قدر تھا کہ لڑائی میں پورا زور لگا دیا جائے۔ لیکن پیرس کے ہتھیار ڈالتے ہی صلح نامے پر دستخط ہوئے (۲۵) تو نئے وزیراعظم تیسرے کو یہ سوچنے پر مجبور ہونا پڑا کہ جہاں تک پیرس کے مزدوروں کے ہاتھ میں ہتھیار رہیں گے، صاحب جائداد طبقوں یعنی بڑے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی عملداری مستقل خطرے میں رہے گی۔ چنانچہ اس نے مزدوروں سے ہتھیار رکھوا لینے کی کوشش میں پہلی کارروائی کی۔ ۱۸ مارچ کو اس نے چھاوونی کی فوج کو یہ حکم دے کر بھیجا کہ نیشنل گارڈ سے اس کا وہ توپخانہ چھین لیا جائے جو پیرس کے محاصرے کے زمانے میں پبلک چندوں سے بن کر تیار ہوا تھا۔ کوشش ناکام ہو گئی۔ پیرس ایک ہو کر مقابلے کے لئے اٹھا۔ ایک طرف یہ شہر، دوسری طرف وارسائی میں بیٹھی ہوئی فرانسیسی سرکار، دونوں کے درمیان اعلان جنگ ہو گیا۔ ۲۶ مارچ کو پیرس کمیون کا چناؤ ہوا اور ۲۸ مارچ کو اس نے اختیارات سنبھال لئے۔ نیشنل گارڈ کی مرکزی کمیٹی نے، جو فی الوقت سرکار چلا رہی تھی، پہلے تو پیرس کی بدنام زمانہ ”احتسابی پولیس“ کو توڑنے کا فرمان جاری کیا اور پھر اپنا استعفا کمیون کے حوالے کر دیا۔ ۳۰ مارچ کو کمیون نے جبری بھرتی اور صنف بند باقاعدہ فوج دونوں کو توڑ دیا اور نیشنل گارڈ کو تنہا ہتھیاربند طاقت قرار دے دیا جس میں سارے باشندے جو ہتھیار اٹھانے قابل تھے، بھرتی کئے جانے لگے۔ اکتوبر ۱۸۷۰ء سے اپریل



۱۸۷۱ء تک رہائشی مکانوں کے سب کرائے معاف کر دئے اور جو کرائے ادا کئے جا چکے تھے انہیں پیشگی کرایہ شمار کر کے رجسٹر میں چڑھا لیا اور میونسپل محافظ خانے میں قرضے کے بدلے جو سامان گروی رکھا تھا، اس کی فروخت بالکل بند کر دی۔ کمیون میں جن غیرملکیوں کا چناؤ ہوا تھا اسی دن ان کو عہدے سپرد کئے گئے کیوں کہ ”کمیون کا جھنڈا ساری دنیا کی رپبلک کا نشان تھا،“۔ پہلی اپریل کو ہی طے پایا کہ کمیون کے کسی ملازم، اور خود اس کے ممبروں کی بھی بڑی سے بڑی تنخواہ چھ ہزار فرانک (تب کے چار ہزار آٹھ سو مارک) سے زیادہ نہیں ہوگی۔ دوسرے دن کمیون نے فرمان جاری کیا کہ کلیسائی نظام (چرچ) اسٹیٹ سے بالکل الگ تھلگ رہے، سرکار کی طرف سے مذہبی کاموں کے لئے جو رقمیں دی جاتی تھیں، ان کا خاتمہ کیا، اور چرچ کی ساری جائداد قومی ملکیت قرار دے دی گئی۔ نتیجہ یہ کہ ۸ اپریل کو اسکولوں میں سے تمام مذہبی نشان، تصویریں، کلمے اور دعائیں، غرض وہ سارے تام جہام ”جن کا تعلق آدمی کے ذاتی عقیدے سے ہے،“ اٹھا دینے کا حکم جاری ہوا اور رفتہ رفتہ اس کی تعمیل ہونے لگی۔ چون کہ وارسائی کی فوج کمیون کے گرفتار شدہ حاسیوں کو روز بہ روز گولی سے اڑا رہی تھی، اس کے جواب میں ۵ تاریخ کو ایک فرمان جاری ہوا کہ یرغمال کے آدمی گرفتار کر لئے جائیں لیکن اس پر آخر تک عمل نہیں کیا گیا۔ ۶ اپریل کو نیشنل گارڈ کی ۱۳ ویں بٹالین سزائے موت میں گردن کاٹنے کے تختے اٹھا کر لائی اور انہیں خوشی کے عام نعروں میں جلا کر بھسم کر دیا گیا۔ ۱۲ تاریخ کو کمیون نے فیصلہ کیا کہ ویندوم میدان پر جو فتح مینار ان توپوں کو گلا کر ڈھالا گیا تھا جو نیولین نے ۱۸۰۹ء کی جنگ کے بعد دشمن سے چھینی تھیں، اسے قومی تعصب اور دوسری قوموں سے نفرت کا ایک نشان سمجھ کر ڈھا دیا جائے۔ ۱۶ مئی کو اس فیصلے پر عمل ہو گیا۔ ۱۶ اپریل کو حکم نکلا کہ ان کارخانوں کا بھی کھاتہ تیار کیا جائے جن پر مالکان کارخانہ نے تالے ڈال دئے ہیں، اور ایسا بندوبست کیا جائے کہ جو مزدور ان میں پہلے کام کر رہے تھے، انہی کو یہ کارخانے چلانے

کے لئے سپرد ہوں تاکہ وہ کوآپریٹیو سوسائٹیوں میں اکٹھے ہو کر ان کارخانوں کا انتظام کریں۔ اور یہ بھی پلان بنے کہ امداد باہمی کی ایسی تمام سوسائٹیاں ایک بڑی یونین میں منظم ہو جائیں۔ ۲۰ تاریخ کو کمیون نے بیکیوں کے لئے رات کے کام کی سناہی کر دی اور مزدوروں کے بھرتی دفتر بھی توڑ دئے جو دوسری سلطنت کے زمانے سے پولیس کے چھٹے ہوئے گرگوں، اول نمبر کے منافع نچوڑنے والوں نے اپنا اجارہ بنا رکھے تھے۔ یہ دفتر وہاں سے توڑ کر پیرس کی بیس محکمے والی میونسپلٹی میں منتقل کر دیا گیا۔ ۳۰ اپریل کو حکم نکلا کہ گروی پر قرض دینے والے تھلے اٹھادئے جائیں کیوں کہ ان میں مزدوروں کی کمائی ناجائز طریقے سے نجی ہاتھوں میں چلی جاتی ہے اور یہ اس حق کی خلاف ورزی ہے جو محنت کرنے والے کو اپنے اوزار پر اور قرض کی رقم پر حاصل ہے۔ ۵ مئی کو کمیون نے حکم نافذ کیا کہ ”توبہ کا گر جا گھر،“ مسمار کر دیا جائے جو لوئی شانزدہم کا سر اڑا دینے کے کفارے کے طور پر بنایا گیا تھا۔

یوں ۱۸ مارچ کے بعد سے برابر پیرس کی تحریک کا وہ طبقاتی کردار تیزی کے ساتھ اجاگر ہوتا چلا گیا جو غیرملکی حملہ آوروں سے لڑائی چلنے کے کارن پہلے نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ چون کہ کمیون میں خود مزدور بیٹھے تھے یا مزدوروں کے مانے ہوئے نمائندے، اس لئے جتنے بھی فیصلے ہوئے ان کا کردار قطعی طور سے پروتاری تھا۔ یا تو ان فیصلوں کے ذریعے ان اصلاحات کو نافذ کیا گیا جنہیں رپبلکن خیالات کی بورژوازی محض بزدلی کے مارے پاس کرنے سے رہ گئی تھی، حالاں کہ مزدور طبقے کی آزادانہ سرگرمی کے لئے ان اصلاحوں کا نفاذ ایک لازمی بنیاد بنتا۔ مثلاً اس اصول کی تعمیل کہ ریاست کے تعلق سے مذہب صرف ایک ذاتی معاملہ ہوتا ہے۔ یا پھر کمیون نے ایسے احکام نافذ کئے جو مزدور طبقے کا مفاد سیدھے سیدھے پورا کرتے تھے اور کسی نہ کسی حد تک سماج کے پرانے نظام میں اندر تک شگاف ڈالنے والے تھے۔ لیکن ایک ایسے شہر کے اندر جو دشمن کے نرغے میں ہو زیادہ سے زیادہ اتنا ہی ممکن تھا کہ ان تمام باتوں کو عملی جامہ پہنانے کی شروعات کر دی جائے۔ اور مئی کے شروع سے کمیون کی



ساری طاقت اس لڑائی میں کھینچنے لگی جو وارسائی والی حکومت کی ان فوجوں سے لڑنی تھی جن کے ٹھٹھ برابر لگتے چلے جا رہے تھے۔

۷ اپریل کو وارسائی کی فوجوں نے پیرس کے مغربی مورچے پر نیچی کے نزدیک دریائے سین کے آریار قبضہ کر لیا۔ مگر دوسری طرف گیارہ تاریخ کو جنوبی مورچے پر ایک حملے میں جنرل یودے (Eudes) کے ہاتھوں انہیں بھاری نقصان اٹھا کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ پیرس پر اب مسلسل گولہ باری ہو رہی تھی وہ بھی ان لوگوں کی طرف سے جو اسی شہر پر پہلے پروشیا کی گولہ باری کو مذہبی جرم قرار دے کر لعنت بھیج چکے تھے۔ انہی لوگوں نے پروشیا کی حکومت سے درخواست پر درخواست کی کہ سیدان اور میتز کے (۶۶) مقاموں پر قید ہونے والے فرانسیسی فوجیوں کو جلدی سے واپس بھیجا جائے تاکہ وہ پیرس کو ان کی خاطر پھر چھین سکیں۔ ان فوجوں کی رفتہ رفتہ واپسی نے وارسائی حکومت کا فوجی پلہ مٹی کے شروع میں بھاری کر دیا۔ یہ بات ۲۳ اپریل کو ہی کھل کر سامنے آ گئی جب صدر حکومت تیسر نے کمیون کی تجویز سے قیدیوں کے اس تبادلے کی بات چیت توڑ دی جس کے مطابق پیرس کے بڑے پادری (جارج دربوئی) اور بہت سے دوسرے پادریوں کو جنہیں یرغمال کے طور پر شہر میں رکھا گیا تھا، صرف ایک لیڈر بلانکی کے بدلے میں چھوڑنا تھا۔ یہ بلانکی دوبار کمیون کا ممبر چنا جا چکا تھا لیکن ابھی تک کلیرو کے جیل خانے میں پڑا تھا۔ اور اس سے بھی زیادہ یہ بات ظاہر ہوئی تیسر کے بدلے ہوئے لب ولہجہ سے۔ پہلے وہ گول مول اور مذہب سی زبان میں بولا کرتا تھا مگر اب گستاخی، ڈانٹ ڈپٹ اور حیوانیت پر اتر آیا۔ وارسائی حکومت کی فوج نے جنوبی مورچے پر ۳ مئی کو مولیں۔ ساکے کا قلعہ چھین لیا، ۹ مئی کو فورٹ یسی پر قبضہ ہوا جو توپوں کی مار میں پہلے ہی ڈھیر ہو چکا تھا اور ۱۴ تاریخ کو فورٹ وانو ان کے ہاتھ آ گیا۔ مغربی مورچے پر یہ فوجی دستے شہر کی فصیل تک پہلے بہت سے دیہات اور عمارتوں پر قبضہ کرتے ہوئے دھیرے دھیرے بڑھ کر بچاؤ کے خاص خاص ٹھکانوں تک پہنچ گئے۔ ۲۱ مئی کو اس مورچے پر غداری اور نیشنل گارڈ کی بے فکری کی بدولت وہ شہر کے اندر

گھس پڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ پروشیا کی جن کے پاس شمالی اور مشرقی قلعے تھے، انہوں نے وارسائی کے فوجیوں کو شہر کے شمال والا حصہ پار کر کے اندر بڑھنے کا موقع دے دیا جو جنگ بندی کی رو سے ان کے لئے ممنوعہ علاقہ تھا اور اس طرح انقلاب دشمن فوج کو دور تک پہیلے ہوئے اس محاذ پر آگے بڑھ آنے کا پورا موقع مل گیا جس کو پیرس والے سمجھتے تھے کہ جنگ بندی کے معاہدے کی رو سے یہ راستہ بند ہے اور اسی لئے حفاظت کا بندوبست کم رکھا تھا۔ اس سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ پیرس کے مغربی حصے میں جو خاص شہر کے اندر آسائشی علاقہ تھا، کمزور سا مقابلہ ہوا، البتہ پیش قدمی کرتی ہوئی فوج مشرقی حصے کی طرف جتنی بڑھتی گئی، مقابلہ اتنا ہی جاندار ہونے لگا اور ڈٹ کر اس کا سامنا کیا گیا۔ یہ خاص شہر کے اندر مزدور طبقے کا علاقہ تھا۔ آٹھ دن کے لگاتار خونی معرکوں کے بعد کمیون کے آخری محافظ بیلویل اور سینل ماں تان کی چڑھائیوں پر ڈھے گئے۔ اس کے بعد نہتے مردوں، عورتوں اور بچوں کا قتل عام، جو ہفتہ بھر سے برابر بڑھتا جا رہا تھا، اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ چونکہ توڑے دار بندوقوں سے جلدی جلدی لوگوں کو موت کے گھاٹ نہیں اتارا جا سکتا تھا اس لئے ہارے ہوئے فریق کو سیکڑوں کی تعداد میں مترالیوز (ہلکی توپ) کی باڑھ مار کر ٹھنڈا کر دیا گیا۔ پیرلاشیز کے قبرستان میں ”فیڈرلوں کی دیوار“، \* جہاں آخری قتل عام ہوا تھا، آج بھی کھڑی ہوئی زبان خاموشی سے گواہی دے رہی ہے کہ مزدور طبقہ اپنے حق کے لئے میدان میں اترے تو حاکم طبقے کے سر پر کیسا خون سوار ہو جاتا ہے۔ آخر جب دیکھا کہ سب کو چن چن کر ذبح کرنا ممکن نہیں تو اندادہند عام گرفتاریوں کا، قیدیوں میں سے آنکھ بند کر کے چنے ہوئے لوگوں کو گولی سے اڑا دینے کا، اور باقی کو ان کیمپوں میں ڈھکیل دینے کا بازار گرم ہوا جہاں سے انہیں فوجی عدالت کے سامنے ملزم کی طرح پیش ہونا تھا۔ پروشیا کی فوج جو شہر کا آدھا شمالی مشرقی حصہ گھیرے پڑی تھی، اسے آرڈر ملا کہ

\* جسے آجکل ”کمیون والوں کی دیوار“ کہتے ہیں۔ (ایڈیٹر)



ادھر سے کوئی جان بچا کر بھاگنے نہ پائے۔ لیکن جب عام فوجی اپنے ہائی کمان کا حکم سننے کے بجائے انسانیت کی پکار پر کان دھرتے تو پروشیائی افسر دیکھی ان دیکھی کر دیا کرتے تھے۔ سیکسن فوجی دستوں کو خاص طور سے شاباش ملنی چاہئے کہ انہوں نے بڑی انسانیت سے کام لیا اور ایسے بہت سے لوگوں کو نکل جانے دیا جو صاف صاف کمیون پر جان چھڑک رہے تھے۔

\* \* \*

آج ہم بیس سال بعد جب ۱۸۷۱ء کے پیرس کمیون کی سرگرمی اور اس کی تاریخی اہمیت پر پلٹ کر نظر ڈال رہے ہیں تو ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ”فرانس میں خانہ جنگی“، والے مضمون کے بیان میں کچھ اور اضافے بھی کرتے چلیں۔

کمیون کے ممبر اکثریت اور اقلیت میں بٹے ہوئے تھے: بلانکی کے حامی اکثریت ہونے کے علاوہ نیشنل گارڈ کی مرکزی کمیٹی پر بھی حاوی تھے اور انٹرنیشنل ورکنگ مینز ایسوسی ایشن کے ممبر اقلیت میں تھے، جن میں زیادہ تر سوشلزم کے پرودھوں والے نظریے کو مانتے تھے۔ بلانکی کے حامیوں کی بڑی اکثریت اس وقت اتنی ہی اشتراکی تھی کہ ان میں انقلابی پرولتاری جذبہ تھا۔ ان میں صرف تھوڑے سے لوگوں نے وائیان (Vaillant) کے ذریعے، جسے خود جرمن سائنٹفک سوشلزم کی خبر تھی، اصولوں کی اچھی سوجھ بوجھ پیدا کی تھی۔ اس لئے یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ معاشی دائرے میں ایسے بہت سے کام ہونے سے رہ گئے جو آج ہم سوچتے ہیں کہ پیرس کمیون کو کر دینے چاہئے تھے۔ جو بات کسی طرح گلے نہیں اترتی وہ یہ کہ بینک آف فرانس کے پھانک کے سامنے سر جھکا کر ادب کے ساتھ کھڑے کیوں رہ گئے؟ یہ ایک گمبھیر سیاسی غلطی تھی۔ پورا بینک اور کمیون کے ہاتھ میں ہو، یہ ایک ہی بات یرغمال میں رکھے ہوئے دس ہزار آدمیوں کے برابر بھاری پڑتی۔ اگر ایسا ہو جاتا تو پوری فرانسیسی بورژوازی وارسائی حکومت پر دباؤ ڈال کر کہتی کہ کمیون سے صلح کرلو۔ تاہم بلانکی اور پرودھوں دونوں مختلف خیالات والوں کی شرکت کے

باوجود کمیون نے جتنی کچھ صحیح کارروائی کی، وہ بھی بڑے کمال کی بات ہے۔ قدرتی امر ہے کہ کمیون کی طرف سے جو معاشی احکام جاری ہوئے اپنی خوبیوں اور خامیوں دونوں میں ان کا سمہرا بڑی حد تک پرودھوں والوں کے سر ہے۔ اور بلانکی والوں پر سیاسی کارگزاری اور کوتاہی کی ذمہ داری جاتی ہے۔ اور ایسے موقعوں پر جب طاقت ایسے لوگوں کے ہاتھ لگ جائے جو نظریے کے پرستار ہوں، جیسا ہوتا آیا ہے، یہاں بھی تاریخ نے مذاق کیا کہ دونوں نے ہی اپنے مکتب فکر کی تعلیم کے بالکل برخلاف عمل کر کے دکھایا۔

چھوٹے کسانوں اور استاد کاریگروں کے ترجمان سوشلسٹ پرودھوں کو انجمن سازی سے کھلی نفرت تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ انجمن بنانے میں اتنی اچھائی نہیں جتنی برائی ہے۔ وہ اپنی فطرت سے صرف لاحاصل ہی نہیں بلکہ نقصان دہ بھی ہے کیوں کہ وہ مزدور کی آزادی پر ایک بندھن ہو جاتی ہے؛ وہ محض ایک اندھ وشواس ہے، پھل کچھ نہیں، اور مفت کا بوجھ، جس کا مزدور کی آزادی سے بھی اتنا ہی ٹکراؤ ہوگا جتنا محنت کی کفایت کو نقصان پہنچے گا؛ فائدوں کے مقابلے میں اس کے نقصانات کہیں تیزی سے دوگنے چوگنے ہو جاتے ہیں اور اگر موازنہ کیا جائے تو کھلا مقابلہ، محنت کی تقسیم اور پرائیویٹ ملکیت کا آمد معاشی طاقتیں معلوم ہوتی ہیں۔ پرودھوں کے بقول صرف خاص خاص موقعے ایسے ہیں بڑی صنعت اور بڑے کاروبار کے، جیسے ریلیں کہ ان میں مزدوروں کی انجمنیں ہونا مناسب رہتا ہے (ملاحظہ ہو: ”انقلاب کا عام خیال“، (۶۷)، تیسرا خاکہ)۔

۱۸۷۱ء کے قریب نازک دستکاریوں کے مرکز پیرس تک میں بڑے پیمانے کی صنعت اتنی پھیل چکی تھی کہ وہ خاص موقع نہیں رہ گئی تھی اور کمیون کی طرف سے جو نہایت ہی اہم حکم جاری ہوا اس نے بڑی صنعت کی تنظیم قائم کی اور تنظیم بھی کیسی کہ ایک ایک کارخانے میں مال بنانے والوں کی انجمن نہیں، بلکہ ان سب کو ملا کر ایک بڑی انجمن میں جوڑنے والی تنظیم، مختصر یہ کہ ایسی تنظیم جس کے متعلق مارکس نے اپنے مضمون ”خانہ جنگی“ میں سچ کہا ہے



کہ چلتی تو آخر میں کمیونزم تک پہنچا کر دم لیتی۔ اسے یوں کہئے کہ پرودھوں نے اپنے نظرئے اور ایمان کے برخلاف عمل کیا۔ چنان چہ اس کمیون میں پرودھوں والے سوشلزم کی قبر بن گئی۔ آج یہ طرز فکر فرانس کے مزدور طبقے کے حلقوں میں بالکل ناپید ہے۔ اب یہاں، ”اسکائیون“ (۶۸) کے درمیان بھی مارکس کا نظریہ اتنا ہی چھا گیا ہے جتنا خود مارکسیوں میں۔ البتہ تیزخیال (radical) بورژوازی میں پرودھوں کے ماننے والے مل جاتے ہیں۔

بلانکی والوں کا بھی کچھ یہی حال ہوا۔ ان کی اٹھان سازش کی تعلیم گاہ میں ہوئی تھی اور سازش کے ساتھ جو سخت ڈسپلن چلتا ہے وہی ان کو جوڑے ہوئے تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ پکے ارادے کے، خوب مضبوطی سے منظم کئے ہوئے کسی قدر تھوڑے لوگوں کا گروہ مناسب وقت آنے پر نہ صرف یہ کہ معاملات کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے قابل ہو جائے گا بلکہ اپنے انتھک اور بے لوج دم خم سے کام لے کر اس وقت تک حکومت سنبھالے رہے گا جب تک کہ جتنا میں روح پھونک کر انقلاب کے ہنگامے میں نہ کھینچ لائے اور پھر یہ انقلابی ہجوم لیڈروں کی چھوٹی سی ٹولی کے گرد سمٹ آئے گا۔ اس کا اول تقاضا یہ تھا کہ تمام اختیارات نہایت سختی اور ڈکٹیٹری کے ساتھ نئی انقلابی حکومت کے ہاتھ میں دے دئے جائیں۔ جب کمیون قائم ہوا اور اس میں انہی بلانکی والوں کی اکثریت بنی تھی تو کمیون نے کیا کر کے دکھایا؟ باہر صوبوں میں فرانسیسیوں کے نام جتنے اعلان شائع کئے ان میں یہ اپیل کی کہ ملک میں جتنے کمیون بنتے ہیں ان سب کا پیرس کمیون کے ساتھ آزادانہ فیڈریشن بنایا جائے، ایک قومی تنظیم بنے جو حقیقت میں پہلی بار خود قوم کے ہاتھوں بنی تھی۔ پہلے سے مرکزیت لئے ہوئے ایک استبدادی عملداری، فوج، سیاسی پولیس اور سرکاری عملے کے ساتھ چلی آرہی تھی جسے ۱۷۹۸ء میں نپولین نے جمایا تھا اور بعد میں جو بھی نئی حکومت آتی وہ اسے بڑی خوشی سے کام کا ایک اوزار سمجھ کر اپنا لیتی اور اپنے حریفوں کے خلاف استعمال کیا کرتی تھی۔ یہی تھی وہ عملداری جسے پیرس کی طرح اور سب جگہوں پر بھی ٹوٹ پھوٹ کر ہٹ جانا تھا۔

شروع سے کمیون کو یہ مان لینا پڑا کہ جب مزدور طبقے کے ہاتھ میں ایک بار اختیارات آ گئے تو ممکن نہیں کہ وہ اسی پرانی سرکاری مشین سے کام لیتا رہے۔ جو برتری کی حیثیت اس طبقے نے چھین کر حاصل کی ہے، کہیں یہ پھر نہ جاتی رہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک طرف تو اس پرانی مشینری سے نجات پائی جائے جو زور زبردستی سے کام لیتی تھی اور خود مزدور طبقے کے خلاف ہی استعمال کی جاتی تھی، اور دوسری طرف اپنے ہی مقرر کئے ہوئے نمائندوں اور عہدہ داروں سے بچاؤ کی یہ صورت رکھی جائے کہ بلا رعایت ہر ایک کو ممبری یا عہدے سے ہٹا دینے کا اختیار ہر وقت حاصل رہے۔ پہلے کی حکومت کی خاصیت کیا تھی؟ سماج نے شروع میں کارگزاری کے الگ الگ خانے بنا کر اپنے دست و بازو یا خاص ادارے تیار کئے تاکہ وہ اس کے مفادوں کی نگرانی رکھیں۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ ادارے یا محکمے، جن کے سر پر خود سرکاری اقتدار کھڑا تھا، اپنی ذاتی مصلحتیں پوری کرنے کی خاطر، سماج کے خدمت گزار ہونے کے بجائے سماج کے آقا بنتے چلے گئے۔ یہ بات مثال کے طور پر صرف موروثی بادشاہی میں نہیں بلکہ جمہوری ریپبلک میں بھی اسی طرح نظر آتی ہے۔ شمالی امریکہ کو لیجئے جہاں ”سیاست دانوں“ نے خود کو قوم کا ایک ایسا الگ تھلگ اور طاقتور حصہ بنا لیا ہے جو اور کہیں نہ ہوگا۔ وہاں دونوں بڑی سیاسی پارٹیاں جن میں سے کوئی ایک برسر اقتدار ہوتی ہے، ایسے لوگوں کے قبضہ قدرت میں رہتی ہیں جنہوں نے سیاست کو اپنا کاروبار بنا رکھا ہے اور شمالی امریکی یونین کی اور الگ الگ ریاستوں کی قانون ساز اسمبلیوں میں نشستیں دلانے کا بازار بھاؤ ہاتھ میں رکھتے ہیں یا اپنی اپنی پارٹی کے لئے ایجنڈیشن کر کے روزی کما رہے اور پارٹی کے جیتنے پر اس کا انعام وصول کیا کرتے ہیں۔ مشہور بات ہے کہ پچھلے تیس سال سے امریکہ والے کوشش میں ہیں کہ اس بلا کو اپنے سر سے اتاریں جو ناقابل برداشت ہو چکی ہے، لیکن سارے جتن کر لینے کے باوجود وہ بدعنوانی کی اس دلدل میں اور دھنستے جا رہے ہیں۔ خاص امریکہ میں یہ منظر آنکھوں کے سامنے ہے کہ سرکاری اقتدار اپنے آپ کو اسی



سماج سے الگ ایک وجود بنانے کا عمل کیوں کر اختیار کرتا ہے جس سماج کا شروع میں اسے ایک آلہ کار بنانا سوچا گیا تھا۔ یہاں نہ تو کوئی پشتینی بادشاہی ہے، نہ امیردرباردار، اور مقامی انڈین آبادی پر نگرانی رکھنے والے مٹھی بھر سپاہیوں کے علاوہ نہ کوئی باقاعدہ فوج ہے، نہ سرکاری نوکریاں اور مستقل عہدے اور نہ پنشن کا حق۔ پھر بھی دیکھئے تو دو بڑے گروہ ہیں سیاسی بولی لگانے والوں کے جو باری باری سرکاری اقتدار اپنی مٹھی میں لیتے رہتے ہیں اور بہت گروے ہوئے ہتھکنڈوں سے اور نہایت گندی غرضوں کے لئے اس کا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن پوری قوم سیاست دانوں کے ان دو بڑے کارٹلوں کے آگے بالکل بے بس ہے، جو بظاہر قوم کے خادم لیکن اصل میں خدمت لینے اور اسے ٹھگنے والے ہیں۔

سرکار اور سرکاری اداروں یا محکموں کے اس طرح سماج کے خدمت گزار بننے کے بجائے اس کے مالک بن بیٹھنے کی جو یہ کایاکلپ ہوتی ہے، جو پہلے کی تمام سرکاروں میں بہر حال چلتی رہی، کمیون نے اسی کا توڑ کرنے کے لئے دو بے خطا تدبیریں اختیار کیں۔ اول تو یہ کہ اس نے سارے عہدے، چاہے وہ انتظامی ہوں، عدالتی یا تعلیمی، تمام لوگوں کے ووٹ سے انتخابی کر دئے اور ووٹ دینے والوں کو یہ بھی اختیار دیا کہ جب چاہیں، مقررہ عہدہ دار کو ہٹا دیں۔ دوسرے یہ کہ تمام عہدہ داروں کی تنخواہ، چاہے وہ اونچے ہوں یا نیچے، وہی رکھی جو مزدوروں کو ملتی۔ کمیون نے بڑی سے بڑی تنخواہ چھ ہزار مارک مقرر کی تھی۔ اس طرح عہدے تاکنے اور نوکریوں کی سیڑھی چڑھ جانے کے راستے میں ایک کارگر رکاوٹ کھڑی کر دی۔ اوپر سے یہ بندش بھی بڑھا دی کہ نمائندہ اداروں میں جو لوگ چناؤ کے راستے پہنچیں وہ اپنے حلقے کی مرضی کے پابند رہیں گے۔

پہلے کی سرکاری طاقت کا یوں پرزے اڑنا (Sprenkung) اور نئی اور صحیح معنوں میں جمہوری طاقت کا اس کی جگہ لینا ”خانہ جنگی“ کے تیسرے حصے میں تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ لیکن یہاں بھی اس کے بعض پہلوؤں کا مختصر تذکرہ ضروری تھا کیوں کہ جرمنی میں

خاص کر اسٹیٹ پر ایک غیبی عقیدہ فلسفے سے ہوتا ہوا دل و دماغ میں بیٹھ گیا ہے اور صرف بورژوازی کے نہیں بلکہ بہت سے مزدوروں کے دلوں میں بھی اس نے جگہ بنا لی ہے۔ فلسفیانہ تصور کہتا ہے کہ اسٹیٹ ”خیال کا عملی جامہ پہننا“ ہے یا زمین پر ”حکومت انہیہ“ ہے جسے فلسفے کے لفظوں میں یوں کہیں گے کہ وہ دائرہ جس میں ابدی سچائی یا انصاف کا بول بالا ہوتا ہے یا ہونا چاہئے۔ یہیں سے وہ غیبی عقیدہ بنتا ہے جس سے اسٹیٹ کے اور اس کے متعلقات کے سامنے لوگوں کے سر جھک جاتے ہیں۔ وہ اور بھی جڑ پکڑ لیتا ہے کیوں کہ لوگوں کے تخیل میں بچپن سے یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ پورے سماج کے مشترکہ معاملات اور مصلحتوں کا خیال رکھنے کی بس وہی ایک صورت ہے جو پہلے سے چلی آ رہی ہے یعنی اسٹیٹ یا سرکار اور اس کے بڑی بڑی تنخواہیں پانے والے عہدے داروں کے ذریعے ہی یہ دیکھ بھال ہو سکتی ہے۔ لوگ سوچتے ہیں کہ موروثی بادشاہی پر سے اپنا عقیدہ ہٹا کر اور جمہوری ریپبلک پر ایمان لاکر انہوں نے بہت ہی غیر معمولی دلیری کا قدم اٹھایا ہے۔ سچ پوچھئے تو اسٹیٹ محض ایک مشین ہے جسے ایک طبقہ دوسرے طبقے کو اپنے دباؤ میں رکھنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اور یہ عمل جیسا بادشاہی دور میں تھا ویسا ہی جمہوری ریپبلک میں ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہ پرولتاریہ اپنے طبقے کے حاوی ہو جانے کی جنگ جیتنے کے بعد بھی اس برائی کو اگلوں کی وراثت میں پائے گا تو جیسا کہ کمیون نے کیا، فتح مند پرولتاریہ کو بھی کرنا ہوگا کہ اس وراثت کے بدترین پہلوؤں کو جتنا جلد ممکن ہو، چھانٹ کر نکال پھینکے اور باقی اس وقت تک چلتا رہے جب تک کہ وہ نسل پروان نہ چڑھے جو نئے آزادانہ سماجی حالات میں پلی ہو اور ریاست کے پورے کاٹھ کباڑ کو اٹھا کر کوڑے کے ڈھیر میں پھینکنے قابل نہ ہو جائے۔

ادھر کچھ عرصے سے سوشل ڈیموکریٹک (سماجی جمہوریت پسند) کم ظرفوں (۶۹) کے دلوں میں پرولتاری ڈکٹیٹری کے لفظ سے دھشت بیٹھنے



لگی ہے۔ اچھا تو جناب والا، کیا آپ جاننا چاہتے ہیں کہ پرولتاری ڈکٹیٹری کیسی ہوتی ہے؟ پیرس کمیون ملاحظہ فرمائیے۔ یہی تھی پرولتاری ڈکٹیٹری۔

لندن، پیرس کمیون کی ۲۰ ویں سالگرہ کے موقع پر، ۱۸ مارچ

۱۸۹۱ء

ف۔ اینگلز

اصل مسودے کے مطابق  
شائع کیا گیا۔

رسالے «Die Neue Zeit»  
اور 1891—1890, №28, Bd. 2  
Marx, «Der Bürgerkrieg in  
Frankreich». Berlin, 1891  
میں شائع ہوا۔

## فرانس اور پروشیا کی جنگ پر پہلا خط جو انٹرنیشنل ورکنگ مینز ایسوسی ایشن کی جنرل کونسل نے بھیجا

### یورپ اور امریکہ میں ایسوسی ایشن کے ممبروں کے نام

انٹرنیشنل ورکنگ مینز ایسوسی ایشن کے نومبر ۱۸۶۳ء والے  
”تاسیسی مینی فسٹو“ میں ہم نے کہا تھا کہ: ”محنت کش طبقوں کے  
سر کا بوجھ اتارنے کے لئے اگر ضروری ہے کہ ان میں برادرانہ ہم آہنگی  
ہو تو وہ اپنے اس شاندار مشن کو اس خارجہ پالیسی کے ہوتے ہوئے  
کیوں کر پورا کر سکتے ہیں جس کی نیت میں فتور ہو، اور جو  
قومی تعصب بھڑکا کر لوگوں کا لہو اور دھن دولت غارت گری کی  
جنگ میں بہا دینے پر تلی ہو؟“، انٹرنیشنل جس خارجہ پالیسی کو  
مانتا ہے، اس کی تعریف ہم نے ان لفظوں میں کی تھی ”اخلاقی برتاؤ اور  
انصاف کے وہی سیدھے سادے اصول جو افراد کے ذاتی بیوہار میں  
برتنے جانے چاہئیں، قوموں کے باہمی معاملات میں بھی انہی کو حرف  
آخر سمجھ کر اختیار کیا جائے“۔

کچھ تعجب کی بات نہیں کہ لوئی بوناپارٹ، وہ شخص جس نے  
فرانس میں طبقوں کے درمیان لڑائی سے فائدہ اٹھا کر طاقت ہتھیالی، اور



وقتاً فوقتاً دوسرے ملکوں سے جنگ چھیڑ کر اس طاقت کو مٹھی میں رکھے ہوئے تھا، پہلے دن سے ہی انٹرنیشنل کو ایک خطرناک دشمن شمار کر رہا ہے۔ عین اس وقت جب عام رائے شماری ہونے والی تھی (۱۷)، اس نے انٹرنیشنل کی انتظامی کمیٹیوں کے ممبروں پر سارے فرانس میں چھاپے مارنے کا حکم دے دیا، پیرس، لیون، روان، مارسیلز، بریست وغیرہ میں چھاپے مارے گئے اور بہانہ یہ کہ انٹرنیشنل ایک خفیہ سوسائٹی ہے جو اسے قتل کرنے کی سازش میں لگی ہے۔ یہ ایسا جھوٹا بہانہ تھا کہ خود اسی کے ججوں نے تھوڑے دن بعد اس کے بے تکرے پن کی قلعی کھول دی۔ انٹرنیشنل کی فرانسیسی شاخوں کا اصلی جرم کیا تھا؟ انہوں نے فرانسیسیوں سے ڈنکے کی چوٹ زور دے کر یہ کہا کہ رائے شماری میں ووٹ دینا ملک کے اندر من مانی حکومت اور ملک کے باہر جنگوں کے حق میں ووٹ دینا ہے۔ انہی کی کوششوں کا ثمرہ تھا کہ فرانس کے تمام بڑے بڑے شہروں اور صنعتی مرکزوں میں مزدور طبقہ ایک ہو کر اٹھا اور اس نے رائے شماری کو ٹھکرا دیا۔ بدقسمتی سے دیہاتی حلقوں میں جہالت کے بوجھ نے ترازو کا پلہ دوسری طرف جھکا دیا۔ یورپ کے اسٹاک اکسچینجوں نے، وزارتوں نے، حاکم طبقوں نے اور اخبارات نے رائے شماری پر خوب بغلیں بجائیں کہ یہ فرانس کے مزدور طبقے پر فرانسیسی شہنشاہ کی شاندار فتح ہے، حالانکہ یہ ایک اشارہ تھا کسی ایک آدمی کے گلے پر نہیں، بلکہ قوموں کے گلے پر چھری پھیر دینے کا اشارہ۔

جولائی ۱۸۷۰ء میں جنگ چھیڑنے کی سازش (۲۷) دسمبر ۱۸۵۱ء میں حکومت کا تختہ الٹنے (coup d'état) کا دوسرا تربیم شدہ ایڈیشن تھی، اور کچھ نہیں۔ پہلی نظر میں یہ بات اتنی واہیات معلوم ہوتی تھی کہ جنگ کے چرچے پر فرانس نے شروع میں کان ہی نہیں دھرے۔ بلکہ اس ممبر\* کی بات کو زیادہ قابل اعتبار سمجھا جس نے کہا تھا کہ وزیروں کی جنگی دھواں دھار تقریریں شیربازار کو جھانسا دینے

\* ژبول فاور - (ایڈیٹر)

کے لئے ہیں۔ آخر ۱۵ جولائی کا دن آیا جب قانون ساز اسمبلی کے سامنے جنگ کا سرکاری اعلان کیا گیا تو پورے فریق مخالف نے ابتدائی خرچوں کی منظوری دینے سے صاف انکار کر دیا۔ ٹیئر تک نے اس جنگ کو ”ناگوار“ کہا اور پیرس کے تمام آزاد اخباروں نے اس کی مذمت کی۔ کمال تو یہ ہوا کہ صوبائی اخباروں تک نے قریب قریب اتفاق رائے سے جنگ کی مخالفت کی۔

اس عرصے میں انٹرنیشنل کے پیرس والے ممبر پھر اپنے کام میں لگ گئے۔ ۱۲ جولائی کے «Réveil» (۳۷) میں ”تمام قوموں کے محنت کشوں کے نام، انہوں نے اپنا مینی فسٹو شائع کیا جس کے بعض اقتباس ہم یہاں دے رہے ہیں:

”یورپی توازن کے نام پر اور قومی عزت کا واسطہ دے کر سیاسی امنگوں نے پھر دنیا کے امن کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ فرانس، جرمنی اور اسپین کے محنت کرنے والو! آؤ، ہم سب آواز میں آواز ملا کر جنگ کے خلاف مذمت کا نعرہ لگائیں!.. اپنا رتبہ اونچا رکھنے کی خاطر، یا کسی شاہی خاندان کے حق کے لئے جنگ کرنا مزدوروں کی نظر میں ایک احمقانہ جرم کے سوا کچھ نہیں۔ ہم لوگ، جو امن، روزگار اور آزادی کے حامی ہیں، ہم ایسے لوگوں کے جنگی طنطنے کے خلاف احتجاج کرتے ہیں جنہوں نے خود کو ”خون کے ٹیکس“ سے بری سمجھ رکھا ہے اور جن کے لئے سماج کی مصیبت صرف ایک سرچشمہ ہے نئی سٹہ بازی کا!.. جرمن بھائیو، اگر ہم میں پھوٹ پڑی تو اس کا خمیازہ یہ بھگتنا پڑے گا کہ دریائے رائن کے دونوں کناروں پر من مانی حکمرانی پوری طرح قدم جمالے... تمام ملکوں کے محنت کشو! چاہے فی الحال ہماری مشترکہ کوششوں کا کوئی بھی نتیجہ نکلے لیکن ہم، انٹرنیشنل ورکنگ مینز ایسوسی ایشن کے ممبر، جن کے نزدیک ریاستی سرحدوں کا



کوئی وجود نہیں، ہم آپ کو اپنے اٹوٹ برادرانہ رشتے کی نشانی سمجھ کر فرانس کے مزدوروں کی طرف سے دلی تمنائیں اور سلام بھیجتے ہیں۔“

ہماری پیرس کی شاخوں کے اس مینی فسٹو کے بعد اسی طرح کے کئی فرانسیسی اعلان نکلے جن میں سے یہاں صرف ایک نیٹی سیورسین صوبے کے اعلان کا حوالہ دے سکتے ہیں جو اخبار «Marseillaise» (۷۴) میں ۲۲ جولائی کو شائع ہوا تھا۔

”کیا یہ جنگ برحق ہے؟ نہیں۔ کیا یہ جنگ قومی ہے؟ نہیں۔ یہ جنگ محض موروثی بادشاہی کی ہے۔ انسانیت کا، جمہوریت کا اور فرانس کے سچے مفاد کا واسطہ دے کر ہم لوگ، جنگ کے خلاف انٹرنیشنل کے احتجاج سے پوری یک دلی اور قوت کے ساتھ اتفاق کرتے ہیں۔“

ان احتجاجوں نے فرانسیسی محنت کشوں کے صحیح جذبات ظاہر کئے تھے اور بہت دن نہ گزرنے پائے کہ ایک عجیب و غریب اتفاق سے یہ بات ثابت ہو گئی۔ ہوا یہ کہ دس دسمبر والوں کی ٹولی (۷۵) کو، جو شروع میں لوئی بوناپارٹ کی رپبلکن صدارت کے سائے میں تیار ہوئی تھی، مزدوروں کی کرتی پہنا کر جب پیرس کی سڑکوں پر نکالا گیا کہ اپنے کرتبوں سے لوگوں کا جنگی موڈ دکھا دیں تو پاس کی بستیوں کے اصلی مزدوروں نے امن کے حق میں ایسے ربر دست جلوس نکالے کہ پولیس پریفیکٹ پیٹری نے اسی میں خیریت سمجھی کہ سڑکوں کی اس سیاست کا سلسلہ فوراً بند کر دے اور اس نے یہ کہہ کر مظاہرے روک دیے کہ پیرس کے اصلی باشندوں نے اپنے وطنی جوش و خروش کا اور جنگی غیظ و غضب کا جتنا مظاہرہ کر لیا، بس وہی کافی ہے۔ پروشیا کے ساتھ لوئی بوناپارٹ کی جنگ چاہے کسی کل بیٹھے مگر پیرس میں تو دوسری شہنشاہی کی موت کی گھنٹی بج چکی۔ یہ دوسری شہنشاہی جس گھٹیا سوانگ سے شروع ہوئی تھی اسی پر ختم بھی ہوئی ہے۔ تاہم بھولنے کی بات نہیں کہ یہ یورپ کی حکومتیں اور حاکم

طبقے ہی ہیں جنہوں نے لوئی بوناپارٹ کو اٹھارہ سال سے بانس پر چڑھا کر پھر سے جمائی ہوئی شہنشاہی کا بے درد تماشا کرایا تھا۔ رہا جرمنی کا معاملہ، تو اس کے لئے یہ اپنے بچاؤ کی جنگ ہے۔ مگر کون ہے جس نے جرمنی کو اپنے بچاؤ پر مجبور کیا؟ کس نے لوئی بوناپارٹ کو اس قابل کیا کہ وہ جرمنی پر ہتھیار اٹھائے؟ پروشیا نے۔ وہ بسمارک ہے جس نے اس شخص لوئی بوناپارٹ سے ساٹھ گانٹھ کر کے یہ قدم اٹھوایا تاکہ اپنے ملک پروشیا میں جمہوری مخالفت کو کچل ڈالے اور جرمنی کو ہوہینزولرن کی موروثی بادشاہت میں جوڑ لے۔ اگر جرمنی سادووا کے مقام پر جنگ جیتنے کے بجائے ہار گیا ہوتا تو فرانسیسی بٹالینیں پروشیا کے حلیف کی حیثیت سے جرمنی کو روندتی ہوئی بڑھ جاتیں۔ کیا پروشیا نے اپنی فتح کے بعد ایک لمحے کو بھی یہ سوچا کہ دیے ہوئے فرانس کے مقابلے پر آزاد جرمنی کو کھڑا کر دیا جائے؟ نہیں۔ اس کے بالکل برخلاف۔ اپنے پرانے سسٹم کی تمام فطری خوییاں باقی رکھتے ہوئے، اس نے دوسری سلطنت کے سارے ہتھکنڈے بھی اپنا لئے: اس کی سچی من مانی حکمرانی، اور جھوٹ موٹ کی جمہوریت پسندی، اس کے سیاسی کرتب اور مالی کرتوت، بلند بانگ لفظوں کا طومار لیکن گرے ہوئے اطوار۔ بوناپارٹ کی عملداری اب تک تو دریائے رائن کے صرف ایک کنارے بہار دے رہی تھی، اب دوسرے کنارے پر بھی اس کا نقلی نمونہ بن کر تیار ہو گیا۔ جب حالت یہ ہو تو جنگ کے سوا اور کیا امید ہو سکتی تھی؟

اگر کہیں جرمن مزدور طبقے نے اس جنگ کو اپنے بچاؤ کی حد سے گزرنے دیا اور اسے فرانسیسی جنتا کے خلاف جنگ کی طرف بہک جانے دیا تو چاہے فتح ہو یا شکست، دونوں حالتوں میں تباہی و بربادی یقینی ہے۔ نام نہاد آزادی کی جنگ لڑ لینے کے بعد سے جرمنی پر جو مصائب آئے ہیں وہ اور بھی شدت سے ٹوٹ پڑیں گے۔

لیکن انٹرنیشنل کے اصول جرمن مزدور طبقے میں اتنے عام ہیں اور اس قدر گہری جڑیں پکڑے ہوئے ہیں کہ ان کی طرف سے ایسی افسوسناک بدگمانی نہیں رکھنی چاہئے۔ فرانسیسی محنت کشوں کی



صدا جرمنی سے صدائے بازگشت لے کر پھری ہے۔ برونشویگ میں ۱۶ جولائی کو مزدوروں کے ایک عام جلسے نے پیرس والے مینی فیسٹو سے پورا اتفاق رائے ظاہر کیا ہے اور فرانس سے کسی قومی ناچاقی کو بے جا قرار دیا ہے۔ اس جلسے کی تجویز ان لفظوں پر تمام ہوتی ہے:

”ہم ہر قسم کی جنگ کے دشمن ہیں، خاص طور سے ان جنگوں کے جو شاہی خاندانوں کے لئے کی جائیں... نہایت افسوس اور رنج کے ساتھ ہم اپنے بچاؤ کی جنگ لڑنے پر مجبور ہوئے ہیں، ایسی برائی اختیار کرنے پر، جس سے کوئی مفر نہیں۔ لیکن ساتھ ہی ہم پورے جرمن مزدور طبقے کو آواز دیتے ہیں کہ وہ اس قسم کی بے پناہ سماجی آفت کے لئے آئندہ کوئی امکان نہ چھوڑے۔ خود لوگوں (قوموں) کو یہ اختیار دلوا کر کہ وہ جنگ اور امن کا فیصلہ آپ کر سکیں اور اپنی تقدیر کے آپ مالک ہوں۔“

خیمنتز کے مقام پر سیکسونیا کے ۵۰ ہزار مزدوروں کے نمائندوں کے ایک بھرے جلسے میں اس مضمون کی تجویز اتفاق رائے سے منظور ہوئی:

”ہم لوگ عام طور پر جرمن جمہوریت کی طرف سے، اور خاص کر ان محنت کشوں کی طرف سے جو سوشل ڈیموکریٹک پارٹی میں ہیں، اعلان کرتے ہیں کہ موجودہ جنگ خاندانی بادشاہت کی جنگ ہے... ہمیں وہ برادرانہ ہاتھ تھام کر خوشی ہوتی ہے جو فرانس کے مزدوروں نے ہماری طرف بڑھایا ہے... انٹرنیشنل ورکنگ سینز ایسوسی ایشن کے اس نعرے کو ”دنیا کے مزدورو، ایک ہو!“، ذہن میں رکھتے ہوئے ہم یہ کبھی نہیں بھول سکتے کہ سبھی ملکوں کے محنت کش ہمارے دوست ہیں اور سبھی ملکوں کے من مانے حاکم ہمارے دشمن ہیں۔“

انٹرنیشنل کی برلن والی شاخ نے بھی پیرس کے مینی فیسٹو کا جواب دیا:

”ہم دل و جان سے آپ کے احتجاج میں شریک ہیں... اور پکا عہد کرتے ہیں کہ چاہے جنگ کا بگل ہو یا توپ کی گرج، چاہے فتح ہو یا شکست، ہمیں اس مشترکہ کام سے کوئی نہیں ہٹا سکتا جو تمام ملکوں کے محنت کے سپوتوں کو متحد کرنے کے لئے ہم کر رہے ہیں۔“

ایسا ہی ہو!

خود کشی کے اس جنگی ہنگامے کے پس منظر میں روس کا سیاہ سایہ منڈلا رہا ہے۔ یہ ایک برا شگون ہے کہ موجودہ جنگ کا سگنل ایسے وقت میں دیا گیا جب ماسکو سرکار نے موقع کی جگہوں پر ریلوے لائنیں بچھانے کا کام پورا کر لیا اور دریائے پروتھ کی سمت دھڑا دھڑ فوجیں بھیجی جانے لگیں۔ بوناپارٹ کی چڑھائی کے مقابلے میں جرمنوں کو اپنے بچاؤ کی جنگ لڑتے وقت جو ہمدردیاں حاصل ہو سکتی ہیں، اگر کہیں انہوں نے یہ موقع دیا کہ پروشیا کی سرکار کزاکوں کی مدد طلب کرے یا اسے منظور کر لے تو وہ فوراً ساری ہمدردیاں کھو دیں گے۔ جرمنی کو خوب یاد رکھنا چاہئے کہ اس نے نپولین بوناپارٹ سے جب اپنی آزادی کی جنگ لڑی تھی، اس کے کئی نسل بعد تک وہ زار روس کے قدموں میں پڑا رہا۔

انگلینڈ کا مزدور طبقہ بھی فرانسیسی اور جرمن محنت کش جنتا کی طرف بھائی چارے کا ہاتھ بڑھا رہا ہے۔ اسے اچھی طرح یقین ہے کہ آنے والی ہولناک جنگ چاہے جو موڑ لے، لیکن وہ وقت آئے گا کہ تمام ملکوں کے محنت کش طبقوں کا اتحاد ہر قسم کی جنگوں کا خاتمہ کر دے گا۔ خود یہ حقیقت، کہ جب فرانس اور جرمنی کے سرکاری حلقے ایک دوسرے کے خلاف برادر کشی کی جنگ میں اترے ہوئے ہیں، دونوں ملکوں کے محنت کش ایک دوسرے کو امن اور خیر خواہی کے پیغام بھیج رہے ہیں۔ یہ شاندار حقیقت، جو ماضی کی تاریخ میں اپنا جواب نہیں رکھتی، ایک روشن مستقبل کی راہ دکھا رہی ہے۔ اس سے ثابت



ہوتا ہے کہ اقتصادی بربادیوں اور سیاسی سرساموں والے پرانے سماج کے مقابلے میں ایک نیا سماج ابھر رہا ہے جس کا بین اقوامی اصول ہوگا۔ امن، کیوں کہ ہر قوم کی حکمرانی اسی ایک ہاتھ میں ہوگی، محنت کے ہاتھ میں!

اس نئے نظام معاشرت کی پیشوا ہے انٹرنیشنل ورکنگ مینز ایسوسی ایشن۔

۲۵۶، ہائی ہولبورن،

لندن، ویسٹرن سنٹرل،

۲۳ جولائی ۱۸۷۰ء

مارکس نے ۱۹ اور ۲۳ جولائی ۱۸۷۰ء کے درمیان تحریر کیا۔

انگریزی میں جولائی

۱۸۷۰ء میں پہلے دستی

اشتہار کی شکل میں

چھپا۔ پھر لیف لٹوں کے

علاوہ، جرمن، فرانسیسی

اور روسی اخبارات

میں اگست ستمبر

۱۸۷۰ء میں شائع ہوا۔

دستی اشتہار کے پہلے

انگریزی ایڈیشن کی

لفظ بلفظ عبارت سے

ترجمہ کیا گیا ہے، جس

کا دوسرے ۱۸۷۰ء والے

انگریزی ایڈیشن اور

جرمن ایڈیشن سے

مقابلہ کیا گیا۔

## فرانس اور پروشیا کی جنگ پر انٹرنیشنل ورکنگ مینز ایسوسی ایشن کی جنرل کونسل کا دوسرا خط

### یورپ اور امریکہ میں ایسوسی ایشن کے ممبروں کے نام

۲۳ جولائی کے اپنے پہلے خط میں ہم نے کہا تھا کہ ”دوسری شہنشاہی کی موت کی گھنٹی پیرس میں بج چکی۔ یہ دوسری شہنشاہی جس گھٹیا سوانگ سے شروع ہوئی تھی، اسی پر ختم بھی ہوئی ہے۔ تاہم بھولنے کی بات نہیں کہ یہ یورپ کی حکومتیں اور حاکم طبقے ہی ہیں جنہوں نے لوئی بوناپارٹ کو اٹھارہ سال سے بانس پر چڑھا کر پھر سے جمائی ہوئی شہنشاہی کا بے درد تماشا کرایا تھا،۔“

اس طرح جنگ کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے ہی ہمیں نظر آ گیا تھا کہ لوئی بوناپارٹ کا صابن کا جھاگ اب گئی گزری بات ہے۔ دوسری شہنشاہی کے کس بل کا اندازہ کرنے میں ہم نے ٹھوکر نہیں کھائی اور نہ اس اندیشے میں ہم سے غلطی ہوئی کہ کہیں جرمنی کی ”جنگ اپنے بچاؤ کی حد سے گزر کر فرانسیسی جنتا کے خلاف جنگ کی طرف نہ بہک جائے،۔“ اصل پوچھئے تو بچاؤ کی

\* ملاحظہ ہو اس جلد کا صفحہ ۱۴۴۔ (ایڈیٹر)

\*\* ملاحظہ ہو اس جلد کا صفحہ ۱۴۵۔ (ایڈیٹر)



جنگ تبھی ختم ہو گئی جب لوئی بوناپارٹ نے ہتھیار ڈالے، سیدان میں فوجوں نے شکست مان لی اور پیرس میں رپبلک کا اعلان کر دیا گیا۔ لیکن ان واقعات سے بہت پہلے، اسی وقت جب شہنشاہی فوجوں کی پول کھل چکی تھی، پروشیا کے فوجی ٹولے (camarilla) نے فرانس پر قبضہ کرنے کی نیت باندھ لی تھی۔ ان کی راہ میں بس ایک ناگوار رکاوٹ کھڑی تھی، یعنی لڑائی شروع ہوتے وقت قیصر ولہلم کا اپنا اعلان جنگ۔ شمالی جرمن رائخسٹاگ کے نام قیصر نے تخت کی طرف سے تقریر کرتے وقت یہ پختہ عہد کیا تھا کہ جو لڑائی لڑی جائے گی وہ شہنشاہ فرانس کے خلاف ہوگی، فرانسیسی جنتا کے خلاف نہیں۔ گیارہ اگست کو اس نے فرانسیسی قوم کے نام ایک اعلان شائع کیا جس میں وہ کہتا ہے:

”شہنشاہ نپولین نے خشکی اور تری کے راستے چونکہ اس جرمن قوم پر حملہ کر دیا ہے جو فرانس والوں کے ساتھ پہلے بھی امن سے رہنا چاہتی تھی اور اب بھی یہی چاہتی ہے، لہذا میں نے جرمن فوجوں کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی ہے تاکہ اس کے حملے کو پسپا کر دوں اور یہ فوجی صورت حال کا تقاضا تھا کہ فرانس کی سرحد پار کی جائے۔“

اس جنگ میں جو اپنے بچاؤ کی نوعیت تھی اسے اجاگر کرنے میں قیصر ولہلم نے صرف اتنا ہی نہیں کہا کہ ”حملے کو پسپا کرنے کے لئے“، جرمن فوجوں کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی ہے بلکہ یہ بھی بڑھا دیا کہ ”فوجی صورت حال کا تقاضا، تھا کہ فرانس کی سرحد پار کی جائے۔ اپنے بچاؤ کی جنگ میں، یقیناً یہ بھی ہوتا ہے کہ ”فوجی صورت حال کے تقاضے“ سے بڑھ کر حملہ کیا جائے۔

چنانچہ یہ نیک طینت بادشاہ فرانس کے اور ساری دنیا کے سامنے اپنے اس عہد کا پابند ٹھہرا کہ جنگ صرف اپنے بچاؤ کی حد تک کی جائے گی۔ اب اس عہد سے اسے بری کیسے کیا جائے؟ تماشے کا بندوبست کرنے والوں کو یہ سوانگ رچانا تھا کہ جرمن قوم کے دباؤ کی تاب نہ لا کر بادشاہ سلامت کو اپنی مرضی کے بغیر جھکنا پڑا ہے۔

انہوں نے آزاد خیال جرمن درمیانی طبقے کو، جس میں پروفیسر، سرمایہ دار، میونسپل کونسلر، اور اخبار نویس شامل ہیں، اشارہ کر دیا۔ درمیانی طبقے کے یہ لوگ جو شہری آزادی کی خاطر اپنی جدوجہد میں ۱۸۴۶ء سے ۱۸۷۰ء تک ہچکچاہٹ کا، نااہلی کا، اور بزدلی کا بے مثال منظر پیش کرتے رہے تھے، ایک دم خوشی سے دمک اٹھے کہ انہیں یورپ کے اسٹیج پر جرمن وطن پروری کے دھاڑتے ہوئے شیر کی طرح اچھل کود کرنی تھی۔ اس طبقے کی شہری آزادی بھی کھل کر سامنے آ گئی کہ وہ پروشیا کی حکومت کو خود اسی کے خفیہ منصوبے پورے کرنے پر مجبور کرنے کا دکھاوا کر رہا تھا۔ لوئی بوناپارٹ کے اٹل اور بے خطا ہونے پر اس طبقے کو جو ایک زمانے سے پکا ایمان تھا، اب اس گناہ کا کفارہ یوں ادا کیا جا رہا ہے کہ فرانسیسی رپبلک کا شیرازہ بکھیرنے کے حق میں شور مچایا جائے۔ آئیے، زرا سنیں تو کہ یہ شیردل دیش بھگت کیا کیا خاص دعوے کر رہے ہیں۔ وہ یہ بات بنانے کی تو ہمت نہیں کرتے کہ الزاس اور لارین علاقے کے لوگ جرمنی کی آغوش میں آنے کو یقیناً ہیں۔ اصلیت اس کے برعکس ہے۔ استراسبورگ کا شہر، جس کا قلعہ الگ تھلگ کھڑا ہوا پورے منظر پر حاوی ہے، اسے فرانسیسی حب وطن کی سزا دینے کے لئے چھ دن تک ”جرمن“، آتشی گولوں کی زد میں لے کر بے تحاشا اور بے وجہ گولہ باری سے پھونک ڈالا گیا اور اس کے نہتے، بے بس لوگوں کی بڑی تعداد مٹی میں ملا دی گئی۔ پھر بھی کہنے کو چونکہ ان صوبوں کی سرزمین کبھی کسی زمانے میں مرحوم جرمن سلطنت میں (۱۷۹۶ء) رہ چکی ہے، اس لئے یہ زمین اور اس پر بسنے والے، دونوں جرمنی کی غیر منقولہ جائداد قرار دے کر ضبط کر لئے جائیں۔ اگر اسی طرح قدیم کے حامیوں کا شوق پورا کرنے میں یورپ کے پرانے نقشے کو پھر سے بحال کیا جائے تو یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہئے کہ برائنڈن برگ کا الکٹور بھی پروشیائی علاقوں کے والی ریاست کی حیثیت سے پولینڈ کی رپبلک کا باج گزار تھا (۱۷۹۶ء)۔

تاہم جو زیادہ ہوشیار محبان وطن ہیں، وہ الزاس صوبے اور لارین کے جرمن زبان بولنے والے علاقے کو فرانسیسی حملہ آوری کے



توڑ پر ایک ”ٹھوس ضمانت“ کہہ کر لینا چاہتے ہیں۔ اس گھٹیا چال نے چوں کہ بہت سے کم نظر لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک دی ہے تو ہمارا فرض ہے کہ زرا تفصیل سے اس پر روشنی ڈالیں۔ اس میں شک نہیں کہ رائن کے دوسرے کنارے کی نسبت سے الزاس کی عام ساخت اور بازل اور گیرمیرسگیم کے تقریباً بیچوں بیچ استراسبورگ جیسے بڑے قلعہ بند شہر کا واقع ہونا جنوبی جرمنی پر چڑھائی کرنے کے لئے فرانس کو بہت سہولت مہیا کرتا ہے، اور جنوبی جرمنی کی طرف سے فرانس پر چڑھائی کرنے میں کچھ دشواریاں پیدا کرتا ہے۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ الزاس کو اور لارین کے جرمن بولنے والے علاقے کو اگر ملالیا جائے تو جنوبی جرمنی کے ہاتھ اتنی مضبوط سرحد آ جائے گی کہ وہ ووگیس پہاڑی سلسلے کی ایک چڑھائی پر پوری طرح حاوی ہو جائے گا اور وہ قلعے بھی اس کے قبضے میں رہیں گے جو شمالی دروں کے پہرہ دار ہیں۔ اگر اسی کے ساتھ میتز بھی ملالیا جائے تو پھر جرمنی کے خلاف جنگی کارروائی کرنے میں فرانس اپنے دو خاص گڑھ فی الحال کھو بیٹھے گا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ نانسی یا ویردین کے مقام پر نئے گڑھ بنانے سے رک جائے۔ جب خود جرمنی کے پاس کوبلینٹس، مائنٹس، گیرمیرسگیم، رشتاڈ اور اولم جیسے ٹھکانے فرانس پر کارروائی کرنے کے لئے موجود ہیں اور موجودہ جنگ میں ان کا جی بھر کر استعمال بھی ہوا ہے تو پھر اس میں جلنے کی کیا بات ہے اگر فرانس کے پاس دریا پار صرف دو اہم قلعے رہتے ہیں استراسبورگ اور میتز۔ پھر یہ بھی کہ استراسبورگ سے جنوبی جرمنی کو صرف اسی حالت میں خطرہ ہوگا جب وہ شمالی جرمنی سے علاحدہ ایک طاقت ہو۔ ۱۷۹۲ء سے ۱۷۹۵ء تک جنوبی جرمنی پر اس سمت سے کبھی چڑھائی نہیں ہوئی کیوں کہ انقلاب فرانس کے خلاف جنگ میں پروشیا خود ایک فریق تھا۔ لیکن جیسے ہی پروشیا نے ۱۷۹۵ء میں اپنے طور پر صلح نامہ (۷۸) کر کے، جنوبی جرمنی کو اپنے حال پر چھوڑ دیا تو جنوبی جرمنی پر چڑھائی شروع ہو گئی جو ۱۸۰۹ء تک چلی اور استراسبورگ نے جنگی اڈے کا کام دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک متحدہ جرمنی استراسبورگ کے گڑھ کو اور

الزاس میں کسی بھی فرانسیسی فوج کو، جیسا کہ موجودہ جنگ میں کیا، اس طرح بے اثر کر سکتی ہے کہ سارلوئی اور لاندائو مقاموں کے درمیان اپنی فوجیں جمع کر دے اور مائنٹس اور میتز کے درمیان سڑک کے کنارے کنارے فوج آگے بڑھا دے یا لڑنا منظور کر لے۔ جرمن فوجوں کی بھاری تعداد وہاں لگی ہو تو پھر کوئی فرانسیسی فوج جو استراسبورگ سے جنوبی جرمنی میں پیش قدمی کرے گی دونوں بازوؤں سے گھر جائے گی اور عقب سے اس کے درمیانی رابطے خطرے میں پڑیں گے۔ اگر حال کی جنگی مہم نے کچھ ثابت کیا ہے تو یہ کہ جرمنی سے فرانس پر چڑھائی کرنے کی سہولت موجود ہے۔

لیکن ایمانداری سے جانچئے تو کیا یہ محض حماقت اور دقیانوسی پن نہیں ہے کہ فوجی مصلحتوں کو وہ اصول مانا جائے جس کی رو سے قوموں کی سرحدیں طے پائیں؟ اگر اسی اصول پر عملدرآمد ہونے لگے تو آج بھی آسٹریا کا حق ہوگا کہ وینس اور مینچو کی لائن اسے مل جائیں اور فرانس کو دریائے رائن کی لائن تک کا علاقہ ملے تاکہ پیرس کی حفاظت کی جا سکے، کہ اگر شمال مشرق کی سمت سے حملہ ہو تو پیرس تک راستہ زیادہ کھلا ہے بہ نسبت برلن کے، جس پر جنوب مغرب سے حملہ کیا جائے۔ اگر سرحدیں طے کرنے میں جنگی مصلحتوں کی ہی پابندی کی جائے تو پھر دعووں کی کوئی انتہا نہیں رہے گی کیوں کہ ہر ایک فوجی لائن میں کہیں نہ کہیں خرابی ہے، کچھ اور باہر کے علاقے کو جوڑ کر یہ خرابی کم کی جا سکتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ قطعی طور سے اور انصاف کے ساتھ سرحدیں کبھی طے نہیں کی جا سکتیں کیوں کہ وہ ہمیشہ فاتح کی طرف سے مفتوح کے سر منڈھی جاتی ہیں۔ اور انجام اس کا یہ کہ ان سرحدوں کے اندر نئی جنگوں کے بیج دبے رہ جاتے ہیں۔

پوری تاریخ کا یہی سبق ہے۔ جو بات افراد کے حق میں صحیح ہے وہی قوموں کے حق میں بھی ہے۔ اگر انہیں دوسرے پر ہاتھ اٹھانے کی طاقت سے محروم کرنا ہے تو اپنی حفاظت کے ذریعے سے بھی محروم کرنا ہوگا۔ گلا گھونٹنا کافی نہیں، قتل بھی کرنا پڑے گا۔ اگر کبھی کسی فاتح نے کسی قوم کی نسلیں توڑنے کے لئے ”ٹھوس



ضمانت، طلب کی ہے تو وہ نپولین اول تھا جس نے تلست کے صلح نامے کے وقت ایسا کیا (۷۹) اور پروشیا اور باقی جرمنی کے خلاف اس پر عمل کر کے دکھا دیا۔ لیکن کچھ ہی سال گزرے تھے کہ اس کی زبردست طاقت جرمن لوگوں پر ایک گلے ہوئے نرکل کی طرح بکھر کر رہ گئی۔ جو ”ٹھوس ضمانتیں“ کسی وقت نپولین اول نے پروشیا سے زبردستی وصول کی تھیں کیا اب پروشیا ان سے بڑھ کر ”ٹھوس ضمانتیں“، انتہائی طیش میں فرانس سے وصول کرنے کی ہمت کر سکتا ہے؟ نتیجہ اس سے کچھ کم تباہ کن نہیں نکلنے والا۔ تاریخ جب جرمانہ لگائے گی تو وہ اس حساب سے نہیں ہوگا کہ فرانس سے کتنے مربع میل علاقہ چھینا گیا تھا بلکہ اس حساب سے ہوگا کہ ۱۹ ویں صدی کے دوسرے نصف میں ملک تھیانے کی پالیسی کو پھر سے زندہ کرنے کا جرم کتنا شدید تھا۔

لیکن تیوتونی (۸۰) دیش بھگتی کے حمایتی کہتے ہیں: آپ جرمنوں کو فرانسیسیوں سے خلط ملط نہ کیجئے۔ ہمیں شان بگھارنی نہیں ہے، سلامتی چاہئے۔ جرمن اصل میں امن پسند قوم ہیں۔ ان کی شریفانہ نگرانی میں آکر کسی علاقے کی فتح مستقبل میں جنگ کا سبب رہنے کے بجائے مستقل امن کی ضمانت بن جاتی ہے۔ اس میں کیا شک ہے! وہ کوئی جرمنی تھوڑی تھا جس نے ۱۷۹۲ء میں اس اعلا مقصد کی خاطر کہ سنگینوں سے اٹھارویں صدی کے انقلاب کا سینہ چھلنی کر دیا جائے فرانس پر چڑھائی کی تھی! اور وہ بھی جرمنی نہیں، کوئی اور تھا جس نے اٹلی کو اپنا ماتحت بنا کر، ہنگری کو کچل کر، پولینڈ کے ٹکڑے کر کے اپنے نام کو بٹھ لگایا۔ اور جرمنی کا یہ موجودہ فوجی نظام، جس میں تمام تندرست ترین آبادی دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک حصہ مستقل صف بندی کی ہوئی فوج اور دوسرا حصہ مستقل ریزرو فوج، اور دونوں کے دونوں خدا کے فضل سے اپنے حاکموں کی مرضی کے آگے سر جھکائے ہوئے۔ یہ فوجی نظام امن کی ”ٹھوس ضمانت“، تو خیر تھی، اوپر سے تہذیب کا اعلا مقصد بھی معلوم ہوتا ہے۔ اور جگہوں کی طرح جرمنی میں بھی حکومت وقت

کے خوشامدی جھوٹ موٹ اپنی تعریفوں کے پل باندھ کر لوگوں کے دماغوں کو زہر آلود کر دیتے ہیں۔

یہ جرمن محبان وطن میتز اور استراسبورگ میں فرانسیسی قلعہ بندیوں دیکھ کر تو بہت ناک بھوں چڑھاتے ہیں، لیکن انہیں وارسا، مودلین اور ایوان گورود میں ماسکوالوں کی قلعہ بندیوں کے جال میں کوئی ہرج نہیں دکھائی دیتا۔ بوناپارٹ کی یلغار کی دہشت پر تو وہ بہت شور مچاتے ہیں لیکن اپنے سر پر زار کی شخصی حکومت کا سایہ دیکھ کر آنکھیں میچ لیتے ہیں۔

جس طرح ۱۸۶۵ء میں لوئی بوناپارٹ اور بسمارک نے ایک دوسرے سے عہد و پیمان کئے تھے، اسی طرح اب ۱۸۷۰ء میں گرچاکوف اور بسمارک میں پیام سلام ہوئے ہیں۔ جس طرح لوئی بوناپارٹ نے یہ سوچ کر دل خوش کر لیا تھا کہ ۱۸۶۶ء کی جنگ آسٹریا اور پروشیا دونوں کو ہلکان کر چکی، اور اب میرا وقت ہے کہ جرمنی کی قسمت کا فیصلہ کروں، اسی طرح اب زار روس الیکساندر دل میں خوش ہو رہا ہے کہ ۱۸۷۰ء کی جنگ سے جرمنی اور فرانس دونوں نڈھال ہو چکے، لہذا میں مغربی یورپ کا سر پنچ بن جاؤں گا۔ جس طرح دوسری شہنشاہی کو اندیشہ تھا کہ شمالی جرمنی کی یونین اور وہ دونوں کی ایک وقت میں بسر نہیں ہو سکتی، اس طرح زار شاہی روس کو یہ فکر لگ گئی ہوگی کہ جرمن سلطنت اور وہ بھی پروشیائی لیڈر شپ کے سائے میں خود اس کے لئے ایک خطرہ ہے۔ پرانے سیاسی نظام کا قانون کچھ ایسا ہی ہے۔ اس نظام کے اندر ایک ریاست کا فائدہ دوسری ریاست کا نقصان ہے۔ یورپ پر زار روس کی بالادستی کی جڑ یہاں ہے کہ جرمنی پر اس کی پرانی گرفت چلی آتی ہے۔ ایسے وقت جبکہ خود روس میں ہی لاوے کی طرح ابلتی ہوئی سماجی طاقتیں شخصی حکومت کی جڑ بنیاد ہلا ڈالنے پر تلی ہوئی ہیں، کیا زار روس ملک سے باہر اپنے وقار کا اتنا بڑا نقصان برداشت کر سکتا ہے؟ ابھی سے ماسکو کے اخبار وہ زبان بول رہے ہیں جو ۱۸۶۶ء کی جنگ کے بعد بوناپارٹ والے اخبار بولا کرتے تھے۔ کیا واقعی تیوتونی دیش بھگت یہ سوچتے ہیں کہ فرانس کو جبراً روس کی پناہ میں دے کر جرمنی امن و آزادی کی



ضمانت حاصل کر لے گا؟ اگر جنگ میں زیر رہنے کی بدولت، کامیابی کے نشے اور شاہی خاندانوں کے جوڑتوڑ کے سبب سے جرمنی نے فرانس کے علاقوں پر ہاتھ صاف کرنے کا راستہ اپنایا تو پھر خود جرمنی کے لئے صرف دو ہی راستے رہ جائیں گے: یا تو یہ کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، روس کی قابضانہ سیاست کا ایک کھلا پرزہ بن کر رہے، یا تھوڑی سی سہلت گزارنے کے بعد پھر ایک اور ”بچاؤ“ کی جنگ کے لئے کمر بستہ ہو جائے، اس قسم کی جنگ نہیں جیسی نوایجاد محدود ”مقامی“ جنگیں ہونے لگی ہیں، بلکہ نسلی جنگ کے لئے، ایسی جنگ جو متحدہ سلاف اور روسی نسلوں سے لڑنی ہوگی۔

جرمن مزدور طبقے نے، کہ اس جنگ کو روکنا اس کے بس کی بات نہ تھی ثابت قدمی سے جنگ کا ساتھ دیا اور اسے جرمنی کی آزادی کی جنگ، فرانس اور یورپ کو دوسری شہنشاہی کے گھناؤنے عذاب سے نجات دلانے کی جنگ قرار دیا۔ جرمنی کے صنعتی مزدوروں نے دیہات کے محنت کشوں سے مل کر اس سورما فوج کی شہ رگ مہیا کی اور آدھے پیٹ کھا کر جینے والے کنبوں کو چھوڑ کر نکل گئے۔ وطن سے باہر میدان جنگ میں وہ تباہ ہو چکے، اب وطن میں افلاس اور محتاجی سے تباہ ہوں گے۔ اب اپنی باری کو وہ ”گارنٹی“ طلب کرتے ہیں، اس بات کی گارنٹی یا ضمانت کہ ان کی برے شمار قربانیاں ضائع نہ جائیں، انہیں آزادی نصیب ہو، اور بوناپارٹ کی فوجوں پر جو فتح پائی ہے وہ ۱۸۱۵ء کی فتح کی طرح جرمن عوام کی شکست (۸۱) میں تبدیل نہ ہونے پائے۔ اور ان سب میں پہلی ضمانت کے طور پر ان کا تقاضا ہے کہ فرانس سے عزت آبرو کے ساتھ صلح ہو اور فرانسیسی ریپبلک کو تسلیم کیا جائے۔

جرمن سوشل ڈیموکریٹک مزدور پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے ۵ ستمبر کو ایک مینی فسٹو (اعلان نامہ) شائع کیا ہے جہاں پورے زور شور سے ان ضمانتوں کا تقاضا موجود ہے:

”ہم الزاس اور لارین کو اپنے علاقے میں ملا لینے کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ ہمیں پورا شعور ہے کہ جرمن

مزدور طبقے کی طرف سے یہ آواز بلند کر رہے ہیں۔ فرانس اور جرمنی کے مشترکہ مفاد کی خاطر، امن اور آزادی کی خاطر، مشرقی درندگی کے مقابلے پر مغربی تمدن کی خاطر، جرمن محنت کش الزاس اور لارین کے ملا لئے جانے کو ہرگز خاموشی سے برداشت نہیں کریں گے... پرولتاریہ کے مشترکہ بین الاقوامی مقصد کے لئے تمام ملکوں میں ہم اپنے رفیق محنت کشوں کا دیانت داری سے ساتھ دیں گے!“

بدقسمتی سے ہمیں یہ امید نہیں بندھتی کہ انہیں فوری کامیابی ہو جائے گی۔ فرانس کے محنت کش جب امن کی حالت میں حملہ آور کا ہاتھ تھامنے سے ہار گئے تو اب جرمن محنت کش کس برتنے پر ہتھیاروں کی جھنکار میں فاتح کو روک سکتے ہیں۔ جرمن مزدوروں کا اعلان نامہ کہتا ہے کہ لوئی بوناپارٹ کو ایک عام مجرم کی حیثیت سے فرانسیسی ریپبلک کے حوالے کر دیا جائے۔ مگر ان کے حاکموں کی، اس کے برخلاف انتہائی کوشش ہے کہ اسے پھر توپلری کے تخت (۸۲) پر بٹھا دیا جائے کیوں کہ وہ فرانس کو تباہی تک پہنچانے کے لئے سب سے موزوں آدمی ہے۔ جو بھی صورت بنے، بہر حال تاریخ ثابت کر دے گی کہ جرمن مزدور طبقہ اس پھس پھسے مسالے سے نہیں بنا جس سے جرمن درمیانی طبقے کا خمیر اٹھا ہے۔ محنت کش اپنا فرض ادا کر دیں گے۔

ان کے ساتھ ہم بھی فرانس میں ریپبلک کی آمد کا استقبال کرتے ہیں۔ لیکن چند ایسی باتوں پر ماتھا ٹھنکتا ہے جو امید ہے کہ بے بنیاد ثابت ہوں گی۔ اس ریپبلک نے راج سنگھاسن کو ہٹایا نہیں بلکہ اس کی خالی جگہ بھر دی ہے۔ خود کو اس نے ایک سماجی فتح کے طور پر نہیں، بلکہ ڈیفنس کی ایک قومی تدبیر بنا کر دنیا کے سامنے رکھا ہے۔ ریپبلک ابھی عارضی حکومت کے ہاتھوں میں ہے جو کچھ تو بدنام اور لین والوں (۸۳) سے مل کر بنی ہے اور کچھ درمیانی طبقے کے ریپبلکنوں سے جن میں سے بعض کی آستینوں پر جون ۱۸۴۸ء کی بغاوت کا لہو ایسا لگا ہے کہ دھل نہیں سکتا۔ عارضی حکومت



کے ممبروں میں کام کی تقسیم بھی بے تکی ہے۔ اور لین والوں نے فوج اور پولیس پر اپنی گرفت مضبوط کر لی ہے اور جنہیں ریپبلکن ہونے کا دعوا ہے ان کے ہاتھ صرف بحثا بحثی کے محکمے آئے ہیں۔ اس حکومت کی شروع کی ہی بعض کارروائیاں حد سے آگے بڑھ کر یہ دکھاتی ہیں کہ ان لوگوں کو پچھلی شہنشاہی سے صرف کھنڈر ہی وراثت میں نہیں ملے بلکہ مزدور طبقے کی دہشت بھی پہنچی ہے۔ اگر یہ حکومت ریپبلک کے نام پر ان اپنا شناپ وعدے کر رہی ہے تو کہیں اس کی غرض یہ تو نہیں کہ جیسی حکومت ”کام چلا سکے“، یہ اس کے حق میں شور برپا کرنے کی تیاری ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہونے والا کہ درمیانی طبقے کے بعض کرتا دھرتاؤں کے خیال کے مطابق ریپبلک کو محض ایک درمیانی سیڑھی یا پل بنا لیا جائے اور لین والوں کو پھر سے تخت حکومت پر پہنچانے کے لئے؟

غرض کہ فرانس کا مزدور طبقہ انتہائی دشوار حالات سے گزر رہا ہے۔ ایسے توڑ کے وقت میں، جب دشمن پیرس کے دروازے پر دستک دے رہا ہے، نئی سرکار کو الٹنے کی کوشش کرنا انتہائی حماقت ہوگی۔ فرانسیسی محنت کشوں کا فرض ہے کہ وہ شہری کی حیثیت سے اپنے فرائض ادا کریں، لیکن ہوشیار رہیں کہ کہیں ۱۷۹۲ء والے ماضی کی قومی یادیں انہیں اسی طرح راہ سے بے راہ نہ کر دیں جیسے فرانسیسی کسان پہلی شہنشاہی کی قومی یادوں کے بہکاوے میں آگئے تھے۔ انہیں اپنا سارا ماضی نہیں دہرانا، مستقبل ضرور بنانا ہے۔ انہیں چاہئے کہ پختہ ارادے اور ٹھنڈے دل کے ساتھ ریپبلکن آزادی کے ذریعوں کو ابھارتے چلے جائیں تاکہ ان سے اپنی طبقاتی تنظیم کا کام لیتے رہیں۔ اس کی بدولت انہیں فرانس کو نئی زندگی عطا کرنے کے لئے اور ہماری مشترکہ منزل، یعنی محنت کے سر کا بوجھ اتارنے کے لئے زبردست سوریائی کس بل میسر آئے گا۔ انہی کی توانائی اور دانائی پر اب ریپبلک کی قسمت کا دارومدار ہے۔

انگریز محنت کشوں نے ایسی کچھ تدبیریں اختیار کر لی ہیں کہ فرانسیسی ریپبلک کو تسلیم کرنے میں ان کی حکومت جو ٹال مٹول کرتی رہی، باہر سے دباؤ ڈال کر اس کا تدارک کیا جائے (۸۴)۔

فی الحال انگریزی حکومت کی طرف سے جو وقت گزاری ہو رہی ہے، وہ غالباً اس لئے کہ ۱۷۹۲ء والی جیکوبی دشمن جنگ کے داغ دھبے مٹائے اور پچھلے انقلاب حکومت (۸۵) کو تسلیم کر لینے میں ناگوار جلد بازی کا کفارہ ادا کر دیا جائے۔ انگریز محنت کشوں نے اپنی حکومت پر یہ زور بھی ڈالا ہے کہ فرانس کے حصے بخرے کرنے کے خلاف اپنی پوری طاقت استعمال کرے، حالانکہ کچھ انگریزی اخبارات بے شرمی سے اس کے حق میں بہت چیخ پکار مچائے ہوئے ہیں۔ یہ وہی اخبارات ہیں جنہوں نے پورے بیس برس تک لوئی بوناپارٹ کو یورپ کا کرتا دھرتا بتا کر اس کی پوجا کی تھی اور امریکی بردہ فروشوں کی بغاوت پر شادیانے بجائے تھے۔ تب کی طرح وہ آج بھی بردہ فروشوں کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔

انٹرنیشنل ورکنگ سیمز ایسوسی ایشن کی شاخوں کو یہ کرنا ہے کہ ہر ایک ملک میں مزدور طبقے کے اندر عمل کی روح ڈورا دیں۔ اگر مزدوروں نے اپنا فرض بھلایا، اگر وہ بے عمل رہ گئے، تو آج کی خوفناک جنگ اس سے بھی زیادہ ہولناک اور تازہ بین اقوامی جنگوں کا پیش خیمہ بن جائے گی اور ہر ایک ملک میں مزدوروں کے سر پر اہل شمشیر کو، زمین اور زر کے مالکوں کو پھر سے سوار کر دے گی۔

Vive la République! (ریپبلک زندہ باد!)

۲۵۶، ہائی ہولبورن،

لندن، ویسٹرن سنٹرل،

۹ ستمبر، ۱۸۷۰ء

انگریزی زبان میں دستی  
اشتہار کے مطابق۔

مارکس نے ۶ اور ۹ ستمبر

۱۸۷۰ء کے درمیان لکھا۔



جب مزدور طبقے کے اصلی رہنما، بونا پارٹ کی جیلوں میں پڑے تھے اور پروشیا کی فوج پیرس کی طرف بڑھ رہی تھی، پیرس نے ان کے ہاتھ میں اختیارات کی باگ ڈور صرف یہ سوچ کر گوارا کر لی کہ انہیں قومی ڈیفنس کی خاطر استعمال ہونا ہے۔ پیرس کی حفاظت صرف اسی صورت میں ممکن تھی کہ شہر کے مزدوروں کو مسلح کیا جائے، انہیں واقعی ایک جنگی طاقت بنایا جائے، اور خود لڑائی کی آچ میں تپا کر فن جنگ سکھایا جائے۔ لیکن پیرس کو مسلح کرنے کے معنی تھے انقلاب کو ہتھیار سجانا۔ پروشیا کے حملہ آوروں پر پیرس کا فتاحیاب ہونا خود فرانسیسی سرمایہ داروں اور ان کی سرکار کے مفت خوروں پر فرانس کے مزدوروں کا فتاحیاب ہونا بن جاتا۔ قومی ڈیفنس کے لئے بننے والی حکومت قومی فرض اور طبقاتی مفاد کے اس ٹکراؤ میں زرا بھی نہ ہچکچائی اور قومی دغا کی سرکار بن کر رہ گئی۔

ان لوگوں نے پہلی حرکت یہ کی کہ تیسرے کو یورپ کے تمام راج درباروں کے دورے پر بھیج دیا تاکہ وہاں وہ رپبلک دے کر بادشاہ لینے کی شرط پر بیچ بچاؤ کی بھیک مانگتا پھرے۔ جب پیرس کے محاصرے کو چار مہینے گزر گئے تو انہوں نے اندازہ لگایا کہ اب ہتھیار ڈالنے کے بول زبان پر لانے کا لمحہ آ پہنچا۔ چنانچہ جنرل تروشیو نے ژبول فاور کی اور اپنے دوسرے رفیقوں کی موجودگی میں پیرس کے میئر حاضرین کے سامنے یوں لب کشائی کی:

”چوتھی ستمبر کی شام کو ہی میرے رفیقوں نے میرے سامنے یہ سوال رکھا تھا کہ کیا اس بات کی گنجائش ہے کہ پروشیائی فوج کے محاصرے میں رہ کر پیرس کامیابی سے مقابلہ کر لے؟ میں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے نفی میں جواب دیا تھا۔ کچھ حضرات جو یہاں موجود ہیں، میرے ان الفاظ کی سچائی اور رائے کے استقلال کی تصدیق کریں گے۔ میں نے اسی وقت کھلے لفظوں میں جتا دیا تھا کہ بحالت موجودہ پیرس کی یہ کوشش کہ پروشیائی فوج کے محاصرے میں پڑ کر وہ مقابلے سے کامیاب نکلے، ایک حماقت ہوگی۔ میں

## فرانس میں خانہ جنگی

انٹرنیشنل ورکنگ مینز ایسوسی ایشن  
کا خط

یورپ اور امریکہ میں ایسوسی ایشن کے  
تمام ممبروں کے نام

۱

چوتھی ستمبر ۱۸۷۰ء کو، جب پیرس کے مزدوروں نے رپبلک قائم ہونے کا اعلان کیا، اور تقریباً اسی وقت پورے فرانس نے ایک آواز ہو کر رپبلک کا سواگت کر دیا تو عہدوں کے بھوکے بیرسٹروں کی ایک ٹولی نے، جس کا سیاسی رہنما تیسرے تھا اور فوجی جنرل تروشیو، ٹاؤن ہال (Hôtel de Ville) کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس وقت ان لوگوں کے سروں میں سودا سمایا ہوا تھا کہ تاریخ کے ایسے تمام نازک دوروں میں پورے فرانس کی نمائندگی کرنا پیرس کا ہی منصب ہے۔ فرانس کے حاکم کھلانے کی دھاندلی کو جائز ثابت کرنے کے لئے انہوں نے اتنا کافی سمجھا کہ پیرس سے اپنی منتخبہ ممبری کا وہ اختیار ہی دعوے میں پیش کر دیں جس کی میعاد گزر چکی تھی۔ ان لوگوں کے اس مرتبے پر پہنچنے کے پانچ دن بعد ہم نے پچھلی جنگ کے متعلق اپنے دوسرے خط میں آپ پر یہ واضح کر دیا تھا کہ ان لوگوں کی حقیقت کیا ہے \*۔ پھر بھی اچانک تلاطم برپا ہونے کی اس حالت میں،

\* ملاحظہ ہوں صفحات ۱۵۸-۷۵۱- (ایڈیٹر)



نے یہ بھی بڑھا دیا تھا کہ اس میں شک نہیں کہ بڑی جاں بازانہ حماقت ہوگی... بعد کے واقعات نے، (اسی کے ہاتھ میں تھے یہ واقعات) ”میری پیش گوئی ثابت کردی ہے۔“

جو میٹر حاضر تھے ان میں سے کوریوں نام کے ایک میٹر نے جنرل تروشیو کی یہ چھوٹی سی پیاری تقریر بعد میں شائع کردی۔  
چنانچہ اسی شام جب رپبلک کا نشان بلند کیا گیا تروشیو کے ساتھ والوں کو اس کا یہ ”منصوبہ“ کہ پیرس ہتھیار ڈال دے، معلوم تھا۔ اگر قومی ڈیفنس تیسرے، فاور اینڈ کمپنی کی ذاتی حکومت قائم کرنے کا بہانہ بننے کے سوا اور کچھ ہوتا تو ۴ ستمبر کے نو دولتوں کو چاہئے تھا کہ ۵ ستمبر کو ہی گدی چھوڑ دیتے، اور پیرس والوں پر جنرل تروشیو کا منصوبہ کھول کر صاف کہہ دیتے کہ یا تو وہ فوراً ہتھیار ڈالیں، ورنہ اپنے معاملات کے خود مالک و مختار بنیں۔ اس کے بجائے ان بے ایمان دغا بازوں نے طے کیا کہ پیرس کی ”جاں بازانہ حماقت“، کا علاج فافہ کشی اور خون ریزی سے کیا جائے اور علاج ہونے تک ان بلند بانگ اعلانوں سے شہر کو بے وقوف بنایا جائے کہ ”پیرس کا گورنر تروشیو ہرگز ہتھیار نہیں ڈالے گا“، ”ژیل فاور وزیر خارجہ“ ہماری سرزمین کا ایک انچ اور ہمارے قلعوں کا ایک پتھر بھی دینے پر آمادہ نہیں ہوگا“۔ اور اسی وزیر خارجہ نے گمبے ٹا کے نام ایک خط میں خود اپنی زبان سے مان لیا کہ ”ڈیفنس“، پروشیائی فوج سے نہیں بلکہ پیرس کے مزدوروں سے کیا جا رہا ہے۔ محاصرے کے پورے عرصے بونا پارٹ کے یہ ٹھگ، جنہیں تروشیو نے بڑی ہوشیاری سے پیرس کی فوج کی کمان سونپ رکھی تھی، ذاتی خط و کتابت میں جھوٹ موٹ کے اس ڈیفنس پر گندے فقرے کسنے سے بھی نہیں چوکتے تھے (مثال کے لئے ملاحظہ ہو پیرس کی ڈیفنس فوج کے توپخانے کے کمانڈر انچیف اور سب سے بڑے خطاب یافتہ الفونس سیموں گنو کی توپخانہ ڈویژن کے جنرل سیوزن سے وہ خط و کتابت جسے پیرس کمیون کے «Journal Officiel» (۸۶) نے شائع کر دیا ہے)۔ ۲۸ جنوری ۱۸۷۱ء کو (۸۷) آخر ان بہروپیوں نے نقاب اتار دیا۔ قومی ڈیفنس کی حکومت

نے ہتھیار ڈالنے کے معاملے میں اپنی گراوٹ کا ایسا شاندار مظاہرہ کیا کہ وہ فرانس کی حکومت ہوتے ہوئے بسمارک کے قیدی بنے نظر آئے۔ یہ ایسا گراہوا پارٹ تھا کہ لوئی بونا پارٹ جیسا آدمی میدان میں اسے قبول کرنے پر تیار نہیں ہوا تھا۔ ۱۸ مارچ کے واقعے کے بعد جب وہ سر پر پاؤں رکھ کر وارسائی کی طرف فرار ہوئے تو یہ شکست خورے (capitulards) (۸۸) بھاگتے وقت پیرس کے ہاتھ اپنی غداری کی وہ تحریری شہادتیں بھی چھوڑ گئے، جنہیں مٹا دینے کی خاطر، بقول کمیون

”یہ لوگ پیرس کو خون کے سمندر میں ڈوبا ہوا خاک کا ڈھیر بنانے سے بھی باز نہ آتے۔“

کمیون نے یہ الفاظ اس اعلان نامے میں لکھے ہیں جو صوبوں کے نام بھیجا گیا۔

قومی ڈیفنس کی حکومت کے بعض خاص ممبروں کو اتنا تہس نہس کرانے کی جو بے چینی لگی ہوئی تھی اس میں بھی ان کی کچھ مخصوص ذاتی مصلحتیں کام کر رہی تھیں۔

جنگ بندی معاہدے پر دستخط ہونے کی دیر تھی کہ قومی اسمبلی میں پیرس کے ایک نمائندے موسیو میلیئر نے جسے بعد میں ژیل فاور کے حکم خاص سے گولی مار دی گئی، مستند قانونی تحریروں کا ایک سلسلہ شائع کیا اس بات کے ثبوت میں کہ ژیل فاور ایک عورت سے ناجائز تعلقات رکھتا تھا جو الجیریا جا کر بسنے والے کسی شرابی کی بیوی تھی اور نہایت ذلیل جعل سازیوں سے کام لے کر، جو کئی سال چلتی رہیں، اسی عورت کی اولاد کے نام سے اس نے ایک بڑی میراث پر ہاتھ مارا اور مالدار بن بیٹھا اور جب اس کے جائز وارثوں نے مقدمہ دائر کیا تو راز فاش ہوتے ہوتے اس لئے بچا کہ بونا پارٹ کی خاص عدالتوں نے اراداً پردہ ڈال دیا تھا۔ چون کہ ان خشک قانونی دستاویزوں کی زد سے بچ نکلنا لچھے دار تقریروں کے بس کا روگ نہیں تھا تو ژیل فاور نے زندگی میں پہلی بار زبان پر قابو رکھا اور خاموشی سے اس تاک میں رہا کہ خانہ جنگی چھڑ جائے تو بعد میں



یہ تحاشا پکار پکار کر کہے کہ پیرس کے لوگ قانون کے پنجے سے بھاگے ہوئے وہ مجرم ہیں جنہیں نہ خاندان کی آبرو کا لحاظ ہے، نہ مذہب کا، نہ قاعدہ قانون برداشت ہے، نہ ملکیت جائداد۔ اس جعل ساز نے ابھی ۴ ستمبر کو بمشکل طاقت سنبھالی ہی تھی کہ سماج کے سر پر پیک اور تائفیر جیسے لوگوں کو براہ کرم سوار کر دیا، جنہیں لوئی بوناپارٹ کے زمانے میں ہی اخبار «Etendard» والی بدنامی (۸۹) کے ساتھ جعل سازی کے جرم میں سزا ہو چکی تھی۔ ان دونوں میں سے ایک تائفیر نے دیدہ دلیری کی کہ کمیون کے دنوں میں پیرس واپس آگیا اور پہنچتے ہی پھر جیل میں ڈال دیا گیا۔ پھر ژیل فاور نے قومی اسمبلی کے اسٹیج سے پکار کر کہا کہ پیرس والے داغی مجرموں کو جیلوں سے رہا کئے دے رہے ہیں! ارنسٹ پی کار جسے قومی ڈیفنس والی حکومت کا تیس مارخال کہنا چاہئے، پچھلی شہنشاہی میں وزیر داخلہ بننے کی کوششیں کر کرے تھک گیا تھا، اب ریپبلک کا وزیر مال بن بیٹھا، ایک شخص آرتھر پی کار کا بھائی ہے، جو پیرس کے شیئر بازار سے رویہ مار لینے کے جرم میں نکالا جا چکا ہے (ملاحظہ ہو پولیس پریفیکٹ کی رپورٹ، بابت ۳۱ جولائی ۱۸۶۷ء) اور خود یہ اقبال جرم کر کے سزا کاٹی ہے کہ جس زمانے میں سوسائٹی جنرل (۹۰) کی پالسترو نمبر ۵ شاخ کا ڈائرکٹر تھا، ۳ لاکھ فرانک کی خیانت مجرمانہ کر چکا ہے (ملاحظہ ہو پولیس پریفیکٹ کی رپورٹ، بابت ۱۱ دسمبر ۱۸۶۸ء)۔ اسی آرتھر پی کار کو ارنسٹ پی کار نے اپنے اخبار «Electeur libre» (۹۱) کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ جن دنوں وزارت مالیات کا یہ اخبار سرکاری چھاپ کے جھوٹ بول کر اسٹاک بروکروں کو بدحواس کئے ہوئے تھا، یہی آرتھر پی کار وزارت مالیات اور شیئر بازار کے درمیان دوڑا پھرتا تھا تاکہ فرانسیسی فوج کی تباہی سے اپنا کمیشن وصول کر لے۔ ان لائق بھائیوں کی جوڑی نے جو مالی خط و کتابت کی تھی، وہ ساری کی ساری پیرس کمیون کے ہاتھ لگی۔

ژیل فیری جو ۴ ستمبر سے پہلے ایک فلاش بیرسٹر تھا، محاصرے کے دنوں میں پیرس کے میئر کی حیثیت سے ایسے جوڑ توڑ کرتا رہا کہ

لوگوں کے خالی پیٹ سے اس نے اپنی تجوری بھری۔ جس دن اسے اپنے انتظامی کروتوتوں کا حساب دینا پڑتا، اسی روز سزایاب ہو جاتا۔ ایسے لوگوں کو جیل سے رہائی کا اجازت نامہ [tickets-of-leave]\* صرف پیرس شہر کے ملیے میں ہی مل سکتا تھا اور ہسٹارک کو بھی اسی قماش کے لوگ درکار تھے۔ تیئر جو کل تک حکومت کے پس پردہ کرتا دھرتا بنا ہوا تھا، اب اس نے پتے ایسے پھینٹے کہ خود حکومت کا سربراہ بن بیٹھا اور دس نمبری داخلہ بازوں [ticket-of-leave men] کو اپنا وزیر بنا لیا۔

اس جادو کے بالشتیے، تیئر نے قریب قریب آدھی صدی سے فرانسیسی بورژوازی کا من موہ رکھا تھا کیوں کہ وہ اپنی ذات سے خود بورژوازی کی طبقاتی بدچلنی کا نہایت مکمل اور اعلا نمونہ پیش کرتا ہے۔ سیاست کے میدان میں اترنے سے پہلے وہ مورخ کی حیثیت میں جھوٹ بولنے کی اپنی قابلیت منوا چکا تھا۔ اس کی سماجی زندگی کا روزنامہ فرانس کی مصیبتوں کی روئداد ہے۔ ۱۸۳۰ء سے پہلے تک وہ ریپبلکنوں سے خلا ملا رکھتا تھا، لیکن اپنے سرپرست لافیت سے غداری کر کے بادشاہ لوئی فلپ کے زیر سایہ حکومت میں چپکے سے در آیا اور پھر پادریوں کے خلاف لوگوں میں اشتعال پھیلا کر، بلوے کرا کے جن بلووں میں سین ژرمین ل، اوسے روا کا گرجا گھر اور اسقف اعظم کا محل دھڑلے سے لوٹا گیا، اور پھر نواب زادی دےیری پر خفیہ نظر رکھنے والے وزیر اور آخر اسے جیل تک پہنچوانے والے کی حرکتیں کر کے (۹۲) بادشاہ کی ناک کا بال بن گیا۔ ٹرانسنونان والی سڑک پر ریپبلکنوں کا قتل عام، اور بعد میں اخبارات اور انجمن سازی کے حق کے خلاف ستمبر کے بدنام زمانہ قانون اسی شخص کے کروتوت ہیں (۹۳)۔ مارچ ۱۸۴۰ء میں وہ پھر وزیر اعظم کے رتبے پر نمودار ہوا

\* انگلینڈ میں قاعدہ تھا کہ سز یافتہ لوگ جب اپنی سزا کا بڑا حصہ کاٹ چکے ہوتے تو انہیں ticket-of-leave دے کر جیل سے رہا کر دیا جاتا تھا لیکن رہائی کے بعد وہ پولیس کی نگرانی یا تھانے کی حاضری میں رہتے تھے۔ (اینگلس کا نوٹ)



اور پیرس کی قلعہ بندی کرنے کا نقشہ پیش کر کے اس نے سارے فرانس کو مبہوت کر دیا (۹۴)۔ رپبلکنوں نے جب اس کی تجویز پر الزام عائد کیا کہ یہ پیرس کی آزادی کو جکڑنے کی گندی چال ہے تو اس نے بھری پارلیمنٹ کے سامنے جواب دیا کہ:

”کیا؟ آپ کو یہ خیال کیسے آیا کہ کسی قسم کی قلعہ بندی آگے چل کر آزادی کے لئے خطرہ بن جائے گی؟ سب سے اول تو یہ کہ آپ لوگ خواہ مخواہ بد گمانی میں مبتلا ہیں کہ یہاں کوئی ایسی بھی حکومت ہوگی جو کسی حالت میں شہر پر گولہ باری کا فیصلہ کرے اور اس طرح طاقت اپنے ہاتھ میں رکھے... اگر ایسی کوئی حکومت ہو تو فتح پانے سے پہلے اس کا چلنا جس قدر ناممکن تھا، فتح پانے کے بعد اس سے سو گنا زیادہ ناممکن ہو جائے گا۔“

واقعی، کوئی حکومت پیرس شہر پر قلعوں سے گولہ باری کرنے کا فیصلہ نہ کرتی، سوائے اس حکومت کے جو پہلے ہی ان قلعوں کو پرورشیاہوں کے حوالے کر چکی ہو۔

جب جنوری ۱۸۴۸ء میں شاہ بومبا نے (۹۵) پالیرمو کے مقام پر طاقت آزمائی کی تو یہی تیسرے جو ایک زمانے سے وزارت کے باہر تھا، پارلیمنٹ میں کہنے کے لئے اٹھا:

”حضرات، آپ کو معلوم ہے، پالیرمو میں کیا ہو رہا ہے۔ آپ صاحبان یہ سن کر کانپ اٹھتے ہیں،“ (پارلیمنٹری معنوں میں) ”کہ ۴۸ گھنٹے سے ایک بڑا شہر گولہ باری کا شکار ہے۔ کس کی طرف سے؟ کیا غیرملکی دشمن کی طرف سے جسے جنگ نے گولہ باری کا حق دیا؟ جی نہیں۔ خود اپنی ہی حکومت کی طرف سے۔ وجہ کیا؟ وجہ صرف یہ کہ اس بدنصیب شہر نے اپنے حق طلب کئے تھے۔ حق طلب کرنے کی پاداش میں اس پر ۴۸ گھنٹے گولے برسائے گئے... مجھے اجازت دیجئے کہ یورپ کی رائے عامہ سے اپیل کروں۔ اٹھ

کر پوری آواز میں یورپ کے سب سے اونچے اسٹیج پر یہ الفاظ پکارنا چاہتا ہوں،“ (واقعی محض الفاظ) ”کہ اس قسم کی حرکت کے خلاف غم و غصہ کا اظہار عالم انسانیت کی ایک خدمت ہوگی... جب ریجنٹ اسپارٹیرو نے، جو اپنے ملک کی خدمت کر چکا تھا، (جو خود تیسرے صاحت نے کبھی نہ کی) ”بارسلونا شہر پر، وہاں شورش فرو کرنے کی خاطر گولہ باری کا ارادہ کیا تو دنیا کے گوشے گوشے سے غم و غصہ کی صدائیں گونجنے لگیں۔“

صرف ڈیڑھ سال گزرا تھا کہ شہر روم پر فرانسیسی فوج کی گولہ باری کی حمایت میں یہی موسیو تیسرے سب سے بڑھ کر گرجنے والوں میں شامل تھا (۹۶)۔ سچ پوچھیے تو شاہ بومبا کا قصور اسی قدر نظر آتا ہے کہ وہ صرف ۴۸ گھنٹے گولہ باری کر کے رہ گیا۔

انقلاب فروری ۱۸۴۸ء سے چند روز پہلے، جب وہ گیزو کے ہاتھوں ایک عرصے تک طاقت اور دولت دونوں سے محروم رہنے کے کارن خار کھائے بیٹھا تھا، یہ سونگھ کر کہ کوئی عوامی شورش برپا ہونے والی ہے، اس نے اپنے مخصوص سرفروشانہ انداز میں (جس نے اس کو زنائے دار مکھا مشہور کر دیا ہے) پارلیمنٹ کے ایوان کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

”میرا واسطہ انقلاب پارٹی سے ہے، صرف فرانس میں نہیں، سارے یورپ میں۔ میری تمنا ہے کہ انقلاب کی سرکار اعتدال پسند لوگوں کے ہاتھ میں رہے... لیکن اگر حکومت ان لوگوں کے ہاتھ میں بھی آجائے جو گرم مزاج یا تیز تبدیلیوں کے حامی ہوں، تب بھی اپنے اس مقصد کا دامن نہیں چھوڑوں گا۔ ہمیشہ انقلاب پارٹی کا دم بھروں گا۔“

فروری کا انقلاب پھٹ پڑا۔ بجائے اس کے کہ، جیسا اس بے حیثیت آدمی نے سوچا تھا، گیزو کی وزارت ٹوٹ کر تیسرے کی وزارت بنتی، انقلاب نے لوئی فلپ کو ہٹا کر رپبلک بنا دی۔ عام لوگوں کی فتح کے پہلے



دن تو وہ ہوشیاری سے چھپا رہا اور بھول گیا کہ مزدوروں کی نظر میں اس کا بے حیثیت ہونا ہی ان کی نفرت کا شکار ہونے سے بچا لے گا۔ اپنی دلیری کے افسانوں کے باوجود اس نے منظر عام پر آنے کی ہمت نہ کی لیکن جون سہینے کے قتل عام کی دیر تھی کہ اسے کھل کھیلنے کا پورا موقع مل گیا۔ وہ ضابطہ پارٹی (۹۷) اور اس کی پارلیمنٹری رپبلک کا ایک سرگروہ بن بیٹھا، اس گمنام کھچڑی حکومت کا، جس میں حاکم طبقے کی تمام دست و گریباں ٹکڑیاں سر جوڑ کر عوام کو کچلنے کی سازش میں لگی ہوئی تھیں اور اپنے اپنے گروہ کی باد شاہی جمانے کی فکر میں ایک دوسرے کے خلاف بھی جوڑ توڑ کئے جا رہی تھیں۔ اب کی طرح تب بھی تیسرے نے رپبلکنوں کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا تھا کہ رپبلک کے قدم جمنے میں وہی ایک رکاوٹ ہیں۔ جیسے جلاد نے دون کارلوس سے کہا تیسرے نے بھی اسی طرح رپبلک سے تب کہہ دیا تھا کہ ”میں تیری گردن کاٹوں گا، مگر تیری ہی بھلائی کے لئے“، اور تب کی طرح اب بھی وہ اپنی بازی جیتنے پر صدا لگا کر رہے گا کہ L'Empire est fait — سلطنت تیار ہے۔ اگرچہ اس شخص کی زبان پر لازمی آزادیوں کا ظاہر پرچار ہے، اور لوئی بوناپارٹ کی طرف سے دل میں غبار بھرا ہے، کہ اس نے مجھے بے وقوف بنایا اور پارلیمنٹری طرز حکومت کو نکال باہر کیا، اور خوب جانتا ہے کہ پارلیمنٹری نظام کی مصنوعی فضا سے نکل کر اس کی حیثیت ملیامیٹ ہو جاتی ہے، تاہم اسی تیسرے دوسری شہنشاہی کے سارے گندے لچھنوں میں ہاتھ رنگے، روم پر فرانسیسی فوجوں کے قبضے سے لے کر پروشیا سے جنگ چھڑنے تک سب کرموں میں شریک رہا۔ جرمنوں کے ایک ہونے پر اتنا زہر اگلا کہ جنگ تک نوبت پہنچا دی، جرمنوں کا ایک ہونا اسے پروشیائی استبداد کا پردہ تو نظر نہ آیا البتہ جرمنوں میں نااتفاقی رہنے کا فرانس کو جو لازوال حق حاصل تھا اس میں رخنہ پڑ گیا۔ اس بالشتیے کو بہت شوق تھا کہ یورپ کی آنکھوں کے سامنے نپولین اول کی تلوار چمکایا کرے اور اپنی تاریخی تصنیفوں میں وہ نپولین اول کے جوتے چمکانے کی خدمت بھی خوب انجام دے چکا تھا۔ حقیقت میں اس کی خارجہ پالیسی ہمیشہ

فرانس کو ذلت کی تہہ میں اتارنے کے کام آتی رہی، ۱۸۴۰ء کے لندن کنونشن (۹۸) سے لے کر ۱۸۷۱ء میں پیرس کے ہتھیار ڈالنے تک اور اب اس خانہ جنگی تک یہی عمل جاری رہا جس میں بسمارک کی خاص منظوری سے اس نے سیدان اور میتز کے جنگی قیدیوں کو پیرس پر ٹوٹ پڑنے کے لئے ہشکارا ہے (۹۹)۔ اپنی قابلیتوں کی رنگارنگی اور شوق کی کروٹوں کے باوجود اس شخص نے ساری زندگی پرانی لکیر پیٹنے میں بسر کی ہے۔ یہ جتانے کی ضرورت نہیں کہ جدید سوسائٹی میں جو گہرے دھارے رواں ہیں، وہ ہمیشہ اس کی رسائی سے باہر ایک راز رہے ہیں۔ لیکن اوپر کی سطح پر جو تبدیلیاں نظر کے سامنے رہتی ہیں وہ بھی اس دماغ کی گرفت میں نہیں آتیں جس دماغ کی ساری طاقت زبان نے کھینچ لی ہے۔ مثلاً فرانس کے پرانے سرپرستانہ سسٹم سے ادھر ادھر ہٹنے کو وہ ایسا قصور سمجھ کر کوستا تھا جس سے ایمان میں خلل آگیا ہو۔ جب وہ لوئی فلیپ کا وزیر تھا تو اس نے ریلوے پر دیوانہ بن کے فقرے کسے اور جب لوئی بوناپارٹ کے زمانے میں مخالف پارٹی میں تھا تو فرانس کے سڑے گلے فوجی نظام میں اصلاح کی ہر ایک کوشش پر داغ لگا دیا۔ اپنی سیاسی زندگی کے طول طویل عرصے میں کبھی ایک بھی، معمولی سی خطا بھی اس سے سرزد نہیں ہوئی کہ کسی قدر عملی فائدے کا کام کیا ہو۔ تیسرے صرف دولت کی حرص اور دولت پیدا کرنے والوں سے نفرت میں ہی پکا تھا۔ جب اسے لوئی فلیپ کے زمانے میں پہلی بار وزارت کا موقع ملا تو بالکل مفلس تھا، وزارت چھوڑی تو لکھ پتی بن چکا تھا۔ اسی بادشاہ کے زمانے میں جب آخری بار وزیراعظم رہا (پہلی مارچ ۱۸۴۰ء سے) تو کھلے ایوان میں اس پر سرکاری رقمیں غبن کرنے کا الزام لگا، جس کا جواب اتنا ہی تھا کہ وہ آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ یہ اتنا سستا نسخہ ہے کہ ژیلول فاور اور ہر طرح کے مگرچہ اس میں شریک رہے ہیں۔ بورڈو میں اس نے فرانس کو مالی دیوالیہ پن کے خطرے سے بچانے کی اولین تدبیر یہ کی کہ اپنے لئے تیس لاکھ سالانہ تنخواہ مقرر کرائی۔ یہ اس ”کفایت شعار رپبلک“ کا پہلا اور آخری حرف تھا جس کے دریا ۱۸۶۹ء میں پیرس کے اپنے ووٹروں کے لئے بہادئے تھے۔ ۱۸۳۰ء کی



پارلیمنٹ میں اس کے ایک پرانے رفیق کار موسیو بیلے نے، جو خود سرمایہ دار ہو کر بھی پیرس کمیون میں دل و جان سے شریک ہیں، کچھ دن پہلے ایک عام اشتہار میں تیسرے کو ان لفظوں سے خطاب کیا تھا:

”محنت کو سرمائے کا غلام بنانا ہمیشہ سے تمہاری سیاست کا نشان راہ بنا رہا ہے۔ اور اسی وقت سے جب پیرس کے ٹاؤن ہال میں محنت کی رپبلک قائم ہوئی، تم پورے فرانس سے یہ کہتے نہیں تھکے کہ لو، یہ رہے مجرم!“

چھوٹے موٹے سرکاری جوڑتوڑ کا استاد، دروغ حلفی اور غداری میں باکمال، سبھی قسم کے روکھے پھیکے حربوں، ہتھکنڈوں، ادنادرچے کے داؤ پیچ اور پارلیمنٹ والی پارٹیوں کی چھینا جھپٹی کی گھٹیا تکریموں میں چلتا پرزہ؛ جب عہدہ ہاتھ میں نہ ہو تو انقلاب کی آگ لگانے تک سے باز نہ آنے والا، اور طاقت ہاتھ میں آئے تو انقلاب کو خون میں ڈبونے والا؛ خیال یا نظریے کے بجائے طبقاتی تعصب اور دل و جذبہ کی جگہ خود پسندی کا شکار، یہ شخص جس کی نجی زندگی بھی اتنی ہی گندی ہے جتنی گھناؤنی سماجی زندگی، یہ تیسرے آج فرانسیسی سولا کا پارٹ ادا کرتے وقت بھی اپنی حرکات کے سفلے پن کو مضحکہ خیز شیخی خوری کے ذریعے ابھارنے سے باز نہیں آتا۔ پیرس نے ہتھیار ڈالے، اور پروشیا کو نہ صرف پیرس، بلکہ پورا فرانس حوالے کر دیا تو اسی کے ساتھ تکریموں کا وہ سلسلہ دراز بند ہو گیا جو ۴ ستمبر کو ہی طاقت ہتھیا لینے والوں نے، بقول تروشیو کے، دشمن سے ساز باز کر کے شروع کر دیا تھا۔ دوسری طرف ہتھیار ڈالنے کے سبب اس خانہ جنگی کی ابتدا ہو گئی جسے وہ لوگ پروشیا والوں سے مل کر رپبلک اور پیرس کے خلاف چلانے لگے۔

ہتھیار ڈالنے کی شرطوں میں ہی ایک چال رکھی گئی تھی۔ اس وقت ملک کا ایک تہائی سے زیادہ علاقہ دشمن کے ہاتھ میں تھا، راجدھانی کا صوبوں سے رابطہ ٹوٹ چکا تھا، رسل و رسائل کے سبھی ذریعے بگڑے ہوئے تھے۔ ایسی حالت میں، جب تک تیاری کی کافی مہلت نہ مل جائے، ایسے لوگوں کا چناؤ ناممکن تھا جو واقعی فرانس کے نمائندے

ہوں۔ اور اوپر سے شرط یہ لگی ہوئی کہ قومی اسمبلی کا چناؤ آٹھ دن کے اندر ہو جانا چاہئے۔ نتیجہ یہ کہ ملک کے بہت سے حصوں میں الکشن ہونے کی خبر عین الکشن کے وقت پہنچ سکی۔ مزید یہ کہ ہتھیار ڈالنے کی ایک اور خاص شرط کے مطابق قومی اسمبلی کا چناؤ صرف اس غرض سے ہونا تھا کہ وہ جنگ یا صلح کا فیصلہ کرے اور وقت ضرورت صلح نامے پر دستخط کر دے۔ باشندوں کے دل میں یہ خیال بیٹھ چکا تھا کہ جنگ بندی کی شرطوں نے جنگ جاری رکھنے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی اور ایسی صلح کی منظوری دینے کے لئے جو بسمارک کے دباؤ میں کی جائے، فرانس کے بدترین لوگ ہی بہترین ثابت ہوتے۔ اتنی کچھ پیش بندیاں کر لینے کے باوجود تیسرے نے، اس سے پہلے کہ جنگ بندی کا راز پیرس والوں تک پہنچے، شہر چھوڑ دیا اور صوبوں میں انتخابی دورہ کرنے کے لئے نکل کھڑا ہوا، نیت یہ تھی کہ جائزوارث والی (Legitimist) پارٹی (۱۰۰) کے تن مردہ میں جان ڈالی جائے کیوں کہ اس پارٹی کو اورلین والوں سے مل کر بونا پارٹ کے گروہ کی جگہ لینی تھی جو فی الحال ناقابل برداشت ہو چکا تھا۔ تیسرے کو اب جائزوارث والوں سے کوئی ڈر نہیں تھا۔ یہ لوگ جدید فرانس کی حکومت چلانے کے تو اہل تھے نہیں، حریف یا رقیب بن کر کیا بگاڑ لیتے، اس پارٹی کی تمام تر سرگرمی خود تیسرے کے بقول (جو ۵ جنوری ۱۸۳۳ء کو وہ ایوان پارلیمنٹ میں کہہ چکا تھا)

”صرف تین پایوں پر کھڑی تھی: باہر کا حملہ، خانہ جنگی اور افراتفری۔“

اس لئے یہی پارٹی انقلاب کے توڑ پر آلہ کار بننے کے لئے انتہائی کارآمد نظر آئی۔ جائزوارث والے اس عقیدے میں مگن تھے کہ پہلے کی سی ہزار سالہ موعودہ سلطنت پھر قائم ہوگی۔ اور یہاں غیرملکی فاتحوں کے بوٹوں تلے فرانس پھر کچلا جا رہا تھا، پھر سلطنت سرنگوں ہو گئی تھی، اور بونا پارٹ پھر قیدی بن چکا تھا؛ جائزوارث والے پھر کفن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ تاریخ



کا پہلیہ الٹا گھوم گیا تاکہ ۱۸۱۶ء کے «Chambre introuvable» (انوکھے دربار) (۱۰۱) کے سامنے پہنچ کر تہم جائے۔ ۱۸۳۸ء سے ۱۸۵۱ء تک رپبلک کی قومی اسمبلیوں میں ان کی نمائندگی تعلیم یافتہ اور پارلیمنٹری معاملات کے منجھے ہوئے لوگ کیا کرتے تھے مگر اب جو پارٹی کے عام ممبروں نے ہلہ بولا تو گویا فرانس کے سارے موٹی عقل کے چودھری \* اسمبلی میں بھر گئے۔

جیسے ہی ”چودھریوں کی چوپال“، (۱۰۲) وردو میں بیٹھی، تیسرے نے صاف لفظوں میں اسے جتا دیا کہ صلح کی ابتدائی باتوں کی منظوری فوراً دے دینی چاہئے، اس کے لئے پارلیمنٹ کے مباحثے تک کی گنجائش نہیں ہے، یہ ایک شرط پوری ہونی ہے تاکہ پروشیا والے فرانسیسی رپبلک اور اس کے گڑھ پیرس پر جنگ کا دروازہ کھولنے کی اجازت دے دیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انقلاب کے دشمنوں کے پاس سوچ بچار کا وقت بھی نہ تھا۔ دوسری شہنشاہی نے قومی قرضے دو گنے سے بھی زیادہ پہنچا دئے تھے اور ملک کے بڑے بڑے شہر بھاری میونسپل قرضوں میں دب گئے تھے۔ جنگ نے قرض کے بوجھ خطرناک حد تک بڑھا دئے تھے اور قوم کی آمدنی کے ذرائع بے دردی سے تباہ کر ڈالے تھے۔ تباہی میں جو رہی سہی کسر تھی اسے پورا کرنے کو، پروشیائی شائی لاک فرانس کی سر زمین پر اپنی پانچ لاکھ فوج کا خرچ اور ۵ ارب تاوان جنگ وصول کرنے کے لئے، جس میں بقایا پر پانچ فیصدی سود بھی دینا تھا، پکی دستاویز لئے موجود تھا۔ اس کا بھگتان کون کرے؟ صرف رپبلک کا تختہ بزور طاقت الٹ کر دولت پر ہاتھ صاف کرنے والے وہ لوگ جنہوں نے خود جنگ چھیڑی تھی، جنگ کے خرچوں کا سارا بار دولت پیدا کرنے والوں کے سر ڈال سکتے تھے۔ اس طرح سے فرانس کے خاک و خون میں مل جانے کی وجہ سے زمین جائداد اور سرمائے کے ان نمائندہ معبان وطن کو یہ شہ ملی کہ غیرملکی فاتح

\* مارکس نے یہاں Pourceaugnac کا لفظ لکھا ہے جو مولیئر کے ڈرامے میں ایسا کیرکٹر ہے جس سے چھوٹی حیثیت اور موٹی عقل کے زمیندار کی تصویر ابھرتی ہے۔

کی نظر کے سامنے اور اس کے زیر سایہ، باہر سے آئی ہوئی جنگ پر خانہ جنگی، یا بردہ فروشوں کی شورش بھی لاد دیں۔

اس سازش کے راستے میں صرف ایک ہی رکاوٹ تھی، پیرس کی رکاوٹ۔ اور کابیابی کی اولین شرط یہ تھی کہ پیرس سے ہتھیار لئے جائیں۔ چنانچہ اسی شہر سے تیسرے نے ہتھیار رکھ دینے کے لئے کہا۔ وہ سب ترکیبیں کی گئیں جن سے پیرس کے صبر کا پیمانہ چھلک جائے: ”چودھریوں کی چوپال“، نے رپبلکنوں کے خلاف بڑا ہائے واویلا مچایا؛ خود تیسرے نے رپبلک کے قانونی وجود پر کافی دورخی باتیں کہہ ڈالیں؛ پیرس کو دھمکی دی گئی کہ سراتار لیا جائے گا، یعنی شہروں کا سرتاج نہیں رہنے دیا جائے گا؛ اورلین والوں کو سفارت کے عہدے بخشے گئے؛ دیوفور نے مقررہ میعاد میں سرکاری قرضے اور کرایہ مکان ادا نہ کرنے پر سخت قانون (۱۰۳) بنادئے، ایسے قانون جن سے پیرس کا بیوپار اور صنعتی کاروبار بالکل اکھڑ جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا؛ پویسے کرتیے کے حکم سے خواہ کوئی اشاعت ہو، اس پر فی کابی دو سینٹیم ٹیکس لگ گیا؛ بلانکی اور فلورنس کے لئے سزائے موت کا اعلان ہوا؛ رپبلکن خیالات کے اخبار بند کر دئے گئے؛ قومی اسمبلی کو وارسائی میں منتقل کر دیا گیا؛ پالیکاؤ نے شہر کے محاصرے کی جس حالت کا اعلان کیا تھا، اور جسے ۴ ستمبر کے واقعات نے اٹھا دیا تھا، وہ پھر سے لگا دی گئی؛ décembriseur (۱۰۴) وینوا کو پیرس کا گورنر مقرر کیا گیا؛ بوناپارٹ کا ژندارم (سیاسی پولیس افسر) والن تین پولیس پریفیکٹ بنا، اور یسوعی فرقے کے جنرل اوریل دی پلاڈین کو پیرس کے نیشنل گارڈ کا کمانڈر انچیف بنا کر بٹھا دیا گیا۔

یہاں ہم مسٹر تیسرے اور اس کے ہالی موالی، قومی ڈیفنس کی سرکار کے ممبروں سے ایک سوال کرنا چاہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ تیسرے نے اپنے وزیر مالیات پویسے کرتیے کے ذریعے دو ارب کا قرضہ لیا تھا۔ یہ سچ ہے یا نہیں کہ:

(۱) یہ سودا اس ترکیب سے کیا گیا کہ تیسرے، ژیل فاور، ارنسٹ پی کار، پویسے کرتیے اور ژیل سیموں کو اس سے کئی کروڑ کی رقم ہاتھ آگئی؟



۲) شرط رکھی گئی کہ جب پیرس میں ”اسن چین“ ہو چکے گا تب ادائیگی کی باری آئے گی (۱۰۰)؟

بات جو بھی ہو، کسی کارن انہیں اس معاملے کی بہت جلدی پڑی تھی کیوں کہ تیسر اور ریول فاور نے نہایت بے شرمی کے ساتھ یہ کوشش کی کہ بورڈ کی اسمبلی کی اکثریت کی تائید ہو جانے کے بہانے پیرس بے شرمی سے پروشیائی فوج کے حوالے کر دیں۔ لیکن بسمارک کی یہ نیت نہیں تھی جیسا کہ اس نے جرمنی واپس پہنچنے پر فرینکفرٹ کے تنگ نظر بغلیں بحانے والوں کو ہنس ہنس کر اور باآواز بلند سنایا تھا۔

۲

انقلاب دشمن سازش میں کوئی بھاری رکاوٹ تھی تو ہتھیار بند پیرس۔ اس لئے پیرس کو نہتا کرنا تھا۔ اس سوال پر بورڈ کی اسمبلی نے اپنی نیت بہت کھلے لفظوں میں ظاہر کردی۔ اگر اس ”چودھریوں کی چوپال“ کے ممبروں کی غضبناک گرج سے یہ بات اتنی کھل کر نہ آتی، تب بھی پیرس کو تیسر نے جس طرح *décembreur* وینوا، بوناپارٹ والے سیاسی پولیس افسر والن تین اور یسوعی فرقے کے جنرل اوریل دی پلادین کے رحم و کرم پر چھوڑا، وہی ہر قسم کا شبہ دور کرنے کو کافی تھا۔ ان سازشیوں نے پیرس کے ہتھیار لے لینے میں اپنی اصلی نیت اس بدتمیزی سے ظاہر کی کہ ایک انتہائی نامعقول اور بے حیائی کا بہانہ تراش کر سنا دیا۔ تیسر نے اعلان کیا کہ پیرس کے نیشنل گارڈ کا توپ خانہ سرکاری ملکیت ہے، اس لئے سرکار کو واپس کیا جانا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہتھیار ڈال دینے کے اول روز سے جب بسمارک کے ان قیدیوں نے پورا فرانس حوالے کرنے کے کاغذ پر دستخط کئے، لیکن خاص اس غرض سے کہ پیرس پر رعب داب رکھیں، اپنی ذاتی حفاظت کے بہت سارے ہتھیار بند دستے بچا کر رکھ لئے، شہروالے خبردار ہو گئے۔ نیشنل گارڈ نے پھر سے اپنی تنظیم کی اور سارے اختیارات کا مالک ایک مرکزی کمیٹی کو بنا دیا جو بوناپارٹ کے چند پرانے دستوں کے بعض ٹکڑے چھوڑ کر،

باقی تمام نیشنل گارڈ والوں کے ووٹ سے چنی گئی تھی۔ جب وہ وقت آیا کہ پروشیائی فوجیں شہر میں داخل ہوں، مرکزی کمیٹی نے یہ انتظام کیا کہ وہ توپیں اور سترالیوز جو ہتھیار ڈالنے کے حاسی دغا فریب سے خاص انہی ٹھکانوں میں یا ان کے آس پاس چھوڑ گئے تھے جہاں پروشیائی فوج کو چھاونی ڈالنی تھی، وہاں سے اٹھا کر مونمارتر، بیلویل اور لاویلٹ میں رکھوا دیں۔ یہ وہ توپخانہ تھا جو نیشنل گارڈ کے چندوں سے جوڑا گیا تھا۔ ۲۸ جنوری کو ہتھیار ڈالنے کی دستاویز میں بھی اس کی یہ پرائیویٹ حیثیت مانی گئی تھی اور خاص اسی حیثیت سے وہ ان ہتھیاروں کی فہرست سے بھی خارج رکھا گیا تھا جو سرکاری ملکیت میں شمار ہو کر فاتح کے سامنے ڈال دئے جاتے۔ مگر یہ شخص تیسر پیرس کے سر پر جنگ لانے کے چھوٹے سے چھوٹے بہانے سے بھی ایسا خالی ہاتھ ہو چکا تھا کہ اسے اتنا سفید جھوٹ بولنا پڑا کہ نیشنل گارڈ کا توپخانہ سرکاری ملکیت ہے! اس توپخانے پر قبضہ کر لینا صاف صاف ایک ابتدائی قدم تھا اس غرض سے کہ پیرس کو بالکل ہی نہتا کر دیا جائے اور پھر ۴ ستمبر کا انقلاب بے بس ہو کر رہ جائے۔ لیکن یہ وہ انقلاب تھا جو فرانس کی قانونی حیثیت بن چکا تھا۔ ہتھیار ڈالنے کی دستاویز تک میں فاتح طاقت رپبلک کو تسلیم کر چکی تھی جو اسی انقلاب کی دین تھی۔ اور ہتھیار ڈالنے کے فوراً بعد باہر کی طاقتوں نے بھی اسے مان لیا تھا اور اسی کی طرف سے قومی اسمبلی طلب کی گئی تھی۔ بورڈ میں بیٹھی ہوئی قومی اسمبلی اور اس کی انتظامی طاقت دونوں کی قانونی حیثیت اسی انقلاب کی بدولت تھی جو پیرس کے محنت کشوں نے ۴ ستمبر کو برپا کیا تھا۔ اگر یہ انقلاب نہ ہوا ہوتا تو پھر قومی اسمبلی کو فوراً اس قانون ساز اسمبلی کے لئے جگہ خالی کرنی پڑتی جو پروشیا کی نہیں بلکہ فرانس کی حکومت کے سائے میں عام رائے دہندگی کی بنا پر ۱۸۶۹ء میں چنی گئی تھی اور انقلابی ہنگامہ اس اسمبلی کو نکال باہر کر چکا تھا۔ اگر ۴ ستمبر کے انقلاب کی قانونی حیثیت نہ ہوتی تو تیسر اور اس کے داخلہ باز دس نمبروں کو، کائینا (۱۰۶) جانے کی سزا سے بچنے کے لئے لوئی بوناپارٹ کے دستخطوں سے نیک چلنی کی



ضمانت داخل کرنی پڑتی۔ یہ قومی اسمبلی، جسے پروشیا کے ساتھ صلح کی شرطیں طے کرنے کا مختار بنایا گیا، خود اسی انقلاب کے واقعات میں سے ایک واقعہ تھی اور اس کی اصلی ہستی ہتھیاربند پیرس کی صورت میں آنکھوں کے سامنے تھی، اس پیرس کی صورت میں، جس نے یہ انقلاب برپا کیا، وہ پیرس جس نے انقلاب کی خاطر پانچ مہینے تک پیٹ پر پتھر باندھ کر، مصیبتیں بھر کر محاصرے کا مقابلہ کیا، وہ پیرس جس نے تروشیو کی چالوں سے بے نیاز ہو کر، غنیم سے مسلسل ٹکر لیتے ہوئے یہ راہ بنائی کہ صوبوں میں جم کر اپنی حفاظت کی جنگ جاری رکھی جائے۔ اور اب پیرس کے سامنے دو ہی راستے رہ گئے تھے: یا تو بورڈو کے فتنہ پرور بردہ فروشوں کے توہین آمیز حکم پر اپنے ہتھیار رکھ دیتا، اور یہ مان لیتا کہ ۴ ستمبر کے انقلاب کا مطلب سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ لوئی بوناپارٹ کے ہاتھ سے طاقت نکل کر تخت و تاج کے دوسرے دعویداروں کو چلی جائے، یا پھر فرانس کی خاطر تن من دھن کی قربانی کے لئے اسے اٹھ کھڑے ہونا تھا، وہ فرانس جسے انتہائی بربادی سے بچانے اور نئی زندگی کی روح دوڑانے کی بس ایک ہی سبیل رہ گئی تھی کہ ان سیاسی اور سماجی حالات کے بندھن انقلابی وار سے کاٹ کر پھینک دئے جائیں جن کی بدولت دوسری شہنشاہی پنبی تھی اور اس کی سرپرستی میں وہ اور بھی گل سڑ چکے تھے۔ پانچ مہینے کی فاقہ کشی نے پیرس کو نڈھال کر رکھا تھا مگر اس کے پاؤں میں زرا لغزش نہ آئی۔ ہمت مردانہ نے اسے ان فرانسیسی سازشیوں سے ٹکر لینے پر کمربستہ کر دیا، حالانکہ خود فرانس کے قلعوں سے پروشیائی توپیں اپنے دھانے کھولے کھڑی تھیں۔ پیرس کو جس خانہ جنگی میں پھنسانے کی کوشش کی جا رہی تھی، اس کو رد کرتے ہوئے مرکزی کمیٹی برابر ڈیفنس کی پوزیشن پر قائم رہی اور اس نے نہ اسمبلی کی اشتعال انگیزی پر دھیان دیا، نہ انتظامیہ کی غاصبانہ حرکتوں پر، نہ اس خطرے سے وہ بدحواس ہوئی کہ پیرس کے اندر اور باہر فوجوں کی یورش بڑھتی جا رہی ہے۔

اور اب تیسرے نے خانہ جنگی شروع کر دی۔ اس نے پولیس والوں اور کئی چھاوٹی رجمنٹوں کو وینوا کی سرکردگی میں رات کی تاریکی

میں بھیج کر مون مارتر پر ڈاکہ ڈلوا دیا تاکہ نیشنل گارڈ کے توپخانے پر ایک ایک قبضہ کر لیا جائے۔ سب کو معلوم ہے کہ نیشنل گارڈ کے منہ توڑ مقابلے اور فوجیوں کے عام لوگوں سے مل جانے کی بدولت اس کوشش کا کیا انجام ہوا۔ اوریل دی پلاڈین فتح کا خبرنامہ پیشگی ہی چھاپ ڈالنے والا تھا اور تیسرے کے پاس coup d'état (حکومت کا تختہ الٹنے) کو مکمل کرنے والے احکام لکھے ہوئے تیار تھے۔ ان سب پر پانی پھر گیا اور ان کی جگہ ایک اعلان عام نکلا جس میں تیسرے کے اس شریفانہ فیصلے کی خبر درج تھی کہ نیشنل گارڈ کے ہتھیار اسی کو بخشے جاتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ فتنہ پردازوں سے نمٹنے میں نیشنل گارڈ حکومت کے گرد جمع ہو کر ان ہتھیاروں سے کام لے گا۔ نیشنل گارڈ کے ۳ لاکھ جوانوں میں سے صرف تین سو ایسے نکلے جنہوں نے بالشتیے تیسرے کی صدا پر کان دھرے تاکہ اسے خود اپنوں سے بچانے کے لئے گرداگرد حلقہ بنالیں۔ مزدوروں کا ۱۸ مارچ والا شاندار انقلاب پورے پیرس کو اپنی رو میں بہالے گیا۔ مرکزی کمیٹی اس کی عارضی سرکار قرار پائی۔ معلوم ہوا کہ یورپ لمحہ بھر کو تو ٹھٹک کر رہ گیا کہ سرکار اور جنگ کے جو سنسنی خیز واقعات آنکھوں دیکھتے گزرے ہیں وہ حقیقت بھی ہیں یا نہیں: کہیں بھولے پسرے دنوں کا خواب تو نہیں دیکھا؟

۱۸ مارچ سے لے کر اس دن تک جب وارسائی کی فوجیں پیرس میں گھس پڑیں، پرولتاری انقلاب جبر اور زیادتی کی ان حرکتوں سے جو ”اونچے طبقوں“ کے انقلاب، خاص کر انقلاب دشمن ہنگاموں میں ضرورت سے زیادہ ہوا کرتی ہیں، اتنا پاک صاف رہا کہ دشمنوں کے پاس ہائے واویلا بچانے کے لئے جنرل لیکونت اور جنرل کیماں تھامس کی پھانسی اور ویندوم والے واقعے کے سوا کوئی اور بہانہ تک نہیں رہ گیا۔

بوناپارٹ کے فوجی افسروں میں سے ایک شخص، جنرل لیکونت، جو مون مارتر پر رات کو چڑھائی کرنے گیا تھا، اس نے چھاوٹی کی ۸۱ ویں رجمنٹ کو چار بار حکم دیا کہ پیگال چوک کے مجمع پر گولی چلاؤ۔ جب فوجیوں نے حکم نہ مانا تو وہ بازاری گالیوں پر اتر آیا۔



اس کے جوانوں نے عورتوں اور بچوں کو بھون ڈالنے کے بجائے اسی کو گولی سے اڑا دیا۔ مزدور طبقے کے دشمنوں کے زیر تربیت رہ کر فوج والوں میں جو عادتیں خوب پختہ ہو چکی ہوں، اگر خود فوجی اپنی صف بدل کر مزدوروں میں آلیں تو وہ عادتیں چٹکی بجاتے نہیں بدلا کرتیں۔ انہی فوجیوں نے جنرل کلیماں تھامس کو بھی گولی مار دی۔

”جنرل“، کلیماں تھامس جو پہلے اپنے کوارٹر ماسٹر سرجنٹ کے عہدے سے کچھ خوش نہیں تھا، لوئی فلپ کے آخر دور حکومت میں ریپبلکن اخبار ”نیشنل“ (۱۰۷) کی ملازمت میں آگیا اور دوہری ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ ایک تو چیف ایڈیٹر کا قائم مقام \* (gérant responsable) بنا، دوسرے اس چومکھی لڑنے والے اخبار کے کالموں میں اس نے دو بدو لڑنا شروع کر دیا۔ جب فروری ۱۸۴۸ء کا انقلاب ہوا اور ”نیشنل“، اخبار والے طاقت میں آگئے تو انہوں نے اس پرانے کوارٹر ماسٹر کو پلٹ کر پھر جنرل بنا دیا۔ اور یہ واقعہ جون ۱۸۴۸ء کی اس سفاکی کے موقع پر ہوا جس کی ذلیل سازشی تیاری میں وہ ٹیول فاور کی طرح خود شریک بھی تھا اور اس کا سب سے بے درد جلاذ بھی بنا۔ اس خونی واقعے کے بعد وہ پھر نظروں سے اوجھل رہا اور پہلی نومبر ۱۸۷۰ء تک کہیں نمودار نہیں ہوا۔ عین اس سے ایک روز پہلے ڈیفنس کی سرکار نے، جو ٹاؤن ہال میں گھر گئی تھی، بلانکی اور فلورنس اور مزدوروں کے دوسرے نمائندوں سے حلفیہ وعدہ کیا کہ جو طاقت انہوں نے ہتھیائی ہے وہ اس کمیون کے حوالے کر دیں گے جو پیرس کے آزادانہ ووٹ سے چنا جائے (۱۰۸)۔ اپنا وعدہ تو کیا پورا کرتے انہوں نے پیرس پر تروشیو کے ”برے تن“، شکاری چھوڑ دئے جنہوں نے بوناپارٹ کے کورسیکی فوجیوں کی جگہ لے لی (۱۰۹)۔ تنہا ایک جنرل تمیزیے تھا جس نے اس وعدہ خلافی کا الزام اپنے سر لینے سے انکار کر دیا اور نیشنل گارڈ کے کمانڈر انچیف

\* ۱۸۷۱ء اور ۱۸۹۱ء کے جرمن ایڈیشنوں میں یہاں یہ الفاظ تھے: ”وہ جو خود قید و بند اپنے سر لیتا ہے“۔ (ایڈیٹر)

کے عہدے سے استعفا دے دیا۔ کلیماں تھامس اس کی جگہ پھر جنرل بن گیا۔ جب تک وہ اپنے عہدے پر رہا، پروشیائی فوج سے جنگ کرنے کے بجائے پیرس نیشنل گارڈ سے لڑتا رہا۔ ان کے ہتھیار بند ہونے میں رکاوٹیں ڈالیں، محنت کشوں کی بٹالینوں کے سامنے بورژوازی کی بٹالینیں لگا دیں، ان افسروں کو چن چن کر نکالا جو تروشیو کے ”منصوبے“ کے خلاف تھے اور انہی پرولتاری بٹالینوں کو بزدلی کا الزام لگا کر توڑا، جن کی سورشائی جانی دشمنوں تک کو آج حیرت میں ڈالے ہوئے ہے۔ کلیماں تھامس پھولے نہیں سماتا تھا کہ پھر ایک موقع ہاتھ آگیا ہے پیرس کے پرولتاری طبقے سے اپنا ذاتی بغض نکالنے کا، جو ۱۸۴۸ء کے جون والے قتل عام میں ابھر کر آیا تھا۔ ۱۸ مارچ کی تاریخ سے چند روز پہلے ہی اس نے وزیر جنگ لے فلو کے سامنے اپنی اسکیم رکھی کہ ”پیرس کے \* canaille میں چنے ہوئے لوگوں کا ہمیشہ کے لئے قصہ ہی پاک کر دیا جائے“۔ وینوآ کی شکست کے بعد اس سے رہا نہ گیا اور جائے واردات پر ایک شوقیہ جاسوس بن کر جا پہنچا۔ کلیماں تھامس اور لیکونت کی موت کی ذمہ داری مرکزی کمیٹی اور پیرس کے مزدوروں پر بس اتنی ہے جتنی پرنس آف ویلز (برطانوی راجکمار) پر ان لوگوں کی موت کی ذمہ داری، جو لندن میں شاہی سواری کے داخلے کے دن بھیڑ میں کچل کر مر گئے۔

ویندوم میدان پر نہتے لوگوں کا قتل عام ایک من گھڑت کہانی ہے جس پر خود تیئر اور ”چودھریوں کی چوپال“، دونوں بے وجہ خاموش نہیں رہے۔ لیکن اسے پھیلانے کا کام چن کر یورپی اخبار نویس کے دم چھلوں کو دے دیا گیا۔ وہ جو ”ضابطہ پسند“ بنے پھرتے تھے، پیرس کے رجعت پرست، ۱۸ مارچ کی جیت کی خبر سن کر کانپ اٹھے۔ ان کی نظر میں یہ واقعہ ایسا تھا گویا عوام نے اپنے یوم حساب کا صور پھونک دیا۔ جون ۱۸۴۸ء سے لے کر ۲۲ جنوری ۱۸۷۱ء تک (۱۱۰) جتنے لوگ ان کے ہاتھوں خاک و خون میں ملے تھے، وہ نظروں میں پھرنے لگے۔ بد حواسی ہی ان ظالموں کی سزا بن گئی۔ پولیس

\* گرے پڑے بے حیثیت لوگ۔ (ایڈیٹر)



افسروں کے، تہ صرف یہ کہ ہتھیار نہیں چھینے، انہیں گرفتار نہیں کیا، جو کرنا چاہئے تھا، بلکہ پیرس شہر کے پھانک چوٹ کھول دئے گئے تاکہ وہ نکل کر خیریت سے وارسائی پہنچ جائیں۔ ان ”ضابطہ پسندوں“ کو نقصان پہنچانا تو درکنار، یہ موقع بھی دے دیا گیا کہ وہ اکٹھے ہو جائیں، انہوں نے شہر کے خاص مرکز میں ہی چپ چاپ کئی ایک اڈے جمائے۔ مرکزی کمیٹی کی اس رواداری کو، مسلح مزدوروں کی اس عالی ظرفی کو، جو ضابطہ پارٹی کے برتاؤ سے اس قدر مختلف تھی، اس پارٹی نے مزدوروں کی بے بسی کا اقرار سمجھا۔ اسی لئے ضابطہ پارٹی والوں کو بے عقلی کا ایک پلان سوجھا، یہ کہ ظاہر میں ایک بے ہتھیار جلوس نکال کر وہ کام بنانے کی کوشش کی جائے جو وینوا اپنی توپوں اور مترالیوزوں سے نہیں نکال سکا تھا۔ ۲۲ مارچ کو کھاتے پیتے خوشحال محلوں سے فیشن ایبل صاحبان کا ایک ہجوم چلا، جس میں ہر قسم کے \* petits crevés بھرے تھے۔ جلوس کے آگے آگے شہنشاہی کے مشہور پروردہ، جیسے ہیکرین، کیوت لوگل، آنری دی پین، وغیرہ تھے۔ بزدلی کے مارے پر امن جلوس کا پردہ رکھا تھا لیکن اندر سے ڈاکوؤں کے ہتھیاروں سے لیس، یہ بد معاش مارچ کرتے ہوئے بڑھے، راستے میں اکادکا پہرے کے نیشنل گارڈ والوں اور چوکیوں سے ہتھیار چھینتے اور ان کی توہین کرتے چلے جا رہے تھے۔ دے لاپسے روڈ سے نکلتے وقت انہوں نے نعرے لگائے ”مرکزی کمیٹی مردہ باد! قاتل مردہ باد! قومی اسمبلی زندہ باد!، اور کوشش کی کہ ناکہ بندی توڑ کر ہلہ بول دیں اور ویندوم میدان میں نیشنل گارڈ کے ہیڈ کوارٹر پر اچانک قبضہ کر لیں۔ ان کی طرف سے پستول داغے گئے تو جواب میں انہیں sommations (ہجوم بکھرنے کی وارننگ) دی گئی (۱۱۱)۔ اور جب بار بار کے کہنے کا بھی کوئی اثر نہ ہوا تو نیشنل گارڈ کے جنرل \* نے فائرنگ کا حکم دے دیا۔ ایک باڑھ چلی تو خالی الذہن لوگوں کا یہ ہجوم بھاگ کھڑا ہوا، جو اس وہم

\* بانکے چھیلے - (ایڈیٹر)

\*\* برزیرے - (ایڈیٹر)

میں مبتلا تھا کہ ”عزت دار آدمیوں“ کے مجمع کی ایک جھلک دیکھتے ہی پیرس کے انقلاب پر ویسا جادو کا اثر ہوگا جیسا پیری ہون (Jericho) کی فصیل پر جوشوا کے ڈھول تاشوں کا ہوا تھا۔ ان صاحبان نے منہ اٹھا کر بھاگتے وقت نیشنل گارڈ کے دو آدمیوں کو جان سے مار ڈالا اور نو آدمی زخمی کر دئے (ان نو میں مرکزی کمیٹی کا بھی ایک ممبر تھا \*)۔ جائے واردات پر، جہاں انہوں نے معرکہ سر کیا، جا بجا ریوالور، خنجر، نیزے اور اسی قسم کے ہتھیار بکھرے ہوئے تھے جو ان کے ”پرامن“ جلوس کا ”خالی ہاتھ“، نکلتا ثابت کرنے کو کافی تھے۔ جب نیشنل گارڈ نے ۱۳ جون ۱۸۴۹ء کو مظاہرہ کر کے روم پر فرانسیسی فوج کے غارت گرانہ حملے کے خلاف احتجاج کیا تھا تو یہ واقعی ایک پرامن جلوس تھا۔ لیکن تب قومی اسمبلی اور خاص کر تیسرے نے شنگارنیسے کو، جو ضابطہ پارٹی کی طرف سے جنرل کے عہدے پر تھا، سماج کا محافظ قرار دے کر اس بات کی داد دی تھی کہ اس نے بے سرو سامان ہجوم عام کو فوج کے نرغے میں لے لیا اور چوطرفہ گولی برساکر، تلواروں سے کاٹ کر اور گھوڑوں سے کچل کر رکھ دیا۔ پیرس میں اس وقت محاصرے کی حالت کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ دیوفور نے قومی اسمبلی میں جلدی جلدی جبر و ستم کے نئے قانون پاس کرائے تھے۔ تازہ گرفتاریوں، جلا وطنی اور دہشت کا دور دورہ ہو گیا تھا۔ لیکن وہ جنہیں ”نچلے طبقے“ کہا جاتا ہے، دوسری طرح پیش آتے ہیں۔ ۱۸۷۱ء کی مرکزی کمیٹی نے ”پرامن جلوس“ کے ان سورماؤں کو نظر انداز کر دیا، اور اتنا نظر انداز کیا کہ دو ہی دن بعد ایڈمرل سیسے کی سرکردگی میں انہیں پھر اس ہتھیار بند جلوس نکالنے کی ہمت ہوئی جو آخر وارسائی کی طرف مشہور دیوانہ وار فرار پر تمام ہوا۔ مرکزی کمیٹی چون کہ دل سے اس خانہ جنگی میں پڑنے کے خلاف تھی جو تیسرے نے مون مارت پر نقب زنیوں کی طرح حملے سے شروع کی تھی، اس لئے ایک بڑی فاش غلطی کر گئی کہ اسی وقت وارسائی پر چڑھائی کر دینی چاہئے تھی۔ تب تک

\* مالٹورنال - (ایڈیٹر)



وارسائی والوں کے پاس اپنے بچاؤ کا سروسامان بھی نہ تھا، اور ہمیشہ کے لئے تیئر کی اور اس کے ”چودھریوں کی جو پال“، والوں کی سازش کا قصہ پاک کر دیا جاتا۔ اس کے بجائے ضابطہ پارٹی کو پھر مہلت دے دی گئی کہ وہ ۲۶ مارچ کو کمیون کے چناؤ میں اپنی طاقت آزما لے۔ اس روز پیرس کے میئر کے دفاتروں میں ضابطہ پارٹی والوں نے اپنے ضرورت سے زیادہ عالی ظرف فاتحوں کے ساتھ صالح صفائی کی باتیں کہیں اور سنیں، لیکن دل میں قسم کھالی کہ وقت آنے پر انہیں کچا چبا جائیں گے۔

اب زرا تصویر کا دوسرا رخ دیکھیں۔ تیئر نے پیرس پر اپنی دوسری مہم اپریل کے شروع میں روانہ کر دی۔ پیرس کے قیدیوں کے پہلے جتھے کو جو وارسائی لایا گیا تھا، انتہائی بے دردانہ اذیتیں دی گئیں۔ ارنسٹ پی کار پتلون کی جیموں میں ہاتھ ڈالے ٹھہلتا رہا، قیدیوں پر فقرے کستا رہا اور تیئر اور فاور کی بیگمات اپنی خواصوں کے جھرمٹ میں چھجوں پر سے ان قیدیوں کے ساتھ وارسائی کے هجوم کا برتاؤ دیکھ کر تالیاں بجاتی اور شاباش دیتی رہیں۔ چھاوونی کے قید کئے ہوئے فوجی بے دردی سے قتل کر دئے گئے۔ لوہے کی ڈھلائی کرنے والے ہمارے بہادر ساتھی، جنرل دوال کو کسی قسم کی صفائی کا موقع دئے بغیر گولی سے اڑا دیا گیا۔ گیلی فرے نے جو اپنی اس بیوی کا کھیل تھا جس نے دوسری شہنشاہی کے زمانے میں بے شرمی کی حرکتوں میں بڑا نام پیدا کیا ہے، ایک اعلان نکال کر یہ ڈینگ ماری کہ اچانک حملے میں اس کے فوجیوں کے ہاتھ پڑنے والے اور بے ہتھیار کئے ہوئے نیشنل گارڈ کے ایک دستے کو کپتان اور لفٹنٹ سمیت حکم خاص سے قتل کر دیا گیا۔ میدان سے بھاگنے والے وینوا کو تیئر نے فرانس کا بڑا اعزاز ”گرانڈ کراس“، بخشا کیوں کہ اسی نے حکم عام جاری کیا تھا کہ کمیون والوں میں جو بھی چھاوونی کا جوان ہاتھ آئے اسے گولی مار دی جائے۔ سیاسی پولیس کے افسر دیمارے کو اس کارنامے کا انعام ملا کہ عالی حوصلہ اور شیردل فلورنس کو دغا دے کر اس نے بوٹی بوٹی کر ڈالا، اسی فلورنس کو جس نے ۳۱ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو قومی ڈیفنس کی حکومت کی جاں بخشی کر دی تھی (۱۱۲)۔

اس قتل کی ”ہمت افزا تفصیلات“، تیئر نے قومی اسمبلی کے ایک اجلاس میں خوب بغلیں بجا کر بیان کیں۔ پارلیمنٹری شیخ چلی کی بھڑکی ہوئی خود پسندی کے زعم میں، جسے تیمورلنگ کا پارٹ ادا کرنا تھا، تیئر نے ان لوگوں کو جو اس کی بالشتیا عظمت کے خلاف کھڑے ہوئے، وہ حق بھی نہیں دیا جو جنگی دشمن کو دیا جاتا ہے اور یہ بھی ماننے کو تیار نہ ہوا کہ زخمیوں کی مرہم پٹی کے ٹھکانے غیر جانبدار رکھے جائیں۔ اس بندر سے بڑھ کر اور کون خطرناک ہو سکتا ہے جسے وقتی طور پر چھوٹ مل گئی ہو شیر کی طرح پھاڑ کھانے کی، فطرت کو تسکین دینے کی۔ اس بندر شیر کی تصویر ناول نگار وولتیر نے پہلے ہی کھینچ دی تھی \*۔

۷ اپریل کو کمیون کا یہ فرمان نکلنے کے بعد بھی کہ ”پیرس کو وارسائی والے ڈاکوؤں کی آدم خوری سے بچانا، اور آنکھ کا انتقام آنکھ اور دانت کا انتقام دانت سے لینا، (۱۱۳) ہمارا فرض ہے اور ہر زیادتی کا جواب دیا جائے گا، تیئر نے قیدیوں پر وحشیانہ ظلم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور اوپر سے اپنے بلیٹینوں میں ان الفاظ کے ساتھ ان کی تذلیل کرتا رہا کہ ”ایماندار لوگوں کی غمزدہ نظروں نے آج تک اتنی بے ایمان جمہوریت کے اس سے زیادہ بے ایمان نمائندوں کی صورت نہیں دیکھی تھی“، یعنی ایسے ایماندار لوگوں نے جیسے خود تیئر اور اس کے دس دسمبری وزیروں کی ٹولی۔ تاہم اتنا ہوا کہ قیدیوں کو گولی سے اڑانا کچھ عرصے کے لئے روک دیا گیا۔ لیکن جیسے ہی تیئر اور اس کے دس دسمبری جنرلوں کو پتہ چلا کہ کمیون کا وہ بدلہ لینے والا فرمان خالی خولی دھمکی ہے، نیشنل گارڈ کے بھیس میں پیرس کے اندر پکڑے جانے والے پولیس (ژندارم) مخبر، یہاں تک کہ وہ پولیس والے جن کے پاس سے آتش گیر گولے نکلے، یوں ہی بخش دئے گئے تو پھر انہوں نے قیدیوں کو ایک سرے سے گولیوں کا نشانہ بنانا شروع کر دیا اور بالکل آخر تک یہ سلسلہ لگاتار چلتا رہا۔ جن گھروں میں نیشنل گارڈ کے فوجی جاچھپے تھے، انہیں سیاسی پولیس والوں

\* ملاحظہ ہو والتیئر کا ناول ”کنڈید“، باب ۲۲ - (ایڈیٹر)



نے گھیر کر، پٹرول (اس جنگ میں یہاں پہلی بار مٹی کا تیل استعمال ہوا) چھڑک کر آگ لگا دی۔ جلی ہوئی لاشیں بعد میں اخباروں کی ایمبولینس گاڑیوں نے تین محلے میں نکالیں۔ ۲۵ اپریل کو بیل این کے مقام پر چار نیشنل گارڈوالوں نے گھوڑ سوار فوجیوں کی ایک ٹکڑی کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے۔ بعد میں سواروں کے کپتان نے جسے جنرل گیلی فے سے داد ملنی چاہئے ایک ایک کر کے ان چاروں کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔ ان چاروں میں سے شیفر نام کا ایک شخص، جسے مردہ جان کر چھوڑ دیا گیا تھا، کسی طرح گھسٹتا ہوا پیرس کی اگلی چوکیوں تک پہنچ گیا اور اسی کی زبانی کمیون کے ایک کمیشن کے سامنے اس واقعے کی تصدیق ہوئی۔ بعد میں جب تولین نے وزیر جنگ لے فلو سے اس کمیشن کی رپورٹ کی بابت سوال کیا تو ”چودھریوں کی چوپال“ کے ممبروں نے اتنا شور مچایا کہ اس کی آواز دب گئی اور لے فلو کو جواب دیتے بن نہیں پڑا۔ ان کی ”شاندار“ فوج کی توہین ہو جاتی اگر اس کے کارنامے گنائے جائے۔ مولیں ساکے کے مقام پر کمیون کے سوتے ہوئے آدمی اچانک پکڑ کر کس طرح سنگینوں سے چھیدے گئے، اور کلامار میں کس طرح لوگوں کو گولیوں سے بھون ڈالا گیا، یہ خبریں تیار نے کچھ اس بے احتیاطی سے شائع کر دیں کہ لندن کے اخبار ”ٹائمز“ (۱۱ م) تک کے اعصاب جھنجھنا اٹھے، جس پر ایسے واقعات کا کچھ خاص اثر نہیں ہوتا۔ لیکن آج مضحکہ خیز معلوم ہوگا کہ ہم ان دردناک مظالم کا شمار کریں صرف شروع کے جو پیرس پر گولے برسانے والے اور غیر ملکی حملے کی آڑ میں بردہ فروشوں کی بغاوت اکسانے والے کر چکے ہیں۔ کبھی پارلیمنٹ میں تیار نے منہ سے یہ لفظ نکلے تھے کہ میرے بونے کاندھوں پر کمر توڑنے والی ذمہ داریاں آپڑی ہیں، مگر آج چار طرف بربادی کے اس منظر میں وہ اپنے بلیٹن میں بڑھ بڑھ کر جو دعوے کرتا ہے کہ اسمبلی کا اجلاس اطمینان سے چل رہا ہے، اور کبھی دسمبری جنرلوں کے ساتھ، کبھی جرسن شہزادوں کے ساتھ جو مستقل دعوتیں اڑاتا رہتا ہے، ان سے تو یہی ثابت ہوگا کہ جنرل لیکونٹ اور کلیماں تھاس کے بھوت بھی اس کا ہاضمہ خراب نہیں کر سکے۔

۳

۱۸ مارچ ۱۸۷۱ء کی صبح سویرے ”کمیون زندہ باد!“ کے فلک شگاف نعروں سے پیرس والوں کی آنکھ کھلی۔ کمیون ایسا کونسا ابوالہول ہے جس نے بورژوازی کی عقلیں گم کر رکھی ہیں؟

مرکزی کمیٹی نے اپنے ۱۸ مارچ کے مینی فسٹو میں لکھا ”پیرس کے پرولتاریوں نے حاکم طبقوں کی کمزوری اور بدعہدی دیکھ کر یہ سمجھ لیا کہ وہ وقت آپہنچا جب مصیبت سے نکلنے کے لئے انہیں سماجی معاملات کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لینی چاہئے۔۔۔ انہوں نے دیکھ لیا کہ فرض کا تقاضا اور ان کا یہ قطعی حق ہے کہ سرکاری طاقت سنبھال کر اپنی قسمتوں کے مالک آپ بن جائیں۔“

لیکن مزدور طبقہ یہ نہیں کر سکتا کہ تیار سرکاری مشین پر قبضہ کر کے اسے اپنے مقاصد کے لئے چالو کر دے۔ مرکزیت لئے ہوئے سرکاری طاقت، مستقل فوج، پولیس، نوکر شاہی، مذہبی اور عدالتی اداروں سمیت، جو ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں، اور جو کاموں کی باقاعدہ اور پشت در پشت تقسیم کے اصول پر بنے ہیں، مطلق العنان بادشاہی کے اس زمانے سے چلی آ رہی ہے جب وہ جاگیرداری کے توڑ پر ابھرتے ہوئے درمیانی طبقے کا ایک کارگر ہتھیار بن گئی تھی۔ پھر بھی کئی جالے لگے رہے، بڑے تعلقہ داروں کے خاص حقوق، مقامی امتیاز، شہری اور کاریگروں کی برادری کے اجارے، اور صوبائی قانون۔ ان سب نے اس کی ترقی میں کھنڈت ڈالی۔ اگلے وقتوں کے ان تمام جالوں کو ۱۸ ویں صدی کے انقلاب فرانس کی زبردست جھاڑو نے اتار کر صاف کر دیا اور یوں بیک وقت وہ زمین بھی پرانا کباڑ جھاڑ پونچھ کر تیار کر دی جس پر وہ عمارت کھڑی ہونی تھی جسے نئے زمانے کی سرکاری مشینری کھنا چاہئے۔ یہ عمارت اس پہلی شہنشاہی کے زمانے میں اٹھی کہ وہ شہنشاہی یا سلطنت بھی پرانے



نیم جاگیرداری یورپ کی ان ملی جلی جنگوں کا نتیجہ تھی جو نئے فرانس کے خلاف لڑی گئیں۔ بعد کی عملداریوں میں، حکومت جو پارلیمنٹ کے کنٹرول میں رکھی گئی، یعنی براہ راست صاحب جائداد طبقے کے قبضہ قدرت میں، وہ نہ صرف یہ کہ بڑے قومی قرضوں اور بھاری ٹیکسوں کی آماجگاہ بن گئی، نہ صرف یہ کہ حکمران طبقوں کی رسہ کشی کرنے والی ان ٹکڑیوں اور داؤ لگانے والوں کے درمیان چھینا جھپٹی کا سبب بن گئی جو سرکاری طاقت کی طرف اس لئے کھنچے چلے آتے تھے کہ اس سے انہیں اچھی آمدنی، اثر، اختیار اور منافع بخش عہدے ہاتھ لگیں گے، چنانچہ سماج کی معاشی تبدیلی کے ساتھ سرکاری طاقت کا سیاسی کیرکٹر بھی بدل گیا۔ موجودہ زمانے کی صنعتی ترقی جتنی بڑھتی گئی، سرمائے اور محنت کے درمیان طبقاتی ٹکراؤ جتنا پھیلتا اور گہرا ہوتا گیا، سرکاری طاقت اسی قدر اور بھی محنت کے اوپر سرمائے کی قومی طاقت بنتی چلی گئی، ایسی سماجی قوت میں بدلتی گئی جو تیار ہی اس لئے کی گئی کہ اوروں پر سماجی غلبہ قائم کرے، اور وہ طبقاتی غلبے کا آلہ کار بن کر رہ گئی۔ ہر ایک انقلاب کے بعد، یعنی طبقاتی کشمکش کے ہر ایک بڑھنے والے قدم کے بعد سرکاری طاقت کا ظالمانہ جاہلانہ کردار زیادہ سے زیادہ کھل کر سامنے آتا ہے۔ ۱۸۳۰ء کے انقلاب نے زمین جائداد والوں سے طاقت چھین کر سرمایہ داروں کے حوالے کر دی۔ یوں کہئے کہ مزدور طبقے کے جو دور کے دشمن تھے ان کے ہاتھوں سے لے کر سامنے کے دشمن کو دے دی۔ فروری کے انقلاب کے نام پر سرمایہ دار ریپبلکنوں نے جب سرکاری طاقت سنبھالی تو اس سے جون والے قتل عام کا کام لیا، تاکہ مزدور طبقے کے ذہن نشین کر دیا جائے کہ ”سماجی“ ریپبلک کا مطلب ہے ایسی ریپبلک جو اسے سماجی ماتحتی میں رکھے گی، شاہی رجحان رکھنے والے عام سرمایہ داروں اور جاگیردار طبقے کو یہ اطمینان دیا جائے کہ حکومت چلانے کا درد سر اور نفع زر بورژوا ”ریپبلکنوں“ کو سونپ کر فکر سے آزاد ہو سکتے ہیں۔ لیکن جون کا ایک شاندار کارنامہ انجام دیتے ہی ان بورژوا ریپبلکنوں کو اگلی صف چھوڑ کر ضابطہ پارٹی کے پیچھے کی صف میں ٹھکانا ملا اور یہ پارٹی کیا تھی،

بھان متی کا کنبہ تھا جس میں دوسروں کا حق مار لینے والے طبقے کے ایک دوسرے سے دست و گریباں گروہ اور فریق سر جوڑ کر کھلم کھلا اس طبقے کے مقابل کھڑے ہو گئے تھے جو مال پیدا کرتا ہے۔ ان کی جوائنٹ اسٹاک (مشترکہ کمپنی) گورنمنٹ کی صحیح شکل وہ پارلیمنٹری ریپبلک تھی جس کا صدر لوئی بوناپارٹ بنا۔ ان لوگوں کی عملداری کٹر طبقاتی دہشت کا اور ”بے حیثیت جنتا“ کی سوچی سمجھی توہین کا راج تھی۔ تیسرے کے لفظوں میں اگر پارلیمنٹری ریپبلک ”انہی کو سب سے کم بانٹتی تھی“، (یعنی حکمران طبقے کے مختلف گروہوں کو) لیکن اسی پارلیمنٹری ریپبلک نے تھوڑی سی تعداد والے اس طبقے کو اس پورے سماجی وجود سے دور کر دیا تھا جو اس طبقے کے باہر جی رہا تھا، ان دونوں کے درمیان خلیج حائل کر دی تھی۔ پچھلی عملداریوں میں الگ الگ دھڑے ہونے کے باعث سرکاری اختیارات کے استعمال پر ایک بندش رہا کرتی تھی، اب ان کے یکجا ہونے کی بدولت وہ بندش ہٹ گئی۔ پرولتاریہ کی شورش کا خطرہ دیکھتے ہوئے انہوں نے سرکاری طاقت کو بڑی بے رحمی سے ایسے استعمال کیا کہ وہ محنت کے خلاف سرمائے کی صاف صاف قومی جنگی مشین بن گئی۔ پیداوار کرنے والے عوام پر اس لگاتار صلیبی حملے نے ایک طرف تو ان سے یہ کرایا کہ انتظامیہ طاقت کو مخالفت کا سر کچلنے کے لئے زیادہ سے زیادہ اختیارات دیتے گئے، دوسری طرف رفتہ رفتہ خود اپنے ہی گڑھ، مطلب یہ کہ قومی اسمبلی کو انتظامیہ طاقت کے مقابلے میں بچاؤ کے ذریعوں سے محروم کرتے چلے گئے۔ لوئی بوناپارٹ نے، جو خود اپنی ہستی سے انتظامیہ طاقت تھا، حکمران طبقے کے نمائندوں کو نکال باہر کیا۔ یوں دوسری شہنشاہی ایک قدرتی نتیجہ بنی ضابطہ پارٹی کی ریپبلک کا۔

یہ شہنشاہی، جسے حکومت کا تختہ الٹنے سے پیدائش کا سرٹیفکٹ ملا، عام رائے دہندگی کے حق سے دست و بازو ملے اور تلوار کے زور سے قانون کا نفاذ ملا، اس نے صاف کہہ دیا کہ کسانوں کے بل پر کھڑی ہے، یعنی پیداواری آبادی کی اس بڑی بھاری تعداد کے بل پر، جسے سرمائے اور محنت کی کشمکش سے براہ راست کوئی سروکار نہیں۔ اس



شہنشاہی نے یہ بھی دعوا کیا کہ اس نے مزدور طبقے کو بچا لیا، وجہ یہ کہ پارلیمنٹری طرز حکومت کو توڑ دیا اور اسی کے ساتھ حکومت کا بے نقاب ہو کر صاحب حیثیت طبقے کی ماتحتی میں رہنا بھی ختم کر دیا۔ ادھر صاحب حیثیت طبقوں کو بچا لینے کا دعوا کیا، وجہ یہ کہ مزدور طبقے پر ان کے معاشی غلبے کو سنبھالے رکھا۔ اور آخر یہ شہنشاہی اس بات کی دعویدار ہوئی کہ قومی عروج کے جو آثار اس نے پھر سے پیدا کئے ہیں ان کے گرد سارے طبقوں کو جوڑ سمیٹ کر لے آئی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ایسے وقت میں جب بورژوازی نے قوم کا انتظام کرنے کی قابلیت کھو دی تھی اور مزدور طبقے نے ابھی یہ صلاحیت پیدا نہیں کی تھی، صرف یہ شہنشاہی ایک ممکن صورت تھی حکومت کی۔ ساری دنیا نے مان لیا کہ یہ حکومت سماج کو بربادی سے بچانے والی ہے۔ اس کا عمل دخل ہو جانے سے بورژوازی سماج کو سیاسی جھمیلوں سے فرصت ملی اور وہ ترقی کے اس مقام پر پہنچا جہاں خود اپنے زمانے میں نہیں پہنچا تھا۔ صنعت اور تجارت دونوں میں بے پناہ تیزی آئی، سٹے کے کاروبار میں اپنے اور غیر سبھوں نے خوب ہاتھ رنگے۔ عام لوگوں کا افلاس اسی رفتار سے بڑھا جیسے جرم و قریب پر پلنے والے بے لگام عیش و عشرت، اور نمود و نمائش کی چمک دمک بڑھتی گئی۔ سرکاری طاقت جو بظاہر سماج کے سر سے کمپیں اوپر تھی، حقیقت میں وہی اس سماج کے فتنوں کی جڑ اور ہر قسم کی بد چلنی کی آماجگاہ تھی۔ پروشیا تو دل سے آرزومند تھا کہ اس قسم کے نظام حکومت کا مرکز پیرس سے برلن منتقل کر دیا جائے، اس پروشیا کی سنگینوں نے اس سرکاری طاقت کی تمام پول کھول دی اور اس طاقت نے جس سماج کو پروان چڑھایا تھا، اس کا کھوکھلا پن فوراً بے نقاب کر دیا۔ شہنشاہی عملداری سب سے بڑھ کر آبرو باختم اور آخری شکل ہے اس سرکاری طاقت کی، جسے ابھرتے ہوئے درمیانی طبقے کے سماج نے جاگیرداری شکنجے سے اپنی جان چھڑانے کی ایک سپیل کے طور پر بنانا شروع کیا تھا اور جسے خوب ترقی یافتہ بورژوا سماج نے بالآخر محنت کو سرمائے کا غلام رکھنے کے لئے اپنا آلہ کار بنا لیا۔

شہنشاہی کے بالکل برعکس تھا کمیون۔ پیرس کے پرولتاریہ نے ”سماجی ریپبلک“ کے جس نعرے سے فروری کے انقلاب کا استقبال کیا تھا، وہ ایسی ریپبلک کا دھندلا سا مقصد ظاہر کرتا تھا، جو نہ صرف طبقاتی غلبے کی شخصی بادشاہت والی شکل کا صفایا کر دے بلکہ خود طبقاتی غلبے کو ہی مٹا دے۔ ایسی ریپبلک کا ایک روپ تھا کمیون۔

پرانی سرکاری طاقت کا گڑھ اور مرکز پیرس، جو فرانس کے مزدور طبقے کا بھی سماجی قلعہ تھا، ہتھیار سنبھال کر تیار اور اس کی ”چودھریوں کی چوپال“ کی ان کوششوں کا جواب دینے اٹھ کھڑا ہوا جو یہ لوگ اسی پرانی سرکاری طاقت کو پھر سے جمانے اور ہمیشہ قائم رکھنے کے لئے کر رہے تھے، جو انہیں شہنشاہی کے ترکے میں ملی تھی۔ پیرس اس لئے مقابلے میں کھڑا ہو سکا کہ محاصرے کے دنوں میں فوج کے ہاتھ سے نکل گیا تھا اور نیشنل گارڈ نے فوج کی جگہ سنبھال لی تھی جس میں بہت بڑی تعداد میں مزدور ہی تھے۔ اب اس حقیقت کو ایک باقاعدہ شکل دینی باقی تھی چناں چہ پہلا حکم جو کمیون نے نکالا وہ یہ کہ مستقل فوج کا خاتمہ کیا جاتا ہے اور ہتھیار بند جنتا اس کی جگہ لیتی ہے۔

کمیون میونسپلٹی کے ان ممبروں سے مل کر بنا جو شہر کے مختلف حلقوں سے عام رائے دہندگی کے ذریعے چنے گئے تھے۔ یہ لوگ معاملات کے جوابدہ ٹھہرے اور کسی وقت بھی انہیں ہٹایا جا سکتا تھا۔ ان ممبروں کی اکثریت، ظاہر ہے کہ مزدور طبقے سے یا اس طبقے کے مانے ہوئے نمائندوں میں سے آئی تھی۔ کمیون کو پارلیمنٹری نہیں بلکہ خود کام کرنے والی کارپوریشن بننا تھا کہ یک وقت قانون بھی بنائے اور قانون کی تعمیل بھی کرائے۔ پولیس جو تب تک مرکزی حکومت کا کل پرزہ ہوا کرتی تھی، فوراً اپنی تمام سیاسی کارگزاریوں سے محروم کر دی گئی، اسے کمیون کا ایک ذمہ دار محکمہ قرار دے کر یہ شرط رکھ دی کہ کسی وقت بھی عہدے سے ہر طرف کی جا سکتی ہے۔ انتظامیہ کے تمام عہدے داروں پر یہی شرط عائد ہوتی تھی۔ کمیون کے ممبروں سے لے کر اوپر سے نیچے تک



سب کو سماجی خدمات کا معاوضہ اتنا ہی ملنا تھا جتنا مزدوری میں ملتا ہے۔ اعلا سرکاری عہدوں کو جو خاص حقوق اور الاؤنس وغیرہ ملا کرتے تھے، وہ سب ان عہدوں کے ساتھ ہی رخصت ہو گئے۔ سماجی خدمات اب مرکزی حکومت کے مقرر کئے ہوئے کارندوں کی نجی ذمہ داری نہیں رہ گئی۔ صرف میونسپل انتظام نہیں، بلکہ اور تمام کاموں میں پہل کرنا بھی، جو سرکار کے دائرہ اختیار میں تھا، کمیون کے سپرد ہوا۔

باقاعدہ فوج اور پولیس کو برطرف کرنے، پرانی حکومت کے مادی کلپرزوں کو ہٹانے کے ساتھ کمیون فوراً ادھر متوجہ ہوا کہ روحانی دباؤ کے کلپرزوں ”پادریوں کے اقتدار“ کو بھی توڑ پھوڑ کر برابر کیا جائے، اس تدبیر سے کہ کلیسا یا چرچ کو اسٹیٹ سے کوئی سروکار نہ ہو اور گرجاؤں کو جو دولت و جائیداد کے اوقاف کے مالک تھے، ان سے بے دخل کر دیا جائے۔ پادریوں کو حکم ہوا کہ وہ عام شہری کی طرح سادہ زندگی کی طرف واپس جائیں تاکہ اپنے قدیم علما اور مشائخ کی طرح وہ بھی اہل ایمان کی دی ہوئی روکھی سوکھی پر بسر کیا کریں۔ تمام تعلیم گاہوں کے دروازے مفت تعلیم عامہ کے لئے کھول دئے گئے اور انہیں کلیسا اور سرکار دونوں کے دائرہ اختیار سے باہر رکھا گیا۔ اس طرح نہ صرف اسکول کی تعلیم سب لوگوں کے لئے کھل گئی بلکہ علم کے پاؤں کی وہ زنجیریں بھی اتار لی گئیں جن میں طبقاتی تعصبات اور سرکاری اختیارات نے اسے جکڑ رکھا تھا۔

عدالتی عہدوں نے اپنی دکھاوے کی آزادی سے ہاتھ دھو لئے۔ یہ آزادی ایک پردہ تھا جس کے پیچھے وہ ہر ایک برسر اقتدار حکومت کے سامنے ماتھا رگڑتے، جب کوئی حکومت آتی تو وہ وفاداری کا حلف اٹھاتے اور وہ جاتی تو وفاداری بھی ساتھ لے جاتی تھی۔ دوسرے سماجی عہدہ داروں کی طرح اب عدالتی عہدہ داروں کے لئے بھی کھلے ووٹ سے چنا جانا، جوابدہ ہونا اور جگہ چھوڑنا طے پایا۔

پیرس کمیون کو، ظاہر ہے کہ ایک نمونہ پیش کرنا تھا پورے فرانس کے بڑے بڑے صنعتی مرکزوں کے لئے۔ اگر پیرس میں اور دوسرے درجے کے مرکزوں میں یہ جماعتی (کمیون کی) عملداری

کامیابی سے چل جاتی، تو پرانی مرکزیت والی حکومت کو صوبوں میں بھی پیداوار کرنے والی آبادی کی خود انتظامی کے لئے جگہ چھوڑ کر ہٹ جانا پڑتا۔ قومی بندوبست کے اس مختصر خاکے میں، جس میں رنگ بھرنے کا کمیون کو وقت نہیں ملا، دو ٹوک لفظوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں بھی کمیون کی سیاسی شکل قائم ہونی ہے اور دیہات کے حلقوں میں بھی مستقل فوج کی جگہ جنتا کی ملیشیا کو اس طرح لینی ہے کہ عہدے کی میعاد بہت مختصر رہے۔ دیہات کے حلقوں کے ہر ایک صدر مقام پر ڈیلی گیٹوں کی حلقہ کمیٹی بیٹھے اور ہر ایک حلقے کے زرعی کمیون کے عام مسائل کا انتظام ہاتھ میں لے۔ پھر یہ حلقہ وار کمیٹیاں اپنے نمائندے چن کر قومی ڈیلی گیٹشن میں بھیجیں جو پیرس میں منعقد ہوگا۔ یہ ڈیلی گیٹ سختی سے ان ہدایات (mandat impératif) کے پابند ہوں گے جو ان کے حلقے کی طرف سے دی گئی ہیں اور ہر وقت ان کو برطرف کیا جاسکے گا۔ تھوڑے سے لیکن نہایت اہم فرائض پھر بھی بچ رہے جو مرکزی حکومت کے ہاتھ میں رہنے والے تھے اور انہیں واپس نہیں لیا جاسکتا تھا۔ جیسا کہ ان کے بارے میں غلط بیانی سے کام لیا جا رہا ہے۔ بلکہ وہ پوری جماعتی کمیٹی (کمیون) کے سپرد تھے، یعنی انتہائی ذمہ دار عہدہ داروں کو سونپے گئے تھے۔ قوم کی ایکتا کو توڑ پھوڑ کر برابر نہیں کرنا تھا بلکہ اس کے برعکس کمیون کے سانچے میں ڈھل کر اسے ازسرنو مرتب ہونا تھا۔ قوم کی ایکتا حقیقت کے لباس میں اس صورت سے آتی تھی کہ اس سرکاری طاقت کا صفایا کیا جاتا جو خود اس قومی ایکتا کی مجسم ہستی کی دعوی دار بن کر چاہتی تھی کہ قوم سے بے نیاز بھی ہو اور اس کے سرپر بھی کھڑی رہے۔ سچ پوچھیے تو یہ سرکاری طاقت قوم کے بدن پر ایک فالتو رسولی تھی۔ مدنظر یہ تھا کہ پرانی حکومت کے اختیارات میں جتنے جابرانہ محکمے ہیں، ان کو جڑ بنیاد سے صاف کر دیا جائے اور ان کی جائز کارگزاری اس طاقت کے ہاتھ سے چھین کر، جسے سماج سے بلند مرتبے پر فائز ہونے کا بیجا دعوا ہے، سماج کے ذمہ دار خادموں کے سپرد کردی جائے۔ بجائے اس کے کہ کہیں تین یا چھ سال میں ایک بار یہ فیصلہ ہو کہ



حکمران طبقے کا کون آدمی پارلیمنٹ میں لوگوں کی نمائندگی یا دھاندلی کرے گا، عام رائے دہندگی کا حق ان لوگوں کے، جو کمیون میں منظم ہوئے ہیں، اسی طرح کام آئے جس طرح انفرادی چناؤ کا حق الگ الگ اس شخص کے کام آتا ہے جو روزگار دینے میں اپنے کاروبار کے لئے مزدور، نگران اور اکاؤنٹنٹ چھانٹتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ فرد واحد کی طرح کاروبار یا ادارے بھی کام ڈھنگ سے چلانے میں صحیح جگہ کے لئے مناسب آدمی کا انتخاب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور اگر ان سے غلطی ہو جائے تو ہاتھوں ہاتھ اس غلطی کو درست بھی کر سکتے ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ خود کمیون کا وجود ہی یقینی طور سے اس کا دشمن تھا کہ عام رائے دہندگی کے حق کی جگہ پشتینی منصب داری (۱۱۵) کو مل جائے۔

جب بھی کوئی نیا تاریخی وجود جنم لیتا ہے تو، عموماً ایسی قسمت لے کر آتا ہے کہ لوگ اسے بھی سماجی زندگی کا وہی روپ سمجھ لیتے ہیں جو تھا تو پرانا اور بالکل گیا گزرا، لیکن شکل شباهت کچھ ویسی ہی رکھتا تھا۔ چنانچہ اس نئے کمیون کو بھی، جو عہد حاضر کی سرکاری طاقت کا توڑنے والا ہے یہ سمجھا گیا کہ قرون وسطی کے وہی کمیون پھر سے زندہ ہو گئے جو کسی زمانے میں اس سرکاری طاقت سے پہلے موجود تھے اور اس طاقت کی بنیاد بنے تھے۔ کمیون کے سانچے کو غلطی سے لوگوں نے یہ جانا کہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا فیڈریشن بنانے کی کوشش ہے جس کے خواب منتسکیو نے اور ژیروندیستوں (۱۱۶) نے دیکھے تھے، اور یہ فیڈریشن اس ایکٹا کی جگہ لے جو بڑی بڑی قوموں کے یہاں، اگرچہ شروع میں سیاسی زور زبردستی سے بنائی گئی، لیکن اب وہی سماجی پیداوار کی زبردست وجہ بن چکی ہے۔ کمیون اور سرکاری طاقت کے درمیان جو تناؤ تھی اس کا مطلب غلطی سے یہ نکالا گیا کہ حد سے زیادہ مرکزیت کے خلاف اسی پرانی کشمکش کی یہ ایک بڑھی چڑھی شکل ہے۔ خاص تاریخی حالات نے حکومت کے اس بورژوا ڈھنگ کی کلاسیکی ترقی میں ایک جگہ تو رکاوٹیں کھڑی کر دیں، جیسا کہ فرانس میں ہوا، اور دوسری جگہ اس کی سہولتیں مہیا کر دیں، جیسا کہ انگلینڈ میں ہوا کہ مرکزی

حکومت کے بڑے اداروں کے ساتھ ساتھ گرجاؤں سے متعلق بکی ہوئی محلہ کمیٹیوں کی، خود غرض میونسپل کونسلروں کی، شہروں کے اندر قانون غربا کے ہنگامہ خیز سرپرستوں کی اور نوابی ریاستوں میں عملی طور پر پشت درپشت آنریری مجسٹریٹوں کی پیخ بھی لگی ہوئی ہے۔ کمیون کی ساخت پرداخت سماج کے بدن کو وہ تمام طاقتیں واپس دلادیتی جو یہ پھولی ہوئی رسولی، جسے ”ریاست“ کہتے ہیں، اس بدن سے چوس کر خود تو اس پر پل رہی تھی لیکن جسم کی اٹھان کو روکے ہوئے تھی۔ اسی ایک عمل سے فرانس کو نئی زندگی کی شہ مل جاتی۔ فرانس کے صوبائی شہروں کی بورژوازی کو کمیون میں یہ نقشہ نظر آیا کہ بادشاہ لوئی فلپ کے زمانے میں دیہات پر جو اس کا عمل دخل تھا، اسی کو پھر بحال کرنے کی کوشش ہے، وہ عمل دخل لوئی نپولین کے دور میں چھن گیا اور اس کی جگہ بظاہر شہروں پر دیہات کا غلبہ قائم ہو گیا تھا۔ اصلیت یہ ہے کہ کمیون کی ساخت دیہات کے محنت کرنے والوں کو ہر علاقے کے بڑے شہروں کی ذہنی رہنمائی میں لاتی اور وہاں شہری مزدوروں کے روپ میں انہیں اپنے مفاد کے سیدھے سچے نمائندے نصیب ہو جاتے۔ خود کمیون کا وجود ہی اپنی لیٹ میں لوکل سیلف گورنمنٹ (میونسپل انتظام) کی شان رکھتا تھا لیکن وہ اس سرکاری طاقت کا جواب نہیں تھا جو اب غیر ضروری ہو چکی تھی۔ صرف کسی بسمارک کے دماغ میں یہ بات آسکتی ہے، وہ جو ایسے داؤ پیچ میں لگا رہتا ہے جہاں لہو اور لوہا سب سے مقدم ہیں، اور ان سے جو وقت بچتا ہے وہ سب کا سب اپنے پرانے شوق، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اپنی دماغی قابلیت کے مناسب حال شوق پورا کرنے، یعنی اخبار «Kladderadatsch» (برلن کے «Punch») (۱۱۷) کے لئے لکھنے میں لگا دیتا ہے، ایسے ہی کسی شخص کے دماغ میں یہ خیال جگہ پاسکتا ہے کہ پیرس کمیون نقل کرنے چلا تھا پروشیا کے میونسپل سانچے کی، جو خود ہی ۱۷۹۱ء کے پرانے فرانسیسی میونسپل سانچے کا ایک بگڑا ہوا ڈھانچہ ہے اور جس میں میونسپل انتظام کی حیثیت پروشیائی ریاست کی پولیس مشینری کے سائے میں ویسی رہ جاتی ہے جیسے گاڑی کے نیچے فالتو پمپ ہے۔



سارے بورژوائی انقلاب کم خرچ حکومت کا نعرہ لگاتے آئے تھے، کمیون نے خرچ کی دو بڑی مدیں، مستقل فوج اور سرکاری عہدہ داری توڑ دیں، اور اس نعرے کو سچ کر کے دکھا دیا۔ خود کمیون کا وجود ہی اس شخصی بادشاہی کے وجود کی نفی تھی، جو خود کم از کم یورپ میں معمولی طبقاتی حکمرانی کا بوجھ بھی بنی ہوئی ہے اور اس کا پردہ بھی رکھتی ہے۔ کمیون نے ریپبلک کو جمہوری اداروں کی بنیاد عطا کی۔ لیکن کمیون کی منزل مقصود نہ سستی حکومت تھی، نہ ”سچی ریپبلک“، یہ دونوں تو محض رفیق سفر تھیں۔

کمیون کی جتنی مختلف تاویلیں کی گئی ہیں اور جتنے مختلف مفادوں نے کمیون کو اپنے معنی پہنائے ہیں ان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ حکومت کی سراسر ایک لچکدار سیاسی شکل تھی حالانکہ اس سے پہلے حکومت کی جتنی شکلیں رہ چکی ہیں وہ اصلیت میں بے لوج اور دباؤ ڈالنے والی تھیں۔ اس کا اصل راز یہ کہ اپنی خاصیت میں وہ مزدور طبقے کی حکومت تھی، وہ اس کشمکش کا ثمرہ تھی جو پیداوار کرنے والے طبقے اور ہتھیالینے والے طبقے کے درمیان چلتی ہے، آخر کمیون میں اس سیاسی شکل کا سراغ ملا جس کے سائے میں محنت کو معاشی آزادی نصیب ہو سکے۔

اگر یہ آخری شرط نہ ہوتی تو کمیون محض ایک فرض محال اور فریب ہو کر رہ جاتا۔ پیدا کرنے والوں کی سیاسی حکمرانی ان کی سماجی غلامی کے ساتھ بسر نہیں کر سکتی۔ اس لئے کمیون وہ اصلی پرزہ بننا تھا جو اس معاشی بنیاد کو ہی اکھاڑ کر پھینک دے جس پر طبقوں کا وجود قدم جماتا ہے اور اس کے سبب طبقاتی حکمرانی چلتی ہے۔ محنت کے سر کا بوجھ اتر جائے تو ہر شخص محنت کرنے والا بن جاتا ہے اور پیداواری محنت کسی طبقے کی خصوصیت نہیں رہ جاتی۔ عجیب بات۔ حالانکہ پچھلے ساٹھ سال سے محنت کے سر کا بوجھ اتارنے کی کیا لمبی چوڑی باتیں لکھی اور کہی جا رہی ہیں، لیکن محنت کش کہیں، کسی جگہ جم کر یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیں پھر کیا ہے، فوراً موجودہ سوسائٹی کے حمایتیوں کی طرف سے ان کے خلاف دھواں دھار عذر تراشے جانے لگتے ہیں اور حملہ بھی

دو بالکل مخالف قطبوں سے ہوتا ہے: ایک سرمایہ، دوسرے اجرتی غلامی (جاگیردار آجکل سرمایداروں کے بے عمل شریک رہ گئے ہیں)۔ گویا ابھی سرمایہ داری سماج معصومیت اور کنوارپن کے دور سے گزر رہا ہے، ابھی اس کے اندرونی تضاد نہیں بڑھے، اس کی خود فریبی کا پردہ چاک نہیں ہوا اور اس کی آبرو باختہ حقیقت بے نقاب نہیں ہوئی۔ یہ لوگ شور پکار مچاتے ہیں کہ کمیون تو ذاتی ملکیت ہی مٹانے پر آمادہ ہے، جو ہر ایک تمدن کی بنیاد ہے۔ جی ہاں حضرات، کمیون اس طبقاتی ملکیت کو مٹانے پر آمادہ ہے جو بہتوں کی محنت کو چند کی ملکیت بنا دیتی ہے۔ اس کا مقصد ہے بے دخل کرنے والوں کو بے دخل کرنا۔ وہ تو ذاتی ملکیت کو ایک حقیقت بنانا چاہتا ہے، پیداوار کے ذریعوں کو، زمین اور سرمائے کو، جو آج کے زمانے میں خاص کر محنت کو مطیع کرنے اور اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں، اپنی خوشی سے ایک جگہ جڑی ہوئی محنت کا اوزار بنا دینا چاہتا ہے۔ لیکن یہ تو کمیونزم ہوا۔ ”انہونا“، کمیونزم۔ اچھا تو، حکمران طبقوں کے وہ نمائندے جن میں اتنا سمجھنے کی عقل و فہم ہے کہ موجودہ سماج دیر تک چلنے والا نہیں، اور اتنے ذی فہم لوگ بھی بہترے ہیں، وہ گلا پہاڑ کر، اور جوش میں آکر کوآپریٹیو پیداوار کے حق میں بڑے وعظ و تلقین کرتے ہیں۔ اگر یہ امداد باہمی کی پیداوار محض خالی خولی لفاظی یا فریب نہیں، اگر اسے سرمایہ داری نظام سے جگہ خالی کرانی ہے، اگر متحدہ امداد باہمی کی سوسائٹیوں کو ایک مشترکہ پلان پر قومی پیداوار کا قاعدہ باندھنا ہے، اور یوں اسے اپنے کنٹرول میں لے کر اس مستقل افراتفری کا، اس تھوڑے تھوڑے وقفے کی نڈھالی کا، جو سرمایہ داری پیداوار کا خاصہ ہے، ہمیشہ کے لئے خاتمہ کرنا ہے تو حضرات، اسے کیا کہتے ہیں؟ یہ کمیونزم کے سوا کچھ اور ہے کیا؟ یہ ”ممکن“، کمیونزم ہوگا؟

کمیون سے مزدور طبقے کو معجزوں کی امید نہیں تھی۔ مزدور طبقہ یہ نہیں سوچتا کہ ڈھلے ڈھلائے، تیار قیاسی نظریے (utopias) لوگوں کے فرمان سے (par décret du peuple) عملی جامہ پہن



لیں گے۔ وہ جانتا ہے کہ خود اپنے سر کا بوجھ اتارنے کے لئے، اور ساتھ میں سماج کو اس اعلا شکل تک لے جانے کے لئے جہاں وہ اپنی معاشی ترقی کے بل پر پہنچنے کو بے تاب ہے، اسے مسلسل کشمکش اور مقابلے میں قدم جما کر ایسے کئی تاریخی مرحلوں سے گزرنا پڑے گا جو ماحول اور آدمی، دونوں کی کاپلٹ کر دیں۔ مزدور طبقے کو اپنے خوابوں کی تعبیر نہیں چاہئے، اسے تو نئے سماج کے ان عناصر کو پنپنے کے لئے کھلا چھوڑنا ہے جو ٹوٹتے ہوئے پرانے بورژوا سماج کے بطن میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ مزدور طبقہ جو اپنے تاریخی منصب سے پوری طرح باخبر اور اس کی تعمیل کی خاطر مردانہ فیصلہ کئے ہوئے ہے، وہ ان چاپلوس اخباری لوگوں کی گندی گالیوں پر اور بورژوا فلسفہ طرازوں کے بقراطی انداز کے نیک مشوروں پر حقارت سے مسکرا سکتا ہے جنہیں علمی قطعیت کے لب ولہجے میں لفاظی کی چاٹ پڑی ہے اور منہ کھولتے ہیں تو جہالت کا طومار باندھ دیتے ہیں اور تنگ نظری کے وہم و گمان کا انبار لگا دیتے ہیں۔

جب پیرس کمیون نے انقلاب کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی، جب سادھارن مزدوروں نے پہلی بار فیصلہ کیا کہ اپنے ”قدرتی افسروں“ کے خاص حقوق پر ہاتھ ڈالیں، خاص حاکمانہ اختیارات کو چھانٹ دیں اور ایسے کٹھن حالات میں، جن کی کوئی مثال نہیں ملتی، انہوں نے یہ کام انکساری، ایمان داری اور کامیابی کے ساتھ انجام دیا، وہ بھی کس طرح کہ زیادہ سے زیادہ معاوضہ اس تنخواہ کے پانچویں حصے سے زیادہ نہیں رکھا جو اس علم کے ایک مشہور اور مستند ماہر (پروفیسر ہکسلے) کے بقول، لندن کے کسی اسکول بورڈ کے سیکریٹری کی کم از کم تنخواہ ہوتی تھی، اس پر بھی جوں ہی پرانی دنیا نے لال جھنڈے کو، محنت کی رپبلک کے نشان کو ٹاؤن ہال کی عمارت پر لہراتے دیکھا وہ طیش میں آپے سے باہر ہو گئی۔

کچھ بھی سہی، یہ پہلا انقلاب تھا جس میں مزدور طبقے کو کھلے عام تنہا ایسا طبقہ مانا گیا جو سماجی پہل کرنے قابل تھا؛ پیرس کے درمیانی طبقے کے سب درجوں نے — چھوٹے دوکانداروں، دستکاروں، بیوپاریوں وغیرہ نے، صرف بڑے سرمایہ داروں کو چھوڑ کر سبھی نے یہ

حقیقت تسلیم کر لی۔ کمیون نے اس مسئلے کو جو ہمیشہ سے خود درمیانی طبقے کے اندر فساد کی جڑ چلا آتا تھا — قرضداروں اور قرضخواہوں کی حساب فہمی کا مسئلہ دانائی سے سلجھا کر انہیں مصیبت سے بچالیا (۱۱۸)۔ درمیانی طبقے کا یہی وہ حصہ تھا جس نے جون ۱۸۴۸ء میں مزدوروں کی شورش دبانے میں ہاتھ بٹایا اور بدلے میں یہ پایا کہ آئین ساز اسمبلی نے بڑی بے تکلفی سے اسے قرضخواہوں پر قربان کر دیا (۱۱۹)۔ لیکن اس بار جو وہ مزدور طبقے کے ساتھ ہو لیا، اس کی یہی ایک وجہ نہیں تھی۔ درمیانی طبقے نے بھانپ لیا کہ کمیون اور شہنشاہی، دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے، چاہے وہ کسی نام سے بھی سامنے آئے۔ شہنشاہی نے سماجی دولت کی بندر بانٹ کر کے، شیئر بازار کی بڑی اونچی سٹہ بازی کی سرپرستی کر کے، سرمائے کے ارتکاز (centralisation) کی مصنوعی تیز رفتاری میں ملی بھگت سے کام لے کر، اور اس کے کارن درمیانی طبقے کے اس حصے کو بے دخل اور محروم کر کے معاشی طور پر تو خستہ کر دیا تھا۔ اور سیاسی طور پر شہنشاہی نے اسے محکوم بنا کر رکھا تھا، اخلاقی لحاظ سے شہنشاہی کی آئے دن کی عیاشیاں اسے صدمہ پہنچاتی تھیں اور اس کے بچوں کی تعلیم و تربیت بے علم بھائیوں (frères ignorantins) (۱۲۰) کو سونپ کر، والتیروالی روشن خیالی کی تذلیل کی جاتی تھی، شہنشاہی نے درمیانی طبقے کے اسی حصے کے فرانسیسی قومی جذبے کو یوں مصیبت میں ڈالا کہ اس جنگ میں اسے سر کے بل جھونک دیا جس جنگ نے ساری تباہی اور نقصان کے بدلے صرف ایک انعام بخشا اور وہ یہ کہ شہنشاہی کے پرزے اڑ گئے۔ اور واقعی جب بوناپارٹ کے اونچی ناک والے اور سرمایہ داروں کے ٹولے پیرس چھوڑ کر نکل بھاگے تو درمیانی طبقے کی سچی ضابطہ پارٹی نے ”ریپکنوں کی انجمن“، (۱۲۱) کے نام سے قدم باہر نکالا، وہ کمیون کے جھنڈے تلے آئی اور تیسرے کے بہتانوں کے سامنے اس کی حمایت کی۔ درمیانی طبقے کے اس انبوه کثیر کا یہ جذبہ شکرگزاری آنے والی کڑی آزمائشوں میں ثابت قدم رہے گا یا نہیں، وقت ہی بتائے گا۔



کمیون بالکل برحق تھا کسانوں سے یہ کہنے میں کہ ”کمیون کی فتح، کسانوں کی واحد امید ہے۔“ وارسائی میں جتنے بھی جھوٹ تراشے گئے، اور یورپ کے نامور پریس میں زرخیز قلم کھینچ لوگوں نے انہیں دنیا بھر میں پھیلایا، ان سب میں کمال کا جھوٹ یہ تھا کہ ”چودھریوں کی چوپال“، ہی فرانسیسی کسانوں کی سچی نمائندہ ہے۔ تصور شرط ہے، فرانسیسی کسانوں کو ان لوگوں سے کتنی محبت ہوگی جنہیں ۱۸۱۵ء کے بعد سے کروڑوں کی رقم ہرجانے میں بھرنی تھی (۱۲۲) ! فرانسیسی کسان کی نظر میں بڑے جاگیردار کا وجود ہی بجائے خود ایک دھاندلی ہے اس حق کے ساتھ جو ۱۷۸۹ء میں کسان جیت چکے تھے۔ ۱۸۳۸ء میں بورژوازی نے فی فرانک ۴۵ سینٹ بڑھا دیا تھا۔ لیکن لگان میں یہ اضافہ انقلاب کے نام پر کیا گیا اور اب اس نے انقلاب کے خلاف خانہ جنگی بھڑکا دی تاکہ پانچ ارب کا تاوان جنگ جو پروشیا کو بھرنا تھا اس کا بڑا بوجھ کسان کے کندھوں پر پڑے۔ کمیون نے اپنے ایک اعلان عام میں صاف کہہ دیا کہ جنہوں نے جنگ کی آگ لگائی تھی انہی سے یہ تاوان جنگ بھی اگلوایا جائے گا۔ کمیون کسان کو اس کے لہو کے لگان سے آزاد کر دیتا، اسے کم خرچ حکومت دیتا، رجسٹری، اسٹامپ، وکیل، مقدمے کی پیروی کرنے والے اور عدالت کی دوسری خون چوسنے والی جونکوں کے بجائے کمیون کی طرف سے ایسے تنخواہ یافتہ ملازمین رکھ دئے جاتے جو خود اسی کسان کے چنے ہوئے اور اسی کے سامنے جوابدہ ہوتے۔ کمیون اسے ڈسٹرکٹ پولیس، سیاسی پولیس اور فوجداری پولیس کی من مانی کارروائیوں سے نجات دے دیتا۔ اور ان پادریوں کی جگہ، جو کسان کی عقل کجلا دیتے ہیں، دماغ روشن کرنے والے اسکول ماسٹر انہیں دیتا۔ فرانسیسی کسان سب سے اول حساب کتاب دیکھتا ہے۔ اسے یہ بات نہایت معقول نظر آئی کہ پادریوں کا خرچ، سرکاری ٹیکس اگھانے والے اس کی جیب سے نہ نکالیں بلکہ وہ صرف ان لوگوں کی ذاتی مرضی پر منحصر ہو جو مذہبی رجحان یا ایمان رکھتے ہیں۔ کمیون کی عملداری اور صرف یہی عملداری فرانسیسی کسان کی صحیح معنوں میں اتنی کچھ بہبودی کا فوری سامان تھی۔ یہاں یہ غیر ضروری معلوم

ہوتا ہے کہ پیچیدہ مگر دراصل زندگی کے ان اہم مسائل کا تفصیلی بیان کیا جائے جو کسان کے حق میں صرف کمیون ہی سے حل ہو سکتے تھے اور کمیون کو حل کرنے پڑتے۔ مثلاً ان رہن ناموں کا مسئلہ، جو کسان کی چھوٹی سی کاشت کو شکنجے کی طرح کستے چلے جاتے ہیں، کھیت مزدوروں (prolétariat foncier) کا سوال، جن کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے، مثلاً خود کسانوں کی بے دخلی کا مسئلہ، جو جدید ترین زراعت کی ترقی کی بدولت اور سرمایہ دارانہ کاشتکاری کے باہمی مقابلے کے باعث تیز ہوتی جاتی ہے۔

فرانسیسی کسان نے لوئی بوناپارٹ کو رپبلک کا صدر چنا تھا، لیکن ضابطہ پارٹی نے دوسری شہنشاہی بنا ڈالی۔ فرانس کا کسان دراصل کیا طلب کرتا ہے، یہ اس نے ۱۸۴۹ء اور ۱۸۵۰ء سے جتنا شروع کر دیا۔ حکومت کی طرف سے پریفیکٹ مقرر ہوئے تو اس نے جواب میں اپنے میئر کھڑے کئے، سرکار نے پادری دئے تو وہ اپنے اسکول ماسٹر سامنے لایا، حکومت نے سیاسی پولیس بھیجی تو وہ خود سامنے آگیا۔ ضابطہ پارٹی نے جنوری فروری ۱۸۵۰ء میں جتنے قانون بنائے ان کا رخ کسان کے خلاف تھا، اور خود اس پارٹی نے یہ اقرار کیا۔ کسان بوناپارٹ کا حامی تھا کیوں کہ عظیم انقلاب نے اسے جتنے بھی فیض پہنچائے، وہ سمجھا کہ یہ نپولین ہستی ہی انقلاب کا روپ ہے۔ یہ خود فریبی دوسری شہنشاہی کے زمانے میں تیزی سے ہوا ہونے لگی۔ ماضی کی یادوں سے یہ وابستگی (جو اپنی فطرت سے ”چودھریوں کی چوپال“، کے مقصد کے خلاف پڑتی تھی) بھلا وہ کمیون کی اس اپیل کے سامنے کیا ٹھیرتی جس اپیل میں کسانوں کی زندگی کے مفادوں اور فوری تقاضوں کا جواب موجود تھا؟

”چودھریوں کی چوپال“، کو اچھی طرح اندازہ تھا اور اسے سب سے زیادہ یہی دھڑکا لگا تھا کہ اگر پیرس کے کمیون والوں کا صوبوں سے رابطہ کھلا رہا تو کچھ نہیں تو تین مہینے کے اندر ہر طرف کسان بغاوت کی آگ بھڑک اٹھے گی۔ اسی اندیشے سے گھبرا کر اس نے پیرس کو چوطرفہ پولیس گھیرے میں لینے کی جلدی کی تاکہ کمیون کے جراثیم باہر نہ پھیلنے پائیں۔



یوں اگر کمیون سچا نمائندہ تھا فرانسیسی سماج کے صحت مند عناصر کا، یعنی وہ صحیح معنوں میں فرانس کی قومی حکومت تھا اور ساتھ ساتھ مزدور طبقے کی حکومت بھی تھا، محنت کو آزاد کرنے کی خاطر آگے بڑھ کر لڑنے والا بھی تھا، تو وہ انٹرنیشنل کی صحیح تصویر تھا۔ پروشیا کی اس فوج کے مقابل جس نے فرانس کے دو صوبے جرمنی میں جوڑ لئے تھے، کمیون نے اٹھ کر ساری دنیا کے محنت کشوں کو فرانس سے جوڑ لیا۔

دوسری شہنشاہی میں ہرجائی جعل سازی کی عید ہو گئی تھی۔ سبھی ملکوں کے چلتے پرزوں کو دوسری شہنشاہی نے صلائے عام دے دی کہ آئیں، عیاشی کی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھولیں اور فرانسیسی قوم کی لوٹ میں ساجھا کر لیں۔ فی الوقت بھی دیکھئے تو تیسرے کا داہنا بازو گائیسکو ہے، ولاخی چالباز، اور بایاں بازو مارکوفسکی ہے، روسی جاسوس۔ کمیون نے تمام غیرملکیوں کو ایک لافانی کاز کے لئے جان دینے کا موقع دیا۔ بورژوازی نے دو جنگوں کے درمیان، غیرملکی جنگ جو خود اپنی دغا سے ہار دی گئی، اور خانہ جنگی، جس کی سازش غیرملکی فاتح سے مل کر رچی گئی تھی، ان دونوں کے درمیانی وقفے میں اپنی حب وطن کی شان یہ دکھائی کہ پورے فرانس میں بسے ہوئے جرمنوں پر پولیس چڑھادی۔ اور کمیون کا موقع آیا تو اس نے جرمن مزدور (لیو فرانکیل) کو اپنا لیبرمنسٹر مقرر کر دیا۔ تیسرے، بورژوازی اور دوسری شہنشاہی مستقل طور پر اپنی ہمدردی کے بلندبانگ دعووں سے پولینڈ والوں کو فریب دیتے رہے لیکن اصلیت میں انہیں روس کے حوالے کر دیا اور یوں روس کا گندا کھیل انجام کو پہنچا دیا۔ اس کے برخلاف کمیون نے پولینڈ کے سپوتوں کو پیرس کی حفاظت کی سربراہی دے کر انہیں سرآنکھوں پر بٹھایا اور اس وقت جب ایک طرف پروشیا کی فاتح فوج مقابلے میں کھڑی تھی، دوسری طرف بوناپارٹ کی فوج اس کے جنرلوں کی سرکردگی میں غنیمت بنی ہوئی تھی، کمیون نے تاریخ کے اس نئے دور کو ابھارنے کے لئے جو اس

\* دوہروفسکی اور وروبلفسکی - (ایڈیٹر)

نے اپنے دم قدم کے ساتھ سمجھ بوجھ کر شروع کیا تھا، فرانس کی جنگی عظمت کے زبردست نشان ویندوم کی لاٹ کو (۱۲۳) کھڑے قد سے گرا دیا۔

کمیون کا عظیم الشان سماجی کارنامہ خود اس کا وجود اور اس کا عمل تھا۔ کمیون نے جدا جدا جتنے قدم اٹھائے ان سے صرف وہ سمت ظاہر ہوتی تھی جس سمت میں عوامی حکومت کو خود عوام کے ہاتھوں بڑھنا تھا۔ مثلاً یہ کہ بیکری کا رات کا کام بند کر دیا۔ یہ ایک قابل سزا جرم قرار دیا کہ کاروبار کے مالک کی طرف سے طرح طرح کے بہانوں پر جرمانہ لگا کر مزدوری کی رقم کاٹی جائے، یہ ایک چال ہوتی ہے مالک کی، کہ وہ قانون ساز، جج اور حاکم تینوں کے اختیارات سمیٹ کر جرمانوں میں کاٹی ہوئی مزدوری ہضم کر جاتا ہے۔ اسی قسم کا ایک قدم یہ تھا کہ وہ تمام کارخانے اور ورکشاپ جن کے مالک یا تو فرار کر گئے تھے، یا تالے ڈال کر بیٹھ گئے تھے، مزدور انجمنوں کے حوالے کر دئے اور مالک کو معاوضے کا حق باقی رکھا۔

کمیون نے جو مالی تدبیریں اختیار کیں، وہ کفایت شعاری اور اعتدال پسندی میں قابل تعریف تھیں اور ہوئی بھی ایسی ہی تھیں کہ محاصرے میں پڑے ہوئے شہر کے حالات سے میل کھاتی ہوں۔ ہاؤسمان\* جیسے آدمی کی سرپرستی میں بڑی بڑی بینکنگ کمپنیوں نے اور عمارتی ٹھیکیداروں نے مل کر پیرس کو اس طرح لوٹا تھا کہ اب کمیون کو، بلانسیٹ، کہیں زیادہ حق تھا ان کے مال املاک ضبط کر لینے کا جتنا لوٹی بوناپارٹ کو اور لین والوں کی املاک ضبط کرنے کا حق رہا ہوگا۔ ہوہینزولرن والوں اور انگریز سرمایہ دار ٹولی کو کمیون کے اس عمل سے سخت صدمہ پہنچتا تھا کہ کلیساؤں کی املاک

\* بیرن ہاؤسمان - دوسری شہنشاہی کے زمانے میں یہ شخص دریائے سین کے ضلع، یعنی پیرس شہری حلقے کا پولیس پریفیکٹ تھا۔ اس نے شہر کے نقشے میں کچھ ایسی تبدیلیاں کرائیں جن سے مزدوروں کی بغاوت کچلنے کی سہولت رہے۔ (۱۹۰۵ء کے اس روسی ایڈیشن کے لئے نوٹ جو لینن کی ترتیب سے شائع ہوا تھا - ) (ایڈیٹر)



ضبط کرنے کے بعد صرف ۸۰۰ (آٹھ ہزار) فرانک ہاتھ آئے حالانکہ انہی جاگیروں پر ہاتھ صاف کر کے ان ٹولینوں نے بڑی دولت بنائی تھی۔ وارسائی کی حکومت میں جیسے ہی زرا جان پڑی اور اس کے قدم جمے، جھوٹے ہی اس نے کمیون کے خلاف انتہائی ظالمانہ کارروائیاں شروع کر دیں؛ سارے فرانس میں ہر قسم کے آزادانہ اظہار رائے کی بندش اور بڑے شہروں میں ڈیلی گیٹوں کے جلسوں تک کی ممانعت کر دی، وارسائی اور سارے ملک میں جاسوسی کا جال بچھا دیا، وہ بھی اتنے وسیع پیمانے پر کہ خود دوسری شہنشاہی نے نہیں کیا تھا؛ اس کے ژندارسی مخبروں نے ان سارے اخباروں کو جلا ڈالا جو پیرس سے نکلتے تھے؛ پیرس کی ساری ڈاک چھانی جانے لگی؛ اگر دبے لفظوں میں پیرس کی تائید میں زبان کھولنے کی زرا بھی کوشش کی جاتی تو قومی اسمبلی میں اس پر وہ طوفان اٹھایا جاتا جس سے ۱۸۱۶ء کے زمانے کی بدترین رجعت پرست پارلیمنٹ بھی کانوں پر ہاتھ دھرتی۔ وارسائی والے نہ صرف یہ کہ پیرس کے خلاف خون آشام جنگ چلا رہے تھے بلکہ شہر کے اندر روپیہ کھلا کر اور سازشیں کر کے بھی آدمی توڑنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ کیا ان حالات میں کمیون، اپنے فریضے کو دغا دئے بغیر، لبرل ازم یا رواداری کا وہ تکلف برت سکتا تھا جو خاص اس کے زمانے میں برتا جاتا ہے؟ اگر کمیون کی حکومت اپنی فطرت سے ویسی ہوتی جیسی تیسر کی حکومت تو پھر پیرس میں ضابطہ پارٹی کے اخباروں پر اور وارسائی میں کمیون کے اخباروں پر پابندی لگانے کی کوئی ضرورت نہ رہتی۔

”چودھریوں کی چوپال“، کا طیش میں آپس سے باہر ہونا قدرتی بات ہے کیوں کہ اس وقت جب وہ فرانس کی نجات گرجا گھروں کی طرف واپسی میں بیان کر رہے تھے، ان بداعتقاد کمیون والوں نے پکپیوس کی زنانی خانقاہ اور سینٹ لارینٹ (۱۲۴۰) کے گرجا کا کچا چٹھا سنا دیا۔ کیا یہ موسیو تیسر پر کچھ کم طنز تھا کہ اس وقت جب وہ بونا پارٹ کے جنرلوں پر انعام و اعزاز کے پھول برس رہا تھا، اس کمال پر کہ وہ لڑائیاں ہارنے کے فن میں، ہتھیار ڈالنے کی دستاویز پر دستخط کرنے اور ولہلم سہوئے کے مقام پر سگرٹ موڑنے کے فن میں

طاق ہو چکے ہیں، عین انہی دنوں کمیون اپنے جنرلوں کو فرض کی ادائیگی میں زرا بھی بے پرواہی پر برخاست یا گرفتار کر لیتا تھا۔ کیا یہ جعلی دستاویزیں بنانے والے ژبول فاوور کے منہ پر طمانچہ نہیں تھا کہ وہ ابھی تک فرانس کے وزیر خارجہ کی کرسی پر بیٹھ کر ملک کو بسمارک کے ہاتھ فروخت کر رہا تھا، اور بلجیم کی ماڈل حکومت پر حکم چلا رہا تھا، لیکن کمیون نے اپنی حکومت کے ایک ممبر بلائشے کو پہلے برخاست اور پھر گرفتار کر لیا صرف اس قصور میں کہ معمولی دیوالیہ پن کے کارن لیون میں چھ دن کی سزا کاٹنے کے بعد وہ نام بدل کر کمیون میں شریک ہو گیا تھا۔ تاہم اس طرح جیسے پہلے کی سب حکومتیں بلا استثنا دعویدار ہوا کرتی تھیں، کمیون نے اپنی بے گناہی کا کوئی دعوا نہیں کیا۔ وہ اپنے سارے قول و فعل کا حساب پبلک میں پیش کرتا اور اپنی تمام کوتاہیوں سے لوگوں کو باخبر کیا کرتا تھا۔

ہر ایک انقلاب میں یہ ہوتا ہے کہ کھڑے نمائندوں کے علاوہ دوسری قسم کے لوگ بھی سامنے آجاتے ہیں۔ ایک طرف سے ایسے لوگ جو پہلے کے انقلابوں میں شریک اور ان کے جان نثار رہ چکے ہیں، اور موجودہ تحریک کی گہرائی کو نہ سمجھنے کے باوجود، اپنی مشہور دیانت داری اور دلیری کی بدولت یا پھر محض پرانی شہرت و مقبولیت کے سبب لوگوں میں مقبول اور بااثر ہوتے ہیں۔ اور دوسری طرف سے ایسے کھلاڑی جنہیں صرف گیند اچھالنے سے مطلب۔ حکومت وقت کے خلاف ایک ہی ٹھپے کے بیان دیتے دیتے وہ عوام میں صف اول کے انقلابی مشہور ہو جاتے ہیں۔ ۱۸ مارچ کو کمیون کا اعلان ہونے کے بعد اس وضع کے لوگ بھی نمودار ہوئے اور بعض اوقات اہم ذمہ داریاں بھی انہیں سونپی گئیں۔ جس طرح اس قماش کے لوگ پہلے کے تمام انقلابوں کی پوری اٹھان میں رکاوٹیں ڈالا کرتے تھے، اس بار بھی، جہاں تک ان کا بس چلا، مزدور طبقے کی بے لاگ تحریک میں روڑے اٹکاتے رہے۔ یہ لوگ وہ خرابی ہیں جس سے کوئی چارہ نہیں۔ وقت انہیں خود ہی راستے سے ہٹا دیتا ہے۔ مگر کمیون کو اتنا وقت کہاں ملا!



کمیون نے پیرس شہر کی کایا کلب کردی ! دوسری شہنشاہی کے زمانے کا یہ بدکاریوں کا اڈا غائب ہو گیا۔ فرانس کا پائے تخت اب وہ کوچہ نہ رہا جہاں برطانوی جاگیردار، آئرلینڈ کے غیرحاضر (Absentee) (۱۲۵)، امریکہ کے پرانے بردہ فروش اور نو دولتیسے، روس کے سابق غلام آباد تعلقہ دار اور ولاخیا کے سردار گلے ملا کرتے تھے۔ مردہ گھر میں کہیں لاوارث لاش کا پتہ نہ تھا، راتوں کی ٹھگی ڈکیتی کا نشان نہ تھا، چوری شاید ہی کبھی ہوتی ہو۔ فروری ۱۸۴۸ء سے اب تک پہلی بار پیرس کی سڑکوں پر سلامتی کا دور دورہ ہوا، حالانکہ پولیس کا پہرہ بھی کہیں نہیں تھا۔ کمیون کے ایک ممبر کا بیان ہے کہ :

”ہم نے نہ تو کہیں قتل سنا، نہ چوری اور اکا دکا حملے کی واردات۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پولیس، اپنے ساتھ اپنے کم ظرف دوستوں کو بھی وارسائی لے کر چمپت ہو گئی۔“

موالی اپنے سرپرستوں کی بو سونگھتے ہوئے، خاندان، مذہب اور، سب سے بڑی بات، ذاتی ملکیت کے فراری محافظوں کے پیچھے پیچھے ہولٹے۔ ان کے بجائے پہلی صف صحیح معنوں میں پیرس کی ان عورتوں نے سنبھال لی جو بہت قدیم زمانے کی مثالی عورتوں کی طرح جاں باز، شریف اور ایثار پسند تھیں۔ محنت میں لگا ہوا، فکروں اور لڑائیوں میں گھرا ہوا، لہو میں بھرا ہوا پیرس، جس کا ماتھا اپنے تاریخی اقدام کے گہرے احساس سے دمک رہا تھا، ان آدم خوروں کی طرف سے بے پروا ہو کر، جو شہر کی فصیل کے سامنے کھڑے تھے، تن من سے نئے سماج کی اٹھان میں لگ گیا۔

پیرس کی اس نئی دنیا کے بالکل مقابل وارسائی کی پرانی دنیا موجود تھی، تمام گئی گزری عملداریوں کے مردے کھانے والے گدھوں کی یہ منڈلی : جائزوارث والے، اورلین والے، قوم کی لاش پر جھپٹنے والے، جن کی دم میں دقیانوسی رپبلکن اور قومی اسمبلی میں اپنی موجودگی سے بردہ فروشوں (غلام داروں) کی شورش کی تائید کرنے والے ؛ انھیں اسید تھی

کہ خود پسند بوڑھے مسخرے کی سرکردگی کی بدولت وہ پارلیمنٹری رپبلک سنبھال لے جائیں گے ؛ یہ ژے دے پوم \* میں آسیب زدہ جلسے بلا کر ۱۷۸۹ء کے واقعات کا منہ چڑانے میں لگے تھے۔ یہ قومی اسمبلی جو فرانس کی ہر ایک مردار شے کی نمائندہ تھی، اپنی زندگی کا بہم رکھنے میں صرف لوئی بونا پارٹ کے جنرلوں کی محتاج تھی۔ پیرس محض حق، وارسائی صرف باطل، اور اس باطل کی صدا لگانے والا تھا تیسر۔ تیسر نے سین اور آواز حلقوں کے میٹروں کے ایک وفد سے خطاب کرتے ہوئے کہا :

”آپ صاحبان میرے قول پر بھروسہ رکھئے۔ میں نے کبھی اپنا قول نہیں ہارا۔“

اس نے قومی اسمبلی سے کہا کہ ”آج تک فرانس نے جتنی اسمبلیاں دیکھی ہیں، یہ اسمبلی ان سب سے زیادہ روادار اور سب سے زیادہ آزادانہ چنی ہوئی اسمبلی ہے۔“ اپنے وردی پوش فوجیوں کو تھپکا کہ ”یہ فوج دنیا میں ایک معجزہ ہے، فرانس کو ایسی اچھی فوج کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔“ صوبوں کو اس نے بتایا کہ ”پیرس پر اس کے حکم سے گولہ باری محض ایک افسانہ ہے :

”اگر توپوں کے دھانوں نے کچھ گولے برسائے ہوں تو وارسائی کی فوج نے نہیں بلکہ شورش پسندوں نے برسائے ہوں گے، جو یہ دکھانا چاہتے تھے کہ مقابلہ کر رہے ہیں، اگرچہ وہ اپنی صورتیں دکھاتے ڈرتے ہیں۔“

بعد میں اسی تیسر نے صوبوں کو اطلاع دی کہ :

”وارسائی کا توپخانہ پیرس پر گولہ باری نہیں کر رہا ہے بلکہ صرف گولی چلا رہا ہے۔“

\* وہ ٹینس کورٹ جہاں ۱۷۸۹ء کی قومی اسمبلی نے مشہور فیصلے کئے تھے (۱۲۶)۔ (۱۸۷۱ء کے ایڈیشن کے لئے اینگلس کا نوٹ۔)



پیرس کے بڑے پادری (آرچ بشپ) سے اس نے کہا کہ لوگوں کو گولی سے اڑانے یا زیادتیوں (!) سے کام لینے کا وارسائی کی فوج پر بہتان لگایا جاتا ہے۔ پیرس کو مخاطب کیا کہ ”شہر کو ان ظالموں کے پنجے سے آزاد کرانا، چاہتا ہے جو ”نفرت انگیز ستمگر ہیں“، اور یہ کہ کمیون والا پیرس ”مجرموں کا ایک انبوہ ہے“۔

تیسرے کی پسند کا پیرس ”ہجوم عام“، کا پیرس نہ تھا، وہ تو نظر فریبی کا شہر تھا، francs-filours (۱۲۷) کا شہر، سایہ دار روشوں کا شہر جن میں زردار، دولتمند، سونے میں جگمگ کرتے، مفت خورے پیرس والے مردوزن گھومتے پھرتے ہوں، ان خدمت گزاروں، چوراچکوں، ادبی آوارہ گردوں، اور cocottes کا پیرس، جو فی الحال وارسائی، سین دینی، روئیس اور سین ژرمن میں بھرے ہوئے تھے اور جس کی نظر میں خانہ جنگی صرف ایک دلچسپ تفریح تھی، جو دوربینوں میں سے جنگی کارروائیوں کی جھلک دیکھتا، توپوں کی باڑھ کا حساب جوڑتا اور اپنی عزت کی اور اپنی آبرو باختہ عورتوں کی آبرو کی قسم کھا کھا کر دعوے کیا کرتا تھا کہ یہ اتنا عمدہ تماشا چل رہا ہے کہ پورٹ سین مارتین کے تھیٹر میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہاں جو مرتے تھے، وہ سچ سچ موت کے منہ میں جا رہے تھے، زخمیوں کی چیخیں اصلی تھیں اور پھر لطف یہ کہ نظر کے سامنے وہ ڈرامہ چل رہا تھا جس کی عالمی تاریخ کے اسٹیج پر اہمیت تھی۔

یہ تھا موسیو تیسرے کا پیرس، بالکل اسی طرح جیسے کوبلیتس کی پناہ گزیں حکومت ہی موسیو دی کلون کا اصلی فرانس تھی (۱۲۸)۔

۳

بردہ فروشوں نے جو سازش کی تھی کہ پروشیائی فوج کا قبضہ کرا کے پیرس کو دبا لیں گے، اس کی پہلی کوشش تو یوں ناکام ہوئی کہ بسمارک نے قبضہ لینے سے انکار کر دیا۔ دوسری کوشش ۱۸ مارچ کو کی گئی، وہ یوں تمام ہوئی کہ فوج نے شکست کھائی اور حکومت

وارسائی کی طرف بھاگ نکلی، پھر اسی کے آرڈر پر انتظامی محکموں نے بھی اپنا کام چھوڑ کر وارسائی کا رخ کیا۔ پیرس سے صلح کی گفتگو کی آڑ لے کر تیسرے نے اتنی سہلت حاصل کر لی جس میں پیرس سے جنگ کی پوری تیاری کر لی جائے۔ مگر فوج کہاں سے آئے؟ چھاوونی کی رجمنٹوں میں جو تھوڑے بہت آدمی ٹھہرے تھے، شمار میں کم اور کردار میں کچھے تھے۔ تیسرے نے صوبوں کے نام زوردار تقاضے بھیجے کہ نیشنل گارڈ اور والنٹیروں سے وارسائی حکومت کو کمک بھیجی جائے، جواب میں صرف انکار ملا۔ لے دے کے صرف صوبہ بریتان نے مٹھی بھر شوآن (۱۲۹) روانہ کئے، جو سفید جھنڈے تلے لڑتے تھے، ہر ایک کے سینے پر سفید کپڑے سے یسوع مسیح کا دل ٹکا ہوا تھا؛ ان کا جنگی نعرہ تھا «Vive le Roi!» (بادشاہ سلامت، زندہ باد!)۔ اس طرح تیسرے نے بھاگ دوڑ کر کے اوت پٹانگ وردیوں کا ایک ہجوم اکٹھا کر لیا، جس میں جہاز کے خلاصی، پیدل نیوی کے سپاہی، پاپائے روم کے زواو (۱۳۰)، والن تین کی ژنداری والے، پیٹری کے پولیس والے اور جاسوس شامل تھے۔ یہ فوج کسی کرم کی نہ ہوتی اگر بوناپارٹ کی فوج کے وہ جنگی قیدی رفتہ رفتہ اس کی صفوں میں آکر نہ ملتے جنہیں بسمارک صرف اتنی تعداد میں چھوڑتا رہا جو ایک طرف تو خانہ جنگی جاری رکھنے کے لئے پوری پڑے، دوسری طرف وارسائی کی حکومت کو پروشیا کا محتاج بنا کر رکھے۔ جنگ کے دنوں میں وارسائی کی پولیس برابر ان فوجیوں پر نظر رکھتی تھی، اور ژنداری والوں کو سب سے خطرناک ٹھکانوں پر کھڑا ہونا پڑتا تھا تاکہ یہ فوج ان کے پیچھے وہاں پہنچے۔ جو قلعے ہاتھ لگے وہ بھی فتح سے نہیں، خریداری سے ہاتھ لگے۔ کمیون والوں کی جاں بازی نے تیسرے پر ثابت کر دیا کہ نہ تو اس کی جنگی چالوں کے کمال سے پیرس کے دانت کھٹے کئے جاسکتے ہیں، نہ ان سنگینوں کی مدد سے جو اسے میسر تھیں۔

اس عرصے میں صوبوں کے ساتھ اس کے تعلقات میں فرق آتا چلا گیا۔ وارسائی میں ایک بھی خوشنودی کا پیغام ایسا نہ پہنچا جس سے تیسرے اور اس کی ”چودھریوں کی چوپال“ کا دل کچھ ٹھنڈا ہوتا۔ اٹھے



ہر طرف سے وفد اور تحریری پیغام ایسے لب ولہجہ میں چلے آ رہے تھے جس میں عزت و احترام کا شائبہ نہ تھا، اور یہ تقاضے کرتے تھے کہ پیرس سے صلح کر لینی چاہئے اس بنیاد پر کہ ریپبلک کو بے حیل حجت تسلیم کیا جائے، کمیون کی آزادیاں مان لی جائیں، اور قومی اسمبلی کو، جس کے اختیار کی سبب گزر چکی ہے، توڑ دیا جائے۔ وفد اور خطوط اتنی بڑی تعداد میں آئے کہ تیسرے وزیر قانون دیوفور نے وکیل سرکار کے نام ۲۳ اپریل کے سرکار میں یہ حکم بھیجا کہ ”صلح کی پکار“، کو جرم قرار دیا جائے! پیرس کے مقابلے میں اپنی سہم کچی دیکھ کر تیسرے نے فیصلہ کیا کہ چال بدلنی چاہئے اور ۳۰ اپریل کو پورے فرانس میں میونسپل انتخابات کرائے جائیں۔ یہ انتخاب اس نئے قانون کی بنا پر رکھے گئے جو خود تیسرے نے قومی اسمبلی کے سر تھوپا تھا۔ کچھ اپنے پریفیکٹوں کے جوڑ توڑ سے، کچھ پولیس کی دھمکیوں سے کام لے کر اسے یقین تھا کہ میونسپل انتخابات کی بدولت صوبوں سے قومی اسمبلی کو وہ اخلاقی مدد مل جائے گی جو پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی اور آخر صوبوں سے وہ مادی طاقت بھی ہاتھ آئے گی جس سے پیرس کو دبا لیا جائے۔

تیسرے کی شروع سے یہ کوشش تھی کہ وہ پیرس سے جو غارت گرانہ جنگ کر رہا ہے، جس کی بڑھ بڑھ کر داد دی جاتی ہے اس کے خاص پلیٹینوں میں، اور اس کے وزیروں نے سارے فرانس میں جو دہشت کا راج قائم کرنے کی کوشش کی ہے اسی کے ساتھ صلح صفائی کا ہلکا پھلکا کھیل بھی چلتا رہے جس کی بدولت کئی کام نکل آئیں گے: ایک تو یہ کہ صوبوں کو دھوکے میں رکھا جاسکے گا، دوسرے پیرس میں درسیانی طبقے کے کچھ حصے کی توجہ اس کی طرف کھنچے گی، اور بڑی بات یہ کہ قومی اسمبلی میں جو لوگ ریپبلکن ہونے کا بھرم رکھتے ہیں انہیں موقع ملے گا کہ پیرس سے اپنی غداری پر تیسرے سے اپنی وفاداری کا پردہ ڈال سکیں۔ ۲۱ مارچ کو جب تیسرے کے پاس فوج کا بندوبست نہیں ہوا تھا اس نے قومی اسمبلی کو خطاب کر کے کہا: ”چاہے جو ہو، میں پیرس پر فوج نہیں بھیجنے والا۔“

۲۷ مارچ کو اس نے پھر آواز بلند کی:

”میں نے جب اپنا عہدہ سنبھالا تو ریپبلک کا وجود ایک حقیقت تھا۔ میں نے اس کی حفاظت کا پختہ عہدہ کیا ہے۔“

اصلیت یہ ہے کہ ریپبلک کے نام پر اس نے لیون اور مارسیلز مقامات پر انقلاب کو کچل ڈالا (۱۳۱)۔ وہ بھی ایسے وقت جب وارسائی میں ”چودھریوں کی چوپال“، ”ریپبلک“ کے لفظ پر ہنگامہ کھڑا کر دیتی تھی۔ جب وہ اس کارنامے سے فارغ ہو چکا تو ”مانی ہوئی حقیقت“، (ریپبلک کا مرتبہ) اس نے مجوزہ حقیقت کہہ کر گھٹایا۔ اورلین کے وہ شہزادے، جنہیں احتیاط کے مدنظر اس نے بورڈو سے ہٹا دیا تھا، انہیں چھوٹ مل گئی کہ قانون کی کھلی خلاف ورزی کر کے دریو کے مقام پر جوڑ توڑ کیا کریں۔ پیرس کے اور صوبوں کے ڈیلی گیٹوں سے بے شمار ملاقاتوں میں جو صلح کی شرطیں وہ زبان سے نکالتا تھا، چاہے ان بیانوں میں وقت اور حالات کی نسبت سے لب ولہجہ اور نشیب فراز کا کتنا ہی فرق کیوں نہ پڑے، تاہم انتقام کے معاملے میں اس حد سے کبھی نہیں گزرا کہ

”مجرموں کے اس چھوٹے سے گروہ سے انتقام لیا جائے گا جو کلیماں تھامس اور لیکونت کے قتل کے ذمہ دار ہیں۔“

البتہ یہ ضرور ملحوظ رہتا تھا کہ پیرس اور پورا فرانس بلاشرط موسیو تیسرے کو ہی ریپبلک کی بہترین صورت مان لیں، ٹھیک اسی طرح جیسے خود تیسرے نے ۱۸۳۰ء میں بادشاہ لوئی فلپ کو ریپبلک کی بہترین صورت مانا تھا۔ بہر حال ان تھوڑی بہت رعایتوں کو بھی وہ یوں شبہ میں ڈال دیتا تھا کہ قومی اسمبلی کے سامنے تیسرے کے وزیر ان بیانات یا شرائط پر سرکاری حاشیے چڑھا دیا کرتے تھے۔ صرف اس پر بس نہیں بلکہ دیوفور کے ذریعے بھی وہ اثر انداز ہوتا رہتا تھا۔ دیوفور اورلین والوں کا حاشیہ پرانا وکیل تھا جو ہمیشہ محاصرے کے دنوں میں عدالت عالیہ کا کرسی نشین رہا تھا، آجکل کی طرح ۱۸۷۱ء میں تیسرے کے دور حکومت میں، ۱۸۳۹ء میں لوئی فلپ کی بادشاہی میں، اور ۱۸۴۹ء میں جب لوئی بوناپارٹ کی صدارت تھی تب بھی وہی سپریم



کورٹ کا جج تھا۔ جب وزارت ہاتھ میں نہ ہوتی تو یہ شخص پیرس کے سرمایہ داروں کے مقدمے لڑ کر رویہ بناتا اور پھر ان قانونوں پر حملے کر کے جو خود اسی کے دماغ کی پیداوار تھے، سیاسی مقبولیت بھی کما لیتا تھا۔ قومی اسمبلی میں تیزی سے جو ظالمانہ قانونوں کا ایک سلسلہ منظور کرا لیا گیا کہ پیرس پر غلبہ پالینے کے بعد ان قانونوں کے ذریعے فرانس میں ریپبلکن آزادیوں کا نام و نشان تک مٹایا جانا تھا، اس جج کی تسکین نہیں ہوئی اور آئندہ کے لئے اس نے پیرس کی تقدیر یہ تجویز کی کہ کورٹ مارشل کی کارروائی چوں کہ اس کے خیال سے بہت دھیرے چلتی تھی، اس لئے کارروائی کی تفصیلات کتر کر (۱۳۲)، جلاوطنی کی سزا کے نئے اندھے قانون بنائے۔ ۱۸۴۸ء کے انقلاب نے سیاسی جرائم پر سزائے موت منسوخ کر دی تھی، اس کی جگہ جلاوطنی رکھی تھی۔ لوئی بوناپارٹ کو یہ ہمت نہ ہوئی کہ سزائے موت کا دور پھر سے لے آتا، وہ کم از کم اسے تحریری شکل تو نہ دے سکا۔ ”چودھریوں کی چوپال“، میں ابھی ہمت کی کمی تھی کہ پیرس والوں کو باغی کے بجائے قاتل نہ کہہ سکے، مگر ہاں، انہوں نے پیرس سے انتقام لینے پر کمر باندھی تو جلاوطنی کے بارے میں دیوفور کے نئے قانون سے شروع کیا۔ ان تمام حالات کے ہوتے تیسرے اپنا صلح کے نامہ و پیام والا کھیل نہیں کھیل سکتا تھا اگر اس تماشے پر، اس کے اپنے منشا کے مطابق، وہ ”چودھریوں کی چوپال“، دیوانگی سے چیخ پکار نہ مچاتی رہتی، جو اپنی موٹی عقل کے باعث نہ تو اس کا کھیل سمجھ رہی تھی، نہ اس دورخی پالیسی میں دکھاوے اور ٹال مٹول کی ضرورت سمجھنا اس کے بس کی بات تھی۔

۳۰ اپریل کے میونسپل الکشن قریب تھے، تیسرے نے ۲۷ اپریل کو صلح کا ایک منظر تیار کیا۔ جذباتی تقریروں کے سیلاب کے درمیان اس نے قومی اسمبلی کے اسٹیج سے پکار کر کہا :

”ریپبلک کے خلاف صرف ایک سازش کا وجود ہے، وہ پیرس کی سازش جو ہمیں فرانسیسی خون بہانے پر مجبور کر رہی ہے۔ لیکن میں بار بار دھراتا ہوں کہ وہ جنہوں نے

ناپاک ہتھیار اٹھا رکھے ہیں، ہتھیار رکھ دیں اور ہم اپنی تعزیری تلوار فوراً روک لیں گے، صلح نامہ کر لیں گے، جس سے مجرموں کی صرف ایک ٹولی کو مستثنیٰ رکھا جائے گا۔“

”چودھریوں کی چوپال“ کے ممبروں نے تقریر میں شور مچایا تو اس کے جواب میں وہ بولا :

”حضرات، صاف کہئے، آپ سے پرزور درخواست ہے، بتائیے، میں نے کیا غلط کہا؟ کیا آپ کو واقعی افسوس ہے کہ میں نے حقیقت بیان کر دی کہ مجرم صرف ایک ٹولی ہیں؟ اتنی ساری آفتوں میں، کیا یہ خوش قسمتی نہیں ہے کہ وہ جنہوں نے جنرل کلیمان تھامس اور جنرل لیکونت کے خون میں ہاتھ رنگے وہ محض گنتی کے لوگ ہیں۔“

تاہم فرانس نے تیسرے کی ان تقریروں کو، جنہیں وہ یہ سمجھ کر خوش تھا کہ پارلیمنٹ کے سارے نغمے اسیر کر لیں گی، اس کان سنا، اس کان اڑادیا۔ سات لاکھ میونسپل کونسلروں میں سے، جنہیں ان ۳۵۰۰۰ حلقوں نے چنا تھا جو فرانس کے ہاتھ میں رہ گئے تھے، جائزوارث والے، اور لین والے اور بوناپارٹ کے حامی مل کر بھی اپنے ۸۰۰۰ امیدوار کامیاب نہ کر سکے۔ ضمنی انتخابات نے جو نتائج دکھائے وہ تیسرے کی حکومت کے حق میں اور بھی برے تھے۔ قومی اسمبلی نہ صرف یہ کہ صوبوں سے اتنی نشستیں نہ لے سکی جو مادی طاقت بنائے رکھنے کے لئے لازم تھیں، بلکہ اخلاقی طاقت کا آخری حق بھی کھو بیٹھی : یہ حق کہ وہ خود کو ملک کی رائے عامہ کا ترجمان شمار کرے۔ شکست میں جو کسر تھی وہ یوں پوری ہوئی کہ تمام فرانسیسی شہروں کی نئی منتخبہ میونسپل کمیٹیوں نے بوردو میں جوابی اسمبلی سے وارسائی کی اسمبلی کی غاصبانہ طاقت کو کھلا چیلنج کر دیا۔ وہ وقت آگیا جس کا انتظار بسمارک ایک زمانے سے کر رہا تھا۔ حاکمانہ انداز میں اس نے تیسرے سے کہا کہ اپنے مختار عام کو فرینکفرٹ روانہ کر دے تاکہ صلح نامے پر آخری دستخط ہو جائیں۔



اپنے مالک کا حکم بجا لانے کے لئے نہایت ادب سے تیسرے نے جلدی جلدی بھروسے کے آدمی ژیلول فاور کو فرینکفرٹ کی طرف رخصت کیا اور پوئیسے کرتیسے کو اس کے ساتھ کر دیا۔ یہ شخص پوئیسے کرتیسے کو اس کے ساتھ مل کا ”مشہور“، مالک، دوسری شہنشاہی کا گرم، جی حضوری، حامی و مددگار، جس نے اس شہنشاہی میں بس ایک ہی خرابی دیکھی تھی کہ انگلینڈ کے ساتھ ایسا تجارتی معاہدہ (۱۳۳) کر لیا جس کی زد روان کے لٹھا مل مالک پر پڑتی تھی۔ تیسرے نے اسے بورڈو کے دنوں میں وزیر مال مقرر کیا تھا کہ اس نے انگلینڈ کے ساتھ ”ناپاک“، معاہدے پر حملہ شروع کر دیا اور اشاروں میں کہا کہ یہ معاہدہ عنقریب منسوخ کیا جائے گا، ڈھٹائی سے اس دھمکی کی تعمیل کی طرف بھی قدم اٹھا دیا، اگرچہ اس کی چلی نہیں (کیوں کہ بسمارک سے تو اجازت مانگی نہیں تھی)، دھمکی یہ کہ الزاس صوبے کے خلاف پرانی بندشی ڈیوٹیاں پھر جاری کر دیں، وجہ بقول اس کے یہ کہ پہلے کے کوئی انٹرنیشنل معاہدے اس ڈیوٹی کی راہ میں حائل نہیں ہوتے تھے۔ یہ وہ شخص تھا جس نے انقلاب کے خلاف کارروائی کو روان میں مزدوریاں گھٹا دینے کا ایک ذریعہ سمجھا اور فرانسیسی صوبوں کے غنیم کے ہاتھ پڑنے میں یہ گنجائش پائی کہ فرانس بھر میں اپنے مال کے دام بڑھادے۔ بھلا اس قماش کے آدمی کو چھوڑ کر تیسرے کی نگاہ انتخاب اور کس پر پڑتی کہ ژیلول فاور کا مددگار ہو کر جائے، اس کی آخری اور چوٹی کی دغا بازی میں ہاتھ بٹائے؟

جب مختار عام کا حق رکھنے والی یہ عمدہ جوڑی فرینکفرٹ پہنچی تو بسمارک نے بے سروتی اور سختی سے اس کے سامنے یہ دو راستے رکھ دیئے: ”یا تو شہنشاہی بحال کی جائے یا صلح کی جو شرطیں میں مقرر کروں انہیں بے چون و چرا مان لیا جائے!“، ان شرطوں میں یہ رکھا گیا تھا کہ تاوان جنگ بھرنے کی مدت میں جو درمیانی وقفے تھے وہ اور مختصر ہوں، اور پیرس کے قلعے پر روشیائی فوج کے قبضے میں تب تک رہیں جب تک فرانس کی صورت حال سے بسمارک خوب مطمئن نہ ہو جائے۔ اس طرح پروشیا کی حیثیت فرانس کی اندرونی سیاست میں سرپنچ کی ہو جاتی! اس کے بدلے میں بسمارک نے یہ پیش کش

کر دی کہ بوناپارٹ کی فوج سے جو قیدی ہیں انہیں پیرس کی بربادی کی راہ پر رہا کر دیا جائے گا، بلکہ شاہ ولہلم قیصر جرمنی کی فوجیں بھی ان کی کمک کو جائیں گی۔ اپنے قول کی سچائی دکھانے کو اس نے تاوان جنگ کی پہلی قسط کی ادائیگی پیرس میں ”امن چین“، ہونے تک ملتوی کر دی۔ تیسرے اور اس کے مختار عام یہ نوالہ شوق سے نگل گئے۔ انہوں نے ۱۰ مئی کو صلح نامے پر دستخط کر دیئے اور وارسائی کی اسمبلی نے ۱۸ مئی کو اس پر مہر تصدیق بھی لگادی۔

صلح نامہ ہونے اور بوناپارٹ والے جنگی قیدیوں کے چھوٹ کر آنے تک تیسرے کو اور بھی مجبوری تھی صلح کے نامہ و پیام کا تماشا جاری رکھنے کی، کیونکہ اس کے رپبلکن کل پرزے ایسا بہانہ تلاش کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے جس سے پیرس میں قتل عام کی تیاری گلے اتر سکے۔ ۸ مئی کو تیسرے نے درمیانی طبقے کے صلح پسندوں کے ایک وفد سے گفتگو میں کہا:

”جیسے ہی شورش پسند (insurgents) (۱۳۴) ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہو جائیں گے، پیرس کے پھانک ہفتہ بھر کے لئے سب پر کھول دیئے جائیں گے، سوائے ان کے جنہوں نے جنرل کلیمان تھاس اور لیکونٹ کے خون میں ہاتھ رنگے ہیں۔“

چند روز بعد جب ”چودھریوں کی چوپال“، نے اس سے جواب طلب کیا کہ یہ وعدہ کس بنا پر کیا گیا تو وہ جواب دینے سے کترایا لیکن پھر بھی یہ معنی خیز جملے کہہ گیا:

”میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ کے درمیان بڑے بے صبرے لوگ ہیں جنہیں ہر بات کی جلدی پڑی ہے۔ اور زرا ہفتہ بھر صبر سے کام لیں۔ ایک ہفتے بعد کوئی خطرہ نہیں رہ جائے گا۔ اور جو کام انجام پانا ہے وہ ان کی سرفروشی اور صلاحیت کے مطابق انجام پائے گا۔“

جیسے ہی میک موہن نے اسے یقین دلایا کہ وہ پیرس کے اندر فوج بڑھا سکتا ہے، تیسرے نے قومی اسمبلی کو خبر دی کہ



”پیرس میں قدم رکھتے وقت قانون ہمارے ہاتھ میں ہوگا اور ان رذیلوں کو مجبور کیا جائے گا جنہوں نے سپاہیوں کا خون بہایا اور قومی یادگاروں کو ڈھایا ہے کہ اپنے جرائم کی پوری سزا بھگتیں۔“

فیصلہ کن لمحہ قریب آتا دکھائی دیا تو اس نے قومی اسمبلی سے کہا کہ ”میں معاف نہیں کرنے والا“۔ پیرس سے کہا کہ سزا کا فیصلہ سنایا جاچکا اور اپنے بونا پارٹ والے ڈاکوؤں کو بتایا کہ حکومت کی طرف سے عام اجازت ہے، جتنا چاہیں، پیرس سے انتقام لے لیں۔ آخر ۲۱ مئی کو جب دغا سے پیرس کے پھاٹک جنرل دوئے پر کھل گئے تو دوسرے دن تیسرنے ”چودھریوں کی چوپال“ پر اپنے صلح والے تماشے کی وہ ”غرض“ بھی کھول دی، جس سے انہوں نے اپنی عقل و فہم کے دروازے سختی سے بند کر رکھے تھے۔

”میں آپ صاحبان کو چند روز پہلے بتاچکا ہوں کہ ہم اپنے مقصد کے قریب پہنچنے والے ہیں۔ آج یہ بتانے آیا ہوں کہ ہم اپنے مقصد کو پہنچ گئے۔ ضابطہ، انصاف اور تہذیب نے بالآخر فتح پائی۔“

ہاں، فتح تو ہو گئی۔ بورژوازی وضع کے تہذیب و انصاف اپنے اصلی اور بدطینت رنگ میں سامنے آجاتے ہیں جب اس کے بندے، اس کے روندے ہوئے مالکوں کے خلاف سر اٹھاتے ہیں۔ یہ تہذیب اور یہ انصاف بے نقاب ہو کر درندگی اور بے لگام انتقام کے روپ میں نکل پڑتا ہے۔ دولت پیدا کرنے والے اور دولت ہتھیا لینے والے طبقوں کے درمیان جنگ چھڑتی ہے تو ہر بار نازک لمحہ آتے ہی یہ حقیقت اور بھی نظروں پر روشن ہو جاتی ہے۔ جون ۱۸۴۸ء میں بورژوازی نے ستم توڑے تھے، ۱۸۷۱ء کے انہوں نے مظالم ان سے کہیں بڑھ گئے۔ پیرس میں وارسائی فوج کے داخل ہو جانے کے بعد آٹھ دن تک شہر کی آبادی نے، مردوں، عورتوں اور بچوں نے جس جگر داری اور سرفروشی سے مقابلہ کیا، وہ بھی ان کے مقصد کی عظمت کا اسی طرح

جلوہ دکھاتی ہے جیسے فوج کی درندگی اس تہذیب کی روح کا پتہ دیتی ہے جس تہذیب کی طرف سے کرائے کے ٹٹو اور انتقامی بن کر یہ فوجی نکلے تھے۔ واقعی کیسی شاندار تہذیب ہے یہ، جسے اس مشکل کا سامنا ہے کہ ان لوگوں کی لاشوں کے ڈھیر کہاں ٹھکانے لگائے جو لڑائی ختم ہونے کے بعد مارے گئے ہیں!

تیسرے اور اس کے خون کی کتوں کے کرتوت کی اگر کوئی مثال دیکھنی ہو تو روم قدیم کے سولاولے اور بعد کے دو فوجی ڈکیتی دور میں مل سکتی ہے (۱۳۵)۔ اب بھی ویسا ہی بے تحاشا قتل عام ہوا؛ اب بھی جلادوں نے ویسے ہی نہ مرد عورت کی تمیز کی، نہ بوڑھے بچے کی؛ اب بھی قیدیوں کو اسی طرح اذیت دی گئی، اب بھی زندگی عذاب کردی گئی، مگر اس بار پورا ایک طبقہ اس کا شکار تھا؛ اب بھی چھپے ہوئے لیڈروں کی تلاش میں درندگی کا برتاؤ تھا کہ کوئی بچ کر نکلنے نہ پائے؛ اب بھی سیاسی اور ذاتی دونوں دشمن عتاب میں آئے؛ اب بھی ان لوگوں کے ساتھ آنکھ بند کر کے وہی درندگی برتی گئی جن کو اس لڑائی سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تب روم والوں کے پاس نہ تو مترالیوز تھیں کہ پورے پورے ہجوم کو ایک باڑھ میں مار کر گرا دیا جائے، ”نہ ہاتھوں میں قانون“، اور نہ زبان پر ”تہذیب“۔

جب یہ سارے ہولناک مظالم توڑے جا چکے تو بورژوا تہذیب کا اور زیادہ گندا رخ بھی دیکھنے قابل تھا جو خود اسی کے پیرس نے بیان کیا ہے!

لندن کے ایک قدامت پسند اخبار کا نامہ نگار پیرس سے لکھتا ہے:

”ابھی دور دور سے گولی چلنے کی آوازیں آرہی ہیں؛ زخمی جو اپنے حال پر چھوڑ دئے گئے، پیر لاشیز کے قبرستان میں قبروں کے درمیان مرتے جا رہے ہیں؛ ۶۰۰۰ شورش پسند دہشت اور بدحواسی میں زمین دوز بھول بھلیوں میں بھٹکتے پھر رہے ہیں؛ سڑکوں پر ان بدمنصیبوں کے ہجوم ہنکائے جاتے ہیں تاکہ مترالیوز سے انہیں ایک ساتھ توپ دم کر



دیا جائے۔ ایسے وقت یہ دیکھ کر دل پر چوٹ لگتی ہے کہ تاش، بلیئرڈ اور ڈومینو کے شوقینوں سے چائے خانے بھرے ہوئے ہیں۔ اور بنی ٹھنی عورتیں بے حیائی سے سایہ دار روشوں میں ٹھلتی پھر رہی ہیں، اور پیش قیمت ریسٹورانوں کے پرائیویٹ کمروں سے رنگ رلیوں کی صدائیں بلند ہو کر رات کا سناٹا توڑتی رہتی ہیں۔“

مسٹر ایڈورڈ ہروے (۱۳۶) «Journal de Paris» وارسائی کے اس اخبار میں جو کمیون نے بند کر دیا تھا، لکھتے ہیں :

”پیرس کی آبادی (کونسی!) نے جس رنگ میں کل اپنی خوشی کا اظہار کیا، اور جو واقعی آپس سے باہر ہونے سے بھی کچھ سوا تھا، اندیشہ ہے کہ وہ اور بھی بدتر نہ ہو جائے۔ پیرس میں جشن کا منظر ہے جو کسی طرح زیب نہیں دیتا۔ اگر ہمیں اپنے آپ کو زوال آمادہ پیرس والے (Parisiens de la décadence) نہیں کہلانا ہے تو اس سلسلے کو بند کر دینا ضروری ہے۔“

آگے چل کر وہ تاسیت سے ایک اقتباس دیتا ہے :

”ابھی یہ ہولناک جنگ ختم ہونے بھی نہ پائی تھی کہ دوسری صبح کو نیچ اور بدچلن روم نے پھر عیاشی کی اسی دلدل میں خود کو ڈال دیا جس نے اس کا بدن کھا لیا تھا اور روح کو گندگی میں سان دیا تھا — alibi proelia et vulnera, alibi balneae popinaeque (یہاں زخم اور شمشیریں، وہاں عشرت کی تدبیریں)۔“

مسٹر ایڈورڈ ہروے یہ بتانا بھول گئے کہ جسے وہ ”پیرس کی آبادی“ کہہ رہے ہیں، وہ موسیو تیر کے پیرس کی آبادی ہے، فراری فرانسیسیوں کا وہ پیرس، جو وارسائی، سین دینی، روئیس اور سین ژرمین کے مقامات سے ہجوم کر کے ادھر ڈھل رہا ہے، یہ واقعی ”زوال آمادہ“ پیرس ہے۔

یہ مجرمانہ تہذیب، جس کی بنیاد محنت کو مطیع رکھنے پر ہے، ہر بار جب خون بہا کر فتح کے شادیانے بجاتی ہے تو نئے اور بہتر سماج کی خاطر جان قربان کرنے والے اپنے ان مقتولوں کی چیخوں کا گلا گھونٹ دیتی ہے اس زہریلے گالی کوسنے کے شور سے جو دنیا کے گوشے گوشے میں گونجنے لگتا ہے۔ مزدوروں کا متین پیرس، کمیون کا پیرس ایک دم بدل کر ”ضابطے“ کے ان خونی کتوں کے شور قیامت سے جہنم بن گیا۔ یہ طلسماتی تبدیلی تمام ملکوں کے سرمایہ دارانہ دماغ کو کیسی لگتی ہے؟ یہی نا کہ پیرس کمیون نے تہذیب و تمدن کے خلاف سازش کی تھی! پیرس والے تو کمیون کی خاطر جانیں ہتھیلی پر رکھ کر نکلے: تاریخ میں کسی ایسے معرکے کا ذکر نہیں آیا جس میں اتنے لوگوں نے خود کو قربان کیا ہو۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ یہی نا کہ کمیون اصل میں جتنا کا راج نہیں تھا بلکہ مٹھی بھر مجرموں نے زبردستی طاقت چھین لی تھی! پیرس کی عورتیں راستے کی رکاوٹوں (یری کیڈوں) پر اور پھانسی کے تختوں پر خوشی خوشی اپنے جیون وارتی ہیں۔ اس سے کیا نکلتا ہے؟ یہی نا کہ کمیون کے راکھش نے انھیں جادو کے زور سے ڈائن بنادیا تھا۔ کمیون کو دو مہینے تک جب سیاہ و سفید کا اختیار حاصل تھا ایسی رواداری دکھائی جس کی مثال شہر کے بچاؤ میں جان بازانہ مردانگی سے ہی مل سکتی ہے۔ آخر اس کے کیا معنی ہیں؟ صرف یہی کہ دو مہینے تک کمیون نے اپنی شیطانی خوں آشامی کو رواداری اور انسانیت کے پردے میں چھپائے رکھا تاکہ نزع کے عالم میں اسے خوب کھل کھیلنے کا موقع مل جائے!

مزدوروں کے پیرس نے، جب خود کو سرفروشی کی آگ میں جھونکا تو شہر کی عمارتوں اور یادگاروں کو بھی شعلوں کی لپیٹ میں لے لیا۔ شہر کے حاکم جب پرولتاریوں کے زندہ جسم کے چیتھڑے اڑا رہے ہوں تو یہ امید کیوں رکھیں کہ ان کے مکان صحیح سلامت رہیں گے اور وہ شان سے ان میں واپس پہنچیں گے۔ وارسائی حکومت چیتھتی ہے کہ یہ ”آتش زنی“ تھی، اور چپکے سے اپنے حوالی موالی کے کان میں، دور افتادہ بستی تک یہ پھونک دیتی ہے کہ ”میرے



دشمن جہاں بھی ہاتھ آئیں، چھوڑو مت، آگ لگانے والے مجرم کا برتاؤ کرو،،۔ ساری دنیا کی بورژوازی اس پر تو بغلیں بجاتی ہے کہ لڑائی کے بعد شکست خوردہ لوگوں کا قتل عام ہوا، لیکن اس بات پر غصے سے تڑپ اٹھتی ہے کہ مکانوں کی اینٹیں اور پلاسٹر کی صورت ”بگڑ گئی“!

جب خود حکومتیں اپنے جنگی بیڑے کو سرکاری اجازت دیں کہ ”مار ڈالو، پھونک دو، اور مٹادو“، تو یہ آگ لگانے کی کھلی چھٹی ہے یا نہیں؟ جب انگریز فوجیوں نے واشنگٹن میں کیپٹول کی عمارت کو حماقت سے پھونک ڈالا اور چینی شہنشاہ کے گریبا محل کو آگ لگائی (۱۳۷) تو یہ ”آتش زنی“ تھی یا نہیں؟ جب پروشیائی فوج نے کسی جنگی مصلحت سے نہیں بلکہ صرف انتقام کے جوش میں مٹی کا تیل چھڑک کر شاتوداں جیسے شہر اور بہت سارے گاؤں جلا ڈالے تو یہ ”آتش زنی“ تھی یا نہیں؟ جب تیسرے چھ ہفتے تک برابر پیرس پر گولہ باری کرتا رہا اور یقین دلانا رہا کہ صرف ان مکانوں کو پھونکنا چاہتا ہے جن میں لوگ بھرے ہیں، تو یہ آتش زنی تھی یا نہیں؟ جنگ میں آگ بھی اتنا ہی جائز ہتھیار ہے جتنے اور ہتھیار۔ جن عمارتوں میں دشمن کا ڈیرا ہو انہیں آگ لگانے کے لئے گولوں کا نشانہ بناتے ہیں۔ اور جب ڈیفنس کرنے والوں کو یہ عمارتیں چھوڑنی پڑتی ہیں تو وہ خود ہی آگ لگا کر ہٹتے ہیں تاکہ حملہ آور ان میں قدم نہ جما سکے۔ لڑائی کے وقت جو عمارتیں مورچے کے سامنے پڑتی ہیں، چاہے کوئی بھی باقاعدہ فوج ہو، ان عمارتوں کی تقدیر میں جلنا لکھا ہے۔ یہ سب سہی، لیکن ایک ایسی لڑائی میں، جہاں بندے اپنے ظالم آقاؤں کے خلاف اٹھے تھے، تاریخ میں وہ تنہا جنگ جو برحق تھی، آگ لگانے کا یہ عمل سنگین جرم قرار دیا گیا! کمیون نے آگ سے، صحیح معنوں میں، اپنے بچاؤ کا کام لیا۔ اس نے بلڈنگوں کو آگ لگا کر ایک روک کھڑی کی تاکہ وارسائی کی فوجیں ان لمبی اور سیدھی سڑکوں میں نہ گھس پڑیں جو ہاؤسمان نے خاص طور سے توپخانے کی زد پر رکھنے کے لئے بنوائی تھیں۔ انہوں نے پیچھے ہٹتے وقت شعلوں سے ایک آڑ کھڑی کی، اسی طرح جیسے

وارسائی والوں نے آگے بڑھتے وقت گولوں کی آڑ بنائی اور ان گولوں سے کم از کم اتنی ہی بلڈنگیں برباد ہوئیں جتنی کمیون کی آگ سے۔ آج تک اس قضیے کا فیصلہ نہیں ہو سکا کہ کون سی عمارتیں بچاؤ کے کارن جل گئیں اور کون سی حملے کے سبب۔ بچاؤ کرنے والوں نے آگ لگانا تب شروع کیا جب وارسائی کی فوجیں قیدیوں کا بے تحاشا قتل عام شروع کر چکی تھیں۔ پھر کمیون تو بہت پہلے یہ کھلا نوٹس دے چکا تھا کہ اگر انتہائی مجبور کیا گیا تو وہ خود کو پیرس کے راکھ کے ڈھیر میں دفن کر لیں گے اور پیرس کو دوسرا ماسکو بنا ڈالیں گے (۱۳۸)۔ یہ وہی نوٹس تھا جو ڈیفنس کی حکومت بھی پہلے دے چکی تھی، لیکن صرف اپنی غداری کا پردہ رکھنے کے لئے۔ اس غرض سے جنرل تروشیونے مٹی کے تیل کا ذخیرہ بھی کر رکھا تھا۔ کمیون کو خوب معلوم تھا کہ اس کے دشمنوں کی نظر میں پیرس والوں کی زندگی کی کوئی وقعت نہیں، البتہ پیرس میں اپنے مکانات بہت عزیز ہیں۔ اور تیسرے اپنے طور پر اعلان کر چکا تھا کہ انتقام لینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑے گا۔ جب ایک طرف سے اس کی فوج لڑائی پر کمر بستہ ہو چکی اور دوسری طرف سے پروشیا والوں نے باہر نکلنے کے سب راستے بند کر دئے تو تیسرے نے پکار کر کہا: ”میں رحم نہیں کرنے والا! حساب بے باق ہونا چاہئے اور سزا سخت!“، اگر پیرس کے مزدوروں نے وحشیانہ حرکت کی بھی تو یہ اپنے بچاؤ کی آس چھوڑ دینے والے کی وحشیانہ حرکت تھی، فاتحانہ شان سے بڑھنے والے کی وحشیانہ حرکت نہیں، جیسی کہ ان عیسائیوں سے سرزد ہوئی جنہوں نے قدیم بت پرست دنیا کے آرٹ کے واقعی بے بہا خزانے تباہ کر دئے۔ شاید مورخ اس وحشیانہ تباہ کاری کو بھی جائز قرار دے کیوں کہ نئے اٹھتے ہوئے سماج اور پرانے ٹوٹتے ہوئے سماج کے درمیان جو زبردست ٹکر ہوئی، اس میں یہ ایک ناگزیر نقصان اور نسبتاً چھوٹی سی بات ہے۔ پیرس کے مزدوروں نے جو بھی کیا ہو وہ ہاؤسمان کی اس وحشیانہ حرکت کے مقابلے میں کم ہے کہ تاریخی پیرس کو ڈھا کر اس نے سیلانیوں کے پیرس کے لئے جگہ بنائی تھی۔



کمیون نے صرف ضمانت میں پکڑے ہوئے ۶۴ آدمیوں کو گولی سے اڑادیا جن میں پیرس کا اسقف اعظم تھا۔ بورژوازی اور اس کی فوج نے جون ۱۸۴۸ء میں وہ رواج پھر سے چلا دیا جو ایک زمانہ پہلے جنگی کارروائی سے دور کیا جا چکا تھا، یعنی بے بس قیدیوں کو گولی سے اڑانا۔ یہ ظالمانہ رواج تبھی سے کم و بیش سختی کے ساتھ برتا جا رہا ہے، اور یورپ اور ہندستان میں عوام کی شورشوں کو دبانے والے اسے برت رہے ہیں، اور اس طرح دنیا کو دکھا رہے ہیں کہ ”تہذیب کی ترقی“، میں یہ بھی واقعی شامل ہے! ادھر پروشیوالوں نے فرانس میں ضمانت کے آدمی (یرغمال) پکڑنے کا رواج پھر جاری کر دیا۔ یعنی بے قصور لوگوں کو پکڑ لینا جو اپنی زندگی سے دوسروں کے کٹے کا بھگتان بھریں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، تیسر نے لڑائی کے شروع سے ہی یہ انسانی وطیرہ اختیار کیا کہ کمیون کے جو آدمی قید ہوں انہیں گولی مار دی جائے، تو کمیون کو بھی ان قیدیوں کی جان بچانے کے لئے مجبوراً پروشیائی رواج اپنانا پڑا کہ یرغمال میں آدمی پکڑ لئے جائیں۔ تب بھی وارسائی کی حکومت باز نہ آئی اور بار بار قیدیوں کو گولی مار کر اس نے خود ہی اپنے آدمیوں کو موت کے منہ میں ڈال دیا۔ ان لوگوں کی زندگی پر کہاں تک ترس کھایا جاتا اس خونی ہولی کے بعد جو میکس وین پریٹورین فوجیوں (۱۳۹) نے پیرس میں قدم رکھتے ہی منائی۔ بورژوا حکومت کی بے لگام درندگی سے بچنے کا یہ آخری حیلہ، کہ یرغمال میں آدمی پکڑے جائیں۔ کیا یہ بھی محض مذاق ہی رہنے دیا جاتا؟ اسقف اعظم دربوئی کا اصلی قاتل کون ہے؟ تیسر۔ کمیون نے تو اپنی طرف سے کئی بار پیش کش کی کہ اسقف اعظم اور دوسرے بڑے پادریوں کو صرف ایک شخص بلانکی کے تبادلے میں لے لیا جائے جو تیسر کے ہاتھوں قید تھا۔ لیکن تیسر سختی سے تبادلے کو رد کرتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر بلانکی کو چھوڑا تو کمیون کو دماغ بخشا، اور یہ کہ بڑا پادری زیادہ کارآمد رہے گا اگر مردہ حالت میں ملے۔ اس موقع پر تیسر نے جنرل کوئے نیاک کی نقل کی۔ جون ۱۸۴۸ء میں کوئے نیاک اور اس کے ”ضابطہ پسندوں“ نے کیا ہائے واویلا مچائی تھی اور شورش پسندوں پر الزام لگائے تھے

کہ انہوں نے اسقف اعظم آفرے کو قتل کر ڈالا، حالاں کہ انہیں خوب معلوم تھا کہ قاتل خود ضابطہ پارٹی کے سپاہی تھے۔ موسیو ژاکمے، جو بڑے پادری کا نائب اعظم تھا اور چشم دید گواہ تھا، اس نے واردات کے فوراً بعد اس واقعے کی گواہی پیش کر دی۔

ضابطہ پارٹی نے خود جتنی بھی خون ریزی کی ہو، لیکن اپنے مقتولوں پر الزامات کا اس قدر طوبار باندھا ہے کہ اسے دیکھ کر صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ آج کل کے بورژوا اپنے آپ کو پہلے کے جاگیرداروں کا جائز وارث سمجھتے ہیں جن کا خیال تھا کہ عام آدمی پر ہر قسم کا ہتھیار آزمانا ان کا حق ہے، لیکن عام آدمی کے ہاتھ میں کسی قسم کا ہتھیار آنا جرم ہے۔

حکمران طبقے نے انقلاب کے خلاف جو سازش رچی تھی کہ اسے خانہ جنگی کی مدد سے، اور غیرملکی فاتحوں کی سرپرستی میں کچل ڈالیں، وہ سازش جو ۴ ستمبر سے برابر اس وقت تک چلتی رہی جب میکس وین کے خاص پریٹورین دستے سین کلو کے پھانک میں داخل ہوئے، وہ سازش پیرس میں خونی ہنگامے پر تمام ہوئی۔ بسمارک اجڑے ہوئے پیرس کے منظر سے لطف اندوز ہو رہا ہے اور غالباً اسے پیش خیمہ سمجھتا ہے بڑے بڑے شہروں کی عام تباہی و بربادی کا، جس کے وہ ان دنوں خواب دیکھا کرتا تھا جب صرف معمولی سا تعلقہ دار تھا اور ۱۸۴۹ء کے پروشیائی Chambre introuvable (انوکھے دربار) کا ممبر چنا گیا تھا (۱۴۰)۔ وہ پیرس کے پرولتاریوں کی لاشیں دیکھ کر دل ٹھنڈا کرتا ہے۔ اسے دونوں لطف حاصل ہوئے ہیں۔ صرف انقلاب کی بیخ کنی نہیں بلکہ فرانس کی بربادی بھی، جو واقعی اب بے سر ہو کر رہ گیا اور وہ بھی خود فرانسیسی حکومت کے ہاتھوں۔ کاسیاب سیاست دانوں کی طرح بسمارک جیسے بے تہہ آدمی کو اس حیرت انگیز تاریخی واقعے کا صرف ظاہری پہلو نظر آتا ہے۔ کیا آج تک تاریخ کی نظر سے ایسا کوئی فاتح گزرا ہے جو اپنی فتح کا سہرا بندھوائے صرف سیاسی پولیس والے کے رول میں نہیں بلکہ مفتوح حکومت کے ہاتھ تلے کرائے کا جلا د بن کر؟ پروشیا اور کمیون میں کوئی جنگ نہیں تھی۔ بلکہ اس کے برخلاف کمیون نے صلح کی مجوزہ شرطیں



مان لی تھیں اور پروشیا نے اپنی غیرجانبداری کا اعلان کر دیا تھا۔ مطلب یہ کہ پروشیا اس جنگ میں فریق نہیں تھا۔ اس نے ایک گھٹیا جلاد کی سی حرکت کی کہ خود تو کوئی خطرہ مول نہیں لیا اور برتاؤ کرائے کے جلاد کا سا کیا کیوں کہ پہلے سے یہ شرط کر لی کہ پیرس ٹوٹے گا تو پچاس کروڑ کی رقم وصول ہوگی، یہ جلادی کی خونی قیمت ٹھہری۔ اسی میں جنگ کی اصلی فطرت کھل گئی کہ یہ قہر خداوندی نازل ہوا تھا بے دین اور بد چلن فرانس کو خدا ترس اور نہایت نیک چلن جرمنی کے ہاتھوں سزا دلوانے کے لئے۔ یہ انٹرنیشنل قانون کی خلاف ورزی، جس کی کوئی مثال نہیں ملتی، اور جسے پرانی دنیا کا قانون داں بھی قانون کی خلاف ورزی ہی کہتا، بجائے اس کے کہ یورپ کی ”سہدب“، قوموں کی زبانی یہ اعلان کراتی کہ مجرمانہ پروشیائی حکومت، جو کسی زمانے میں سینٹ پیٹرسبرگ کی وزارت کے ہاتھوں میں کھیلتی رہی، اب قانون کے جد سے باہر کی جاتی ہے، الٹا ان قوموں کو یہ مسئلہ زیر بحث لانے کا بہانہ دے گئی کہ وہ چند مظلوم جو پیرس کے ڈبل گھیرے سے جان بچا کر نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں انھیں وارسائی جلادوں کے سپرد کیوں نہ کر دیا جائے ! نئے دور کی سب سے خوفناک جنگ کے بعد غالب اور مغلوب دونوں فوجیں ہاتھ ملاتی ہیں صرف اس لئے کہ مل کر پرولتاریوں کا صفایا کر دیں۔ اس انہونے واقعے سے، جیسا کہ بسمارک نے سوچا، یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نیا سماج، جو اپنی راہ بنا رہا تھا، آخری شکست کھا کر رہ گیا، نہیں اس سے تو پرانے بورژوا سماج کا شیرازہ پوری طرح بکھرنے کی حقیقت کھلتی ہے۔ پرانا سماج جو اپنا سب سے اونچا کارنامہ انجام دینے قابل تھا، وہ ہے قومی جنگ اور قومی جنگ اب حکومت کی صرف ایسی چال ثابت ہو چکی ہے جس کی غرض آخر میں یہ نکلتی ہے کہ طبقاتی کشمکش کو زیادہ سے زیادہ عرصے کے لئے ٹال دیا جائے۔ جوں ہی طبقاتی کشمکش پھٹ پڑتی ہے اور اس سے خانہ جنگی کے شعلے اٹھنے لگتے ہیں، حکومت کی چال بھسم ہو کر رہ جاتی ہے۔ طبقاتی غلبے کو اب قومی وردی کا بھیس بدل کر چھپایا نہیں جاسکتا۔ پرولتاریہ کے خلاف قومی حکومتیں سب ایک ہوتی ہیں۔

۱۸۷۱ء کے اس یادگار دن (Whit-Sunday) کے بعد فرانس کے مزدوروں اور ان کی محنت کی پیداوار ہتھیا لینے والوں کے درمیان نہ تو امن ہو سکتا ہے، نہ صلح ممکن ہے۔ کرائے کے فوجیوں کا فولادی ہاتھ کچھ عرصے کے لئے شاید دونوں طبقوں کو دبا لینے میں کامیاب رہے، لیکن ان کی کشمکش پھر گرم ہو کر رہے گی، اس کی شدت بڑھتی جائے گی اور اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ آخر کار دونوں میں سے کون فتحیاب ہوگا : تھوڑے سے دولت ہتھیالینے والے یا وہ بے حساب اکثریت رکھنے والے جو محنت کرتے ہیں۔ فرانسیسی مزدور طبقہ ایک ہراول دستہ ہے آج کے تمام پرولتاریہ کا۔

یورپ کی حکومتیں پیرس کے سامنے یہ جتا رہی ہیں کہ طبقاتی حکمرانی کا ایک انٹرنیشنل کیرکٹر ہے اور خود دنیا کے سامنے ہائے واویلا مچائے ہوئے ہیں کہ انٹرنیشنل ورکنگ مینز ایسوسی ایشن ہی سارے فتنہ فساد کی جڑ ہے۔ یعنی محنت کی وہ بین الاقوامی انجمن جو سرمائے کی دنیا بھر میں پھیلی ہوئی سازش کے خلاف بنی ہے۔ تیسرے اس تنظیم پر یہ الزام عائد کرتا ہے کہ وہ لیبر کے سر پر سوار ہے، اور لیبر کے سر کا بوجھ اتارنے کی دعویدار ہے۔ پی کار نے حکم جاری کیا ہے کہ انٹرنیشنل کے فرانسیسی ممبروں اور دوسرے ملکوں کے ممبروں میں کوئی تعلق رہنے نہ پائے۔ کاؤنٹ ژوبر نے، جو ۱۸۳۵ء سے تیسرے کا بے زبان دم چھلا بنا ہوا ہے، اعلان کیا کہ تمام متمدن ملکوں میں ہر ایک حکومت کا پہلا فریضہ یہ ہے کہ انٹرنیشنل کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکے۔ ”چودھریوں کی چوپال“، الگ اس پر چیخ پکار کر رہی ہے اور یورپ کے اخبار اس کے سر میں سر ملا رہے ہیں۔ صرف ایک ایسا قابل قدر فرانسیسی ادیب ہے \*، جسے ہماری انجمن سے دور کا بھی واسطہ نہیں، تاہم وہ اس کے بارے میں لکھتا ہے :

”نیشنل گارڈ کی مرکزی کمیٹی کے ممبر اور کمیون کے ممبروں میں بیشتر لوگ سب سے باعمل، صاف ذہن اور

\* غالباً یہ روبینے تھا۔ (ایڈیٹر)



متحرک دماغ تھے انٹرنیشنل ورکنگ مینز ایسوسی ایشن کے ... یہ لوگ بے شک ایماندار ، کھرے ، عقلمند ، ایثار پیشہ سرفروش ، سچے اور اچھے معنوں میں عقیدے کے پکے لوگ تھے۔“

بورژوا ذہن ، جسے پولیس نے بھر رکھا ہے ، انٹرنیشنل ورکنگ مینز ایسوسی ایشن کو اس کے سوا اور کیا سمجھے گا کہ یہ کوئی خفیہ سازشیوں کی جماعت ہے جس کی مرکزی لیڈر شپ وقتاً فوقتاً مختلف ملکوں میں بغاوت کے شعلے بھڑکایا کرتی ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ ہماری یہ انجمن ایک انٹرنیشنل انجمن ہے جو متمدن دنیا کے مختلف ملکوں کے سب سے ترقی یافتہ مزدوروں کا رشتہ جوڑتی ہے۔ چاہے کہیں ، اور کیسے ہی حالات میں طبقاتی جدوجہد کیوں نہ اٹھے ، اور وہ چاہے کوئی بھی شکل اختیار کرے ، قدرتی بات ہے کہ ہماری انجمن کے لوگ اس میں سب سے آگے کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ زمین جس پر ہماری یہ انجمن جڑ پکڑتی اور اگتی ہے وہ خود آج کا سماج ہے۔ چاہے کتنا ہی لہو بہا دیا جائے ، اس انجمن کو جڑ بنیاد سے نکال پھینکنا ممکن نہیں۔ اس کو جڑ سے نکال پھینکنا ہے تو حکومتوں کو چاہئے کہ محنت پر سرمائے کے جابرانہ اقتدار کا جڑ بنیاد سے خاتمہ کر دیں ، یعنی خود اپنے مفت خورے وجود کی بنیاد ہی نکال کر پھینک دیں۔

مزدوروں کا پیرس اپنے کمیون سمیت نئے سماج کے شاندار نقیب کی حیثیت سے ہمیشہ سر بلند رہے گا۔ اس کے شہیدوں نے مزدور طبقے کے بڑے دل میں ایسی جگہ بنائی ہے کہ اسے رہیں گے۔ اور جلا دوں کو تاریخ نے اس شرمناک ستون میں ٹھونکنے کے لئے تیار کر دیا ہے جہاں سے نکالنے میں اس کے پادریوں کی ساری دعائیں بھی کامیاب نہیں ہوسکتیں۔

۲۵۶ ، ہائی ہولبورن ، لندن ،

ویسٹرن سنٹرل ، ۳۰ مئی ۱۸۷۱ء

## نوٹس

### اول

”قیدیوں کا دستہ ایوے نیو اوریک میں پہنچ کر ٹھہر گیا۔ چار یا پانچ کی قطار میں سڑک کی طرف منہ کر کے فٹ پاتھ پر کھڑے ہو گئے۔ جنرل مارکوئی دی گیلی فے اور اس کا اسٹاف گھوڑوں سے اتر پڑا اور لائن کے بائیں طرف سے معائنہ شروع کیا۔ جنرل آہستہ آہستہ بڑھتا اور صفوں پر نظر ڈالتا جاتا تھا۔ چند قدم چل کر ٹھہر جاتا، سامنے کے آدمی کا کندھا تھپکتا یا کسی کو پیچھے والی قطار سے باہر نکلنے کا اشارہ کرتا۔ اکثر ایسا ہوا کہ کہنے سننے کی نوبت نہیں آئی اور آدمی کو باہر نکال کر سڑک کے پیچوں پیچ تک مارچ کرایا گیا۔ اور وہاں زرا دیر میں ایک چھوٹا سا دستہ اور بن گیا ... ظاہر بات تھی کہ غلطی کی کافی گنجائش رہ گئی۔ ایک سوار افسر نے جنرل گیلی فے کو ایک مرد اور ایک عورت کی جانب کسی خاص جرم کے سلسلے میں متوجہ کیا۔ عورت صفوں سے باہر لپکی اور دوزانو ہو کر گر گئی ، دونوں بازو پھیلا دئے اور التجا کے انداز میں اپنی بے گناہی کا رونا رونے لگی۔ جنرل زرا دیر تھما اور روکھے پن سے ، کسی تاثر کا اظہار کئے بغیر بولا ”مادام ، میں پیرس کے ہر ایک تھیٹر میں جا چکا ہوں ، مجھ پر آپ کی ایکٹنگ کا کوئی اثر نہیں ہونے والا“ ... اس روز کسی شخص کا اپنے ساتھ والوں سے زرا لمبا ، زرا میلا ، زرا صاف نظر آنا ، زرا عمر رسیدہ ، زرا بد صورت نظر آنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ایک شخص خاص طور سے میری آنکھوں میں چبھ کر رہ گیا کہ ٹوٹی ہوئی ناک کی وجہ سے اس کو دنیائے فانی کی مصیبتوں سے جلدی چھٹکارا مل گیا ...



غرض اس طرح سو سے اوپر آدمی چھانٹ لئے گئے اور ایک فائرنگ دستے کو ان کے ساتھ کر دیا گیا۔ قیدیوں کا دستہ انہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ چند منٹ گزرے ہوں گے کہ پیچھے سے گولیوں کی بارڑ چلنے کی آواز سنائی دی اور کوئی پندرہ منٹ چلتی رہی۔ یہ تھی سزائے موت ان بدنصیبوں کی، جنہیں کھڑے کھڑے مجرم قرار دیا گیا تھا۔،،  
(اخبار (۱۴۱) «Daily News» کے نمائندہ مقیم پیرس سے - ۸ جون ۱۸۷۱ء)

یہی تھا وہ گیلی فے ”اپنی اس بیوی کا رکھیل، جو دوسری شہنشاہی کی رنگ رلیوں میں بے حیائی کی حرکتوں کی وجہ سے بہت نام کما چکی تھی،، جسے جنگ کے زمانے میں لوگ فرانس کا ”افسر پستول“ کہا کرتے تھے۔

”«Temps» (۱۴۲) جو ایک محتاط رسالہ ہے اور سسنی خیزی میں مبتلا نہیں ہوتا، ان لوگوں کی خوفناک داستان سناتا ہے جو گولی سے ادھ موئے چھوڑے گئے اور جان نکالنے سے پہلے دفن کر دئے گئے۔ سینڑاک لاشوں کے گرد جو چوک ہے اس میں بہت سے لوگوں کو زمین میں دبایا، کچھ اچھی طرح نہیں دبے۔ دن کے وقت سڑکوں کی چہل پہل میں کسی کی توجہ ادھر نہ گئی۔ لیکن جب رات کا سناٹا ہوا تو آس پاس کے مکانوں کے باشندے کراہیں سن کر چونک اٹھے۔ اور صبح کے وقت زمین سے ایک ہاتھ باہر نکلا دیکھا جس کی مٹھی بھنچی ہوئی تھی۔ نتیجہ یہ کہ اس جگہ سے لاشیں نکالنے کا حکم ہوا۔ مجھے زرا بھی شبہ نہیں کہ بہت سے زخمی زندہ ہی مٹی میں دبائے گئے ہیں۔ ایک واقعے کا تو مجھے قطعی علم ہے۔ جب بروئیل کو اس کی داشتہ سمیت ۲۴ تاریخ کو ویندوم میدان کے ایک مکان کے احاطے میں گولی ماری گئی تو ۲۷ کی

سہ پہر تک لاشیں وہیں پڑی رہیں۔ آخر ایک دفنانے والی پارٹی لاشیں ٹھکانے لگانے پہنچی تو دیکھا کہ عورت میں جان باقی ہے۔ اسے مرہم پٹی کے لئے اٹھالے گئے۔ چار گولیاں کھانے کے بعد بھی یہ عورت زندہ سلامت ہے۔،،  
(«Evening Standard» (۱۴۳) کا نمائندہ مقیم پیرس سے - ۸ جون)

### دوم

۱۳ جون کو لندن اخبار «Times» میں یہ خط (۱۴۴) شائع ہوا :

اخبار «Times» کے ایڈیٹر کے نام

جناب والا!

۶ جون ۱۸۷۱ء کو موسیو ژیل فاور نے یورپ کی تمام طاقتوں کو ایک گشتی چٹھی بھیجی ہے جس میں تقاضا کیا گیا ہے کہ انٹرنیشنل ورکنگ مینز ایسوسی ایشن کو گھیر کر ختم کر دیا جائے۔ اس دستاویز کی حقیقت ظاہر کرنے کے لئے صرف چند اشارے کافی ہوں گے۔ ہمارے دستور العمل کی تمہید میں صاف طور سے لکھا ہے کہ انٹرنیشنل کی بنیاد ”۲۸ ستمبر ۱۸۶۴ء کو لندن کے لانگ اٹیکر، سینٹ مارٹن ہال کے ایک جلسہ عام میں،، رکھی گئی تھی۔ اپنی ذاتی مصلحت سے ژیل فاور نے ایسوسی ایشن کی بنیاد ۱۸۶۲ء میں بتائی ہے۔ ہمارے اصولوں کی تشریح کرنے کے لئے اس نے انٹرنیشنل کے ”۲۵ مارچ ۱۸۶۹ء کے ایک ہینڈبل،، سے حوالہ دینا ظاہر کیا ہے۔ اور حقیقت میں حوالہ کہاں سے دیا؟ کسی ایسی سوسائٹی کے کاغذ سے جو انٹرنیشنل نہیں ہے۔ اسی قسم کی ہاتھ کی صفائی وہ پہلے بھی دکھا چکا ہے، جب وہ نیا نیا وکیل بنا تھا اور پیرس کے اخبار «National» پر کابے نے ہتک عزت کا جو دعوا کیا اس میں وکیل صفائی تھا۔ اس نے عدالت میں زور دے کر کہا کہ کابے کے ایک پمفلٹ سے



اقتباسات پڑھ کر سنائے گا لیکن خود اپنے گڑھے ہوئے جملے پڑھ کر سناتا رہا۔ عدالت کا اجلاس ابھی جاری تھا کہ فریب کھل گیا اور اگر کابے ہی معاملہ نہ ٹال جاتا تو ٹیول فاوور کو سزا کے طور پر پیرس کی بار ایسوسی ایشن سے نکال دیا جاتا۔ جن دستاویزوں کو انٹرنیشنل کی دستاویزیں بنا کر ٹیول فاوور حوالے کے لئے استعمال کر رہا ہے، ان میں سے ایک کا بھی واسطہ انٹرنیشنل سے نہیں ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے:

”یہ الائنس (Alliance) اپنے لامذہب ہونے کا اعلان کرتی ہے، جیسا کہ جنرل کونسل نے کہہ دیا ہے جو ۱۸۶۹ء جولائی میں، لندن میں بنی تھی۔“

جنرل کونسل نے اس قسم کی کوئی تحریر نہیں نکالی۔ اس کے برخلاف جنرل کونسل کی ایک دستاویز شائع ہوئی تھی جس نے ”الائنس“، L'Alliance de la Démocratie Socialiste (۱۸۵۰) — کے اس دستور العمل\* کو منسوخ کر دیا تھا جو جنیوا میں بنا اور اب ٹیول فاوور اسی کا حوالہ دے رہا ہے۔

اس پورے سرکر میں، جس کا ایک حصہ گویا شہنشاہی کے خلاف بھی جاتا ہے، ٹیول فاوور صرف انٹرنیشنل پر انہی الزاموں کو دھرا رہا ہے جو بوناپارٹ کے سرکاری وکیلوں کی پولیس نے اپنی عقل سے گڑھے تھے اور خود اسی شہنشاہی کی عدالتوں کے سامنے ان کی قلعی کھولی جا چکی ہے۔

سب جانتے ہیں کہ (پچھلے سال جولائی اور ستمبر کے) اپنے دونوں خطوں میں، جو اس جنگ کے بارے میں بھیجے گئے\*، انٹرنیشنل کی جنرل کونسل نے پروشیا کے ان منصوبوں کو بے نقاب کر دیا تھا

\* کارل مارکس ”انٹرنیشنل ورکنگمینز ایسوسی ایشن اور سوشل ڈیموکریسی کا الائنس“، - (ایڈیٹر)  
\* ملاحظہ ہو اسی جلد کے صفحات ۱۳۸-۱۴۱، ۱۵۹-۱۴۹ (ایڈیٹر)

جو فرانس کو مقبوضہ ملک بنانے کے لئے کئے جا رہے تھے۔ ٹیول فاوور کے پرائیویٹ سکرپٹری مسٹر ریتلٹھیر نے بعد میں جنرل کونسل کے بعض ممبروں سے بات کی، جو بے فائدہ رہی اور یہ چاہا کہ بسمارک کے خلاف جنرل کونسل کی طرف سے جلسہ جلوس ہو جائے جس میں قومی ڈیفنس کی حکومت کی تائید کی جائے۔ ان سے خاص طور پر درخواست کی گئی تھی کہ اس میں ریپبلک کا نام نہ آنے پائے۔ ٹیول فاوور جس وقت لندن پہنچنے والا تھا، اسی موقع پر جلسہ جلوس کی تیاری بھی ہوئی، اور اس میں شبہ نہیں کہ ارادہ نیک تھا، حالانکہ جنرل کونسل یہ نہیں چاہتی تھی۔ کونسل نے اپنے ۹ ستمبر کے خط میں قطعی جتا دیا تھا کہ پیرس کے مزدور ٹیول فاوور اور اس کے ہمنواؤں سے ہوشیار رہیں۔

کیا کہتا ہے ٹیول فاوور، اگر انٹرنیشنل کی جنرل کونسل جواب میں یورپ کی تمام وزارتوں کو ٹیول فاوور کے بارے میں بھی ایک گشتی چٹھی روانہ کرے اور ان دستاویزوں کی طرف خاص توجہ دلائے جو مرحوم میلیئر نے پیرس میں شائع کی تھیں۔

میں ہوں آپ کا خادم

جان ہیلز،

انٹرنیشنل ورکنگمینز ایسوسی ایشن  
کی جنرل کونسل کا سکرپٹری

۲۵۶، ہائی ہولبورن،

لندن، ویسٹرن سنٹرل،

۱۲ جون۔

لندن کے رسالے »Spectator« (۱۴۶) نے شریف مخبر بن کر ایک مضمون شائع کیا ہے (۲۴ جون)۔ ”انٹرنیشنل ایسوسی ایشن اور اس کے مقاصد“، مضمون میں اسی قسم کی اور ہوشیاریوں کے علاوہ الائنس کی مذکورہ دستاویز کا حوالہ دے کر اسے انٹرنیشنل کی تحریر بتایا ہے



اور یہ کام ٹیول فاور سے بھی بڑھ کر زیادہ گہرائی سے انجام دیا ہے۔ حالانکہ «Times» اخبار میں اس کی مذکورہ بالا تردید چھپے ہوئے گیارہ دن گزر چکے تھے۔ ہمیں اس پر تعجب نہیں ہوا۔ فریڈرک اعظم کہا کرتا تھا کہ یسوعیوں کے تمام فرقوں میں پروٹسٹنٹ سب سے برے ہیں۔

مارکس نے اپریل مئی

۱۸۷۱ء میں لکھا۔

۱۸۷۱ء کے تیسرے انگریزی  
ایڈیشن کے مطابق لفظ بلفظ  
ترجمہ جس کا ۱۸۷۱ء اور  
۱۸۹۱ء کے جرمن ایڈیشنوں  
سے مقابلہ کیا گیا۔

جون ۱۸۷۱ء کے وسط میں  
لندن سے پمفلٹ کی شکل  
میں شائع ہوا۔ امریکہ  
اور یورپ کے کئی ملکوں  
میں ۷۲-۱۸۷۱ء میں شائع  
کیا گیا۔

## فریڈرک اینگلس

## مزدور طبقے کے سیاسی عمل کے بارے میں

انٹرنیشنل ورکنگ مینز ایسوسی ایشن  
کی لندن کانفرنس میں مصنف کی تقریر  
۲۱ ستمبر ۱۸۷۱ء (۱۴۷)

سیاست سے بالکل ہی کنارہ کش رہنا ممکن نہیں؛ جو اخبار  
سیاست سے الگ رہنے کے حامی ہیں، وہ خود سیاست میں لگے رہتے  
ہیں۔ سوال صرف اتنا ہے کہ کیسے اور کونسی سیاست اختیار  
کی جائے۔ ہمارے لئے تو ویسے بھی الگ تھلگ رہنا ممکن نہیں۔  
مزدور پارٹی ایک سیاسی پارٹی کی حیثیت سے اکثر ملکوں میں موجود  
ہے۔ سیاست سے الگ رہنے کا پرچار کر کے ہم اسے اپنے ہاتھوں  
برباد کرنے سے رہے۔ آج کی زندگی کا تجربہ، موجودہ حکومتوں کا  
مزدوروں پر ظلم و ستم، جو سیاسی مقاصد میں بھی ویسا ہی ہے جیسا  
سماجی مقاصدوں میں، مزدور خود چاہیں یا نہ چاہیں، انہیں سیاست  
میں حصہ لینے پر مجبور کرتا ہے۔ انہیں سیاست سے الگ تھلگ رہنے  
کا مشورہ دینا یہی ہے کہ بورژوا سیاست کے دامن میں ڈال دیا جائے۔  
سیاست سے کنارہ کش رہنا بالکل ناممکن ہے، خاص کر پیرس کمیون  
کے بعد، جس نے پرولتاریوں کے سیاسی عمل کو ایجنڈے پر رکھ دیا ہے۔  
ہم طبقے مٹا دینا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کو پورا کرنے کی سبیل  
کیا ہے؟ صرف ایک سبیل ہے۔ پرولتاریہ کا سیاسی غلبہ۔ اور جب  
یہ بات خوب روشن ہو گئی تو ہم سے کہا جاتا ہے کہ سیاست میں



دخل مت دو! جتنے لوگ سیاست سے الگ رہنے کی تلقین کر رہے ہیں وہ خود کو انقلابی کیا، انقلابیوں سے بھی بڑھ کر سمجھتے ہیں۔ لیکن انقلاب تو سیاست کا سب سے اونچا کرم ہے؛ اور جسے انقلاب کی آرزو ہے، اسے انقلاب کے ذریعے کو، ان سیاسی کارروائیوں کو بھی تسلیم کرنا چاہئے، جو انقلاب کے لئے راہ ہموار کرتی ہیں، جو مزدوروں کو انقلاب کی ٹریننگ دیتی ہیں جس کے بغیر مزدور ایسے رہ جاتے ہیں کہ لڑائی لڑنے کے دوسرے دن ٹیول فاور یا پیات قسم کے لوگ انہیں جتنا چاہیں بے وقوف بنالیں۔ وہ سیاست جو اختیار کرنے قابل ہے، مزدوروں کی سیاست ہے۔ مزدوروں کی پارٹی کو ایک نہ ایک بورژوا پارٹی کی دم بن کر نہیں رہنا چاہئے۔ اسے تو اپنا وجود آزاد رکھنا چاہئے، جس کی خاص اپنی منزل ہو، خاص اپنی سیاست ہو۔ سیاسی آزادیاں، جلسے کرنے، انجمن بنانے کا حق، پریس کی آزادی — یہ ہیں ہمارے ہتھیار۔ اگر کوئی ہم سے یہ ہتھیار چھین لینا چاہے تو کیا ہم ہاتھ دھر کر بیٹھ جائیں؟ سیاست کے میدان سے ہٹ جائیں؟ کہتے ہیں کہ کسی قسم کی بھی سیاسی کارروائی کا مطلب ہے موجودہ بندوبست کو، حکومت وقت کو مان لینا۔ اب اگر موجودہ بندوبست ہمیں یہ ذریعے مہیا کرتا ہے کہ خود اسی کے خلاف اٹھ سکیں، تو ان ذریعوں سے کام لینے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہم نے موجودہ بندوبست کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔

اصل مسودے کے مطابق شائع کیا گیا۔

رسالہ ”کمیونسٹ انٹرنیشنل“ کے ۲۹ شمارے، ۱۹۳۴ء میں پہلی بار مکمل شائع ہوا۔

کارل مارکس

## گوتھا پروگرام پر تنقیدی نظر<sup>۱۴۸</sup>

### فریڈرک اینگلز کا دیباچہ<sup>۱۴۹</sup>

یہ قلمی تحریر جو اشاعت کے لئے جا رہی ہے، جس میں براکے (Bracke) کے نام خط اور پروگرام کے خاکے پر تنقیدی نظر شامل ہے، ۱۸۷۵ء میں گوتھا اتحاد کانگریس (۱۵۰) سے زرا پہلے براکے کو بھیجی گئی تھی تاکہ وہ اسے گیب، آئر، بیبل اور لیکنیخت کو دکھا لینے کے بعد مارکس کو واپس کر دے۔ اب چونکہ شہر ہالے میں ہونے والی پارٹی کانگریس نے (۱۵۱) گوتھا پروگرام کو پارٹی کے ایجنڈے میں بحث کے لئے شامل کیا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس اہم تحریر کو، جو غالباً بحث سے متعلقہ سب سے اہم دستاویز ہے، اگر اشاعت سے روکتا ہوں تو اسے دبا بیٹھنے کا قصور وار ٹھہروں گا۔ لیکن اس تحریر کی ایک اور، بہت دور رس اہمیت بھی ہے۔ مارکس نے یہاں پہلی بار صاف صاف دوٹوک طریقے سے اس لائن کے ساتھ اپنا برتاؤ ظاہر کیا ہے جو لائن لاسال نے ایجیٹیشن میں شریک ہوتے وقت شروع سے اختیار کی تھی، لاسال کے معاشی اصولوں اور اس کی عملی ترکیبوں، دونوں پر مارکس نے کھل کر کہہ دیا ہے۔ آج جب کہ اسے لکھے ہوئے پندرہ برس گزر چکے ہیں، بیان کا وہ بے لاگ کٹیلین جس سے پروگرام کے خاکے کا بخیرہ ادھیڑا گیا ہے، جس بے دردی سے اس پروگرام کا خلاصہ دیا گیا ہے، اور اس کی کوتاہیاں سامنے رکھ دی گئی ہیں، اس سے کسی کی دلازاری نہیں ہونے والی۔



وہ لوگ جو لاسال کے سچے معتقد تھے، باہر کے ملکوں میں کہیں کہیں بکھرے پڑے ہیں؛ رہا گوٹھا پروگرام، سو خود اس کے جنم داتاؤں نے ہالے میں ہی تسلی بخش نہ ہونے کی بنا پر رد کر دیا تھا۔

پھر بھی میں نے یہ احتیاط برتی کہ جہاں کہیں ذاتی قسم کے تیز طرار جملوں اور حملوں کو عبارت سے خارج کرنے میں کوئی ہرج نہ دیکھا، انہیں خارج کر دیا اور خالی نقطے چھوڑ دئے۔ اگر یہ قلمی نسخہ مارکس نے آج شائع کیا ہوتا، تو وہ بھی یہی کرتا۔ بیان کی گرسی بعض مقامات پر صرف دو وجہوں سے آگئی تھی۔ اول تو یہ کہ مارکس اور میں، ہم دونوں کا اور تحریکوں کے بہ نسبت، جرمن تحریک سے زیادہ گہرا رشتہ رہا ہے اس لئے جب ہم نے پروگرام کے اس خاکے میں تحریک کا قدم پیچھے ہٹنا دیکھا تو ہم بری طرح برہم ہو گئے۔ دوسرے یہ کہ ہیگ میں انٹرنیشنل کی کانگریس (۱۰۲) ہوئے ابھی مشکل سے دو سال گزرے تھے اور باکونین اور اس کے انارکسٹ حامیوں سے بہت سخت رسہ کشی چل رہی تھی، یہ لوگ ہمارے سر الزام تھوپ رہے تھے گویا جرمن مزدور تحریک پر جو کچھ بیتی اس کے جوابدہ ہم ہیں، تو اندیشہ تھا کہ گوٹھا پروگرام کے خاکے پر بھی ہماری خفیہ فرزندی کا الزام آئے گا۔ اب ان اندیشوں کی گنجائش نہیں رہی اور انہی کے ساتھ وہ گرم جملے بھی کچھ ضروری نہیں رہے جنہیں خارج کیا گیا ہے۔

بعض اور جملوں کی جگہ بھی، سنسر کی مصلحت سے، صرف نقطے رہنے دئے گئے ہیں۔ جہاں زرا نرم لفظوں سے کام نکالنا مقصود تھا، وہاں میں نے قوسین کے اندر لکھ دیا ہے۔ باقی تمام عبارت لفظ بلفظ وہی ہے جو اصل نسخے میں تھی۔

لندن، ۶ جنوری ۱۸۹۱ء

فریڈرک اینگلس

رسالے کی عبارت کے مطابق لفظ بلفظ۔

جرمن رسالہ «Die Neue Zeit»  
شمارہ ۱۸، سال ۹۱ — ۱۸۹۰ء  
میں شائع ہوا۔

## کارل مارکس ولہلم براکے کے نام خط

لندن، ۵ مئی ۱۸۷۵ء

عزیز من براکے!

اتحاد کے پروگرام پر حسب ذیل تنقیدی نوٹ پڑھ لینے کے بعد اتنی مہربانی کیجئے کہ گیپ، آئر، بیبل اور لیکنیخت کو ایک نظر ڈالنے کے لئے بھیج دیجئے۔ میں کام میں بری طرح پھنسا ہوا ہوں اور ڈاکٹروں نے کام کی جو حدود میرے لئے مقرر کر رکھی ہیں، ان سے گزر جانے پر مجبور ہوتا ہوں۔ چنانچہ اتنے سارے کاغذ سیاہ کرنا میرے لئے ہرگز ”راحت“ کا سامان نہیں ہے۔ لیکن اس کی ضرورت یوں آپڑی کہ کہیں ہمارے پارٹی والے دوست، جنہیں باخبر کرنے کے لئے یہ تحریر بھیج رہا ہوں، وہ آگے چل کر جو قدم مجھے اٹھانے ہیں، ان کا غلط مطلب نہ نکال لیں۔ میرا اشارہ ہے اس مختصر اعلان سے جو اینگلس اور میں، ہم دونوں اس اتحاد کانگریس کے بعد شائع کریں گے اور جتنا دیں گے کہ اس اصولی پروگرام سے ہمارا دور دور کوئی واسطہ نہیں، اس میں ہماری کوئی شرکت نہیں۔

یہ جتنا لازمی ہے، اس لئے لازمی ہے کہ غیر ملکوں میں پارٹی کے دشمنوں نے بڑی کاوش سے یہ خیال پھیلا رکھا ہے کہ ہم یہاں سے خفیہ طور پر وہ تحریک چلوا رہے ہیں جسے آئری ناخ پارٹی (۱۰۳) کہتے ہیں۔ حال میں ہی ایک کتاب (۱۰۴) روسی زبان میں نکلی



ہے جہاں باکونین نے پھر مجھ پر الزام لگایا ہے کہ میں پارٹی کے ان تمام پروگراموں کا ہی جوابدار نہیں بلکہ لیکنیخت نے عوامی پارٹی میں شریک ہونے کے بعد سے جو جو قدم اٹھایا، اس کی ذمہ داری بھی مجھی پر آتی ہے۔

علاوہ ازیں میرا فرض اجازت نہیں دیتا کہ مصلحت آمیز خاموشی سے ہی سہی، لیکن ایسے پروگرام کو گلے اتار لوں جو میری رائے میں قطعی کسی کام کا نہیں اور پارٹی کو پست ہمت کرنے والا ہے۔ اصل تحریک کا ایک قدم بھی درجن بھر پروگراموں سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے اگر ممکن نہ ہوتا اور حالات اجازت نہ دیتے کہ آئری ناخ پارٹی کے پروگرام سے آگے قدم بڑھایا جائے، تب بھی چاہئے تھا کہ مشترک دشمن کے خلاف کارروائی کے سیدھے سادے فیصلے پر منظوری حاصل کی جائے۔ مگر جب اصولی پروگرام طے کئے جائیں (حالانکہ یہ کام تب تک کے لئے ملتوی رکھنا چاہئے جب مشترکہ سرگرمی کا ایک عرصہ گزار لینے سے وہ خود ابھر کر آئے ہوں) تو ساری دنیا کے سامنے ایسے نشان پیش کرنا لازم ہے جن پر لوگ فیصلہ کریں گے کہ پارٹی تحریک کا معیار کیا ہے۔

لاسال والے خیالات کے لیڈر اس لئے ہمارے پاس آئے کہ حالات نے انہیں اس پر مجبور کیا تھا۔ اگر انہیں پہلے سے بتادیا جاتا کہ اصولوں کے معاملے میں کوئی سودے بازی نہیں کی جائے گی تو وہ عملی کارروائی کے پروگرام پر، یا مشترکہ عمل کے تنظیمی پلان پر ضرور قناعت کر لیتے۔ اس کے بجائے ہوا کیا، کہ انہیں اپنی پارٹی کے احکام سے لیس ہو کر آنے کی اجازت دی جاتی ہے، اور اپنے اوپر ان احکام کی پابندی تسلیم کر لی جاتی ہے، یعنی بلاشرط ان لوگوں کے سامنے سر تسلیم جھکا دیا جاتا ہے جو خود مدد کے طلبگار تھے۔ ان سب باتوں پر طرہ یہ کہ وہ لوگ سمجھوتے کی کانگرس ہونے سے پہلے ہی اپنی کانگرس طلب کر رہے ہیں، حالانکہ اپنی پارٹی نے کانگرس طلب کی ہے صرف post festum (تعطیل کے بعد، زرا دیر سے) (۱۰۵)۔ ظاہر بات ہے کہ ہر قسم کی تنقید کی کاٹ کرنے کے لئے یہ تدبیر کی گئی ہے، اور پارٹی کو سوچ بچار کا کوئی موقع نہیں ملنے دیا گیا۔ یہ صحیح

ہے کہ مزدوروں کو خود اتنے ہی میں تشفی ہو گئی کہ اتحاد ہونے والا ہے، لیکن وہ لوگ غلطی پر ہیں جو سوچتے ہیں کہ یہ وقتی کامیابی بہت مہنگی نہیں پڑی۔

بہر حال اس پروگرام سے کچھ کام نکلنے والا نہیں اور لاسال کے ایمان کی تائید سے بھی کچھ بنتا بگڑتا نہیں۔

میں آپ کو کتاب ”سرمایہ“ کے فرانسیسی ایڈیشن کے آخری حصے عنقریب بھیجوں گا۔ فرانسیسی حکومت کی طرف سے پابندی لگنے کے باعث اس کی طباعت کافی عرصے کے لئے رک گئی تھی۔ اب یا تو اسی ہفتے ورنہ اگلے ہفتے کے شروع میں کتاب چھپ کر تیار ہو جائے گی۔ اس سے پہلے کے چھ حصے آپ کو مل چکے ہیں؟ براہ کرم مجھے برن ہارڈ بیکر کا پتہ بھیج دیجئے کیوں کہ انہیں بھی کتاب کے آخری حصے بھیجنے ہیں۔

«Volksstaat» اشاعت گھر کے اپنے کچھ طور طریقے ہیں۔ مثلاً انہوں نے اب تک مجھے ”کولون کمیونسٹ مقدمے“ کی ایک کاپی بھی نہیں بھیجی ہے۔ \*

دل سے آپ کا خیرخواہ

کارل مارکس

\* کارل مارکس ”کولون میں کمیونسٹ مقدمہ، برے نقاب“۔ (ایڈیٹر)



## کارل مارکس

# جرمن مزدور پارٹی کے پروگرام پر ایک نظر

۱

۱۔ ”لیبر ہر قسم کی دولت کا، ہر طرح کے کلچر کا سرچشمہ ہے۔ اور چونکہ فائدہ مند لیبر صرف سماج میں اور سماج کے ذریعے ہی ممکن ہے تو اس کا حاصل بھی کٹوتی کے بغیر اور برابر کے حق سے سماج کے سب ممبروں کو پہنچتا ہے۔“

پیرا گراف کا پہلا حصہ : ”لیبر ہر قسم کی دولت کا، ہر طرح کے کلچر کا سرچشمہ ہے۔“

لیبر ہر قسم کی دولت کا سرچشمہ نہیں ہوتی۔ نیچر بھی اتنا ہی سرچشمہ ہے استعمالی قدروں کا، (مادی دولت آخر انہی استعمالی قدروں سے بنتی ہے) جتنا لیبر، کیونکہ وہ بھی تو قدرتی طاقتوں میں سے ایک ظہور ہے۔ انسان کی محنت کرنے کی طاقت۔ اوپر کا یہ جملہ آپ کو بچوں کی کسی بھی ابتدائی کتاب میں مل جائے گا، اور وہ اس حد تک درست بھی ہے جہاں نرا مطلب یہ ہو کہ محنت اپنی ضرورت کے سروسامان اور اوزاروں کی بدولت عمل میں آتی ہے۔ لیکن سوشلسٹ پروگرام میں اس قسم کے بورژوا جملوں کو ان شرطوں

کے بڑھائے بغیر دخیل نہیں ہونا چاہئے جو انہیں بامعنی بناتی ہیں۔ محنت کے تمام سروسامان اور ذریعوں کے اولین سرچشمے، یعنی قدرت کے ساتھ آدمی کا برتاؤ جہاں تک کہ خود اپنی ملکیت کا سا ہوتا ہے، وہ قدرت کے ساتھ یوں پیش آتا ہے کہ یہ اس کی اپنی ہی چیز ہے، تو وہیں تک اس کی محنت استعمالی قدروں کا، یا بالآخر دولت کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔ بورژوازی نے معقول وجہیں گڑھ رکھی ہیں یہ جتانے کی کہ گویا محنت میں قدرت سے برتر کوئی تخلیقی طاقت ہوتی ہے، بس جب محنت ایک قدرتی چیز ٹھہری تو اس سے یہ نکلا کہ انسان اپنی قوت محنت کے علاوہ کسی اور چیز کا مالک و مختار نہ ہونے ہوئے بھی ہر قسم کی سماجی یا تہذیبی حالت میں غیروں کی غلامی پر مجبور رہے، ان غیروں کی غلامی پر، جو محنت کی مادی ضروریات کے مالک بن چکے ہیں۔ صرف انہی کی اجازت سے وہ کام کر سکتا ہے، یا یوں کہیے کہ صرف انہی کی منظوری سے زندگی گزار سکتا ہے۔

اچھا تو یہ جملہ، اپنی اصلی حالت میں، اسی گری پڑی حالت میں رہنے دیں۔ ہمیں اس بیان سے کس نتیجے کی امید رکھنی چاہئے تھی؟ اس نتیجے کی کہ :

”چونکہ لیبر ہر قسم کی دولت کا سرچشمہ ہے تو سماج کا کوئی ممبر بھی جو دولت پر ہاتھ ڈالے گا وہ محنت کی تیار کی ہوئی چیز کے سوا کچھ اور نہ ہوگی۔ اگر وہ خود کام نہیں کرتا تو دوسرے کی محنت پر جیتا ہے۔ اور اسی طرح اپنا کلچر بھی وہ دوسرے کی محنت سے ہی حاصل کرتا ہے۔“

اس کے بجائے ”چونکہ“ کی پخ لگا کر پہلے جملے کو دوسرے جملے سے اس طرح جوڑ دیا گیا کہ جو نتیجہ نکالنا ہے وہ دوسرے جملے سے نکلے، پہلے سے نہیں۔

پیرا گراف کا دوسرا حصہ : ”فائدہ مند لیبر صرف سماج میں اور سماج کے ذریعے ہی ممکن ہے۔“

پہلے والے کیسے کی رو سے لیبر ہی سرچشمہ تھا ہر قسم کی دولت اور ہر طرح کے کلچر کا لہذا لیبر کے بغیر کوئی سماج ممکن نہ ہونا



چاہئے۔ لیکن یہاں الٹا معاملہ ہے، ہمیں بتایا گیا کہ کوئی فائدہ مند لیبر ممکن نہیں ہے بغیر سماج کے۔

اسی خوبی کے ساتھ یوں بھی کہا جا سکتا تھا کہ صرف سماج میں یہ ممکن ہے کہ بے فائدہ بلکہ سماج کے لئے نقصان دہ لیبر صنعت کی ایک شاخ بن جائے اور صرف سماج میں ہی بغیر کچھ کٹے جینا ممکن ہوتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ غرض کہ فلسفی روسو کا پورا بیان نقل کیا جا سکتا تھا۔

اور یہ ”فائدہ مند“ لیبر کیا ہوتی ہے؟ وہی جو مطلوبہ مفید نتیجہ پیدا کرے۔ تو اس حساب سے وہ وحشی آدمی (انسان جب بندر کے مرحلے سے گزرا تو وحشی آدمی کے درجے میں آیا) جو پتھر سے جانور مار لے یا پھل بٹورا کرے وغیرہ، وہ بھی ”فائدہ مند“ لیبر کرنے والا ٹھہرا۔

تیسرے۔ اس کا یہ نتیجہ کہ :

”چون کہ فائدہ مند لیبر صرف سماج میں اور سماج کے ذریعے ہی ممکن ہے تو اس کا حاصل بھی کٹوتی کے بغیر اور برابر کے حق سے سماج کے سب ممبروں کو پہنچتا ہے۔“

کیا خوب نتیجہ ہے! اگر فائدہ مند لیبر صرف سماج میں اور سماج کے ذریعے ہی ممکن ہے تو اس کا حاصل بھی سماج کو پہنچتا ہے اور الگ الگ مزدور کو اس آمدنی کا صرف اتنا حصہ ملے گا جو محنت کی ”ضروری شرط“ یعنی سماج کو باقی رکھنے کے لئے درکار نہ ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ ہر زمانے میں، اس وقت کے سماجی ڈھانچے کے

حامیوں کی طرف سے یہی کلیہ آگے بڑھایا گیا ہے۔ سب سے اول تو یہ دعوے حکومت کی طرف سے اور جو بھی حکومت سے وابستہ ہے، ان کی طرف سے کئے جاتے ہیں، کیونکہ حکومت وہ سماجی ادارہ ہے جو کسی سماجی نظام کو چلانے کے لئے ہوتا ہے؛ بعد میں طرح طرح کی ذاتی ملکیت کے دعوے آتے ہیں کیوں کہ مختلف قسموں کی ذاتی ملکیت گویا سماج کی جڑ بنیاد ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ یہ کھوکھلے جملے ایسے ہیں کہ توڑ مروڑ کر، جو جی چاہے معنی نکال لیجئے۔

پیراگراف کے پہلے اور دوسرے حصے میں اگر کوئی با معنی تعلق بتاتا ہے تو لفظوں کی اس ترتیب کے ساتھ کہ :

”محنت، صرف سماجی محنت کی حیثیت سے دولت اور تہذیب کا سرچشمہ بنتی ہے،“ یا اسی کو یوں کہہ لیجئے کہ ”سماج میں اور سماج کے ذریعے۔“

یہ کلیہ بے شک درست ہے کیوں کہ آدمی کی الگ تھلگ محنت سے (اس کے مادی حالات ذہن میں رکھتے ہوئے) استعمالی قدریں تو ضرور پیدا ہوتی ہیں، لیکن وہ نہ دولت پیدا کر سکتی ہیں، نہ تہذیب۔ اسی طرح دوسرے جملے میں شک کی گنجائش نہیں رہتی جو یوں ہوگا کہ :

”محنت سماجی حیثیت سے جوں جوں بڑھتی جائے گی اور دولت و تہذیب کا سرچشمہ بنتی جائے گی، اسی نسبت سے محنت کش کے حصے میں غریبی اور محتاجی بڑھے گی اور محنت نہ کرنے والوں کے حق میں دولت اور تہذیب۔“

آج تک کی تاریخ کا یہی اصول رہا ہے، چنانچہ ”محنت“ اور ”سماج“ کے بارے میں گول بول لفظ کہنے کے بجائے صاف صاف ثابت کرنا چاہئے تھا کہ موجودہ سرمایہ داری سماج میں آخر وہ مادی اور دوسرے حالات جنم لے چکے ہیں جو محنت کشوں کو اس پر آمادہ اور کمربستہ کرتے ہیں کہ وہ اس سماجی لعنت کا خاتمہ کر دیں۔ اصل میں یہ سارا پیراگراف، جو صورت میں ناہموار اور معنی میں ناقص ہے، یہاں صرف اسی غرض سے آیا کہ لاسال کا فارمولا ”محنت کی آمدنی کٹوتی کے بغیر“ نعرے کی حیثیت سے پارٹی کے پرچم پر چڑھا دیا جائے۔ ”محنت کی آمدنی“، ”مساوی حق“، وغیرہ سے میں بعد میں بھی بحث کروں گا کیوں کہ یہی چیزیں کسی قدر دوسری شکل میں آگے بھی ملتی ہیں۔

۲۔ ”موجودہ سماج میں محنت کے ذرائع سرمایہ دار طبقے کا اجارہ بن چکے ہیں۔ یوں مزدور طبقے کا پابند ہو کر رہ جانا ہی ہر رنگ کی محتاجی اور ماتحتی کا سبب ہوتا ہے۔“



یہ جملہ جو انٹرنیشنل کے بنیادی قاعدوں سے لیا گیا تھا، اصلاح کی ہوئی صورت میں غلط ہو جاتا ہے۔

آجکل کے سماج میں محنت کے ذرائع پر صاحب جائداد لوگوں کا اور سرمایہ داروں کا اجارہ ہے (زمین جائداد کا اجارہ خود سرمائے کے اجارے کی بنیاد ہے)۔ انٹرنیشنل کے بنیادی قاعدوں میں اس مضمون کا جو پوائنٹ ہے، وہاں نہ اجارے داروں کے ایک طبقے کا ذکر ہے، نہ دوسرے کا۔ وہاں ”محنت کے ذرائع، یعنی زندگی کے سرچشموں

کی اجارہ داریوں“ کے لفظ آئے ہیں۔ ”زندگی کے سرچشموں“ کا ٹکڑا بڑھا کر صاف طور سے یہ جتا دیا گیا ہے کہ محنت کے ذرائع میں زمین بھی شامل ہے۔

اصلاح کی ضرورت یوں پیش آئی ہوگی کہ لاسال ایسی وجہوں سے، جو سب کے علم میں اب آچکی ہیں، صرف سرمایہ داروں کے طبقے کو اپنے حملے کا نشانہ بنایا کرتا تھا، صاحب جائداد طبقے کو نہیں۔ انگلینڈ میں سرمایہ دار زیادہ تر زمین کے اس ٹکڑے کا بھی مالک نہیں ہوتا جس پر اس کی فیکٹری کھڑی ہو۔

۳۔ ”محنت کے سر سے بوجھ اتارنے کا تقاضا ہے کہ محنت کے ذرائع کو سارے سماج کی مشترکہ ملکیت کی طرف بڑھایا جائے اور پوری لیبر کے لئے باہمی شرکت کے قاعدے ہوں تاکہ محنت کا حاصل منصفانہ تقسیم کیا جائے۔“

”محنت کے ذرائع کو سارے سماج کی مشترکہ ملکیت کی طرف بڑھانا، (!) کیا مطلب ہے؟ غالباً کہنا یہ ہے کہ انھیں ”سارے سماج کی مشترکہ ملکیت میں ڈھال دیا جائے“۔ خیر یہ جملہ معترضہ تھا۔ ”محنت کا حاصل، یا آمدنی ہے کیا؟ محنت سے جو سامان تیار کیا جائے وہ یا اس کی ویلیو؟ اگر مطلب ویلیو سے ہے تو کون سی؟ سامان کی پوری ویلیو یا ویلیو کا صرف اتنا حصہ جو کام میں لگنے والے ذرائع پیداوار کی ویلیو میں محنت نے آخر میں بڑھایا ہے؟

”محنت کا حاصل، یا آمدنی ایک ڈھیلا ڈھالا تصور ہے جو لاسال نے باضابطہ معاشی تصور کی جگہ اختیار کر لیا تھا۔

پھر یہ ”منصفانہ“ تقسیم کیا ہوئی؟ کیا بورژوا یہی دعوا نہیں کرتا کہ موجودہ تقسیم منصفانہ ہے؟ اور پیداوار کے موجودہ طریق کو دیکھتے ہوئے کیا واقعی صرف اسی تقسیم کے ”منصفانہ“ ہونے سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے؟ کیا معاشی رشتے قانونی تصورات کے پابند ہوتے ہیں؟ یا اس کے برعکس ایسا نہیں ہوتا کہ قانونی رشتے معاشی رشتوں سے پیدا ہوتے ہوں؟ اور کیا خود مختلف سوشلسٹ فرقہ بندیوں میں اس ”منصفانہ“ تقسیم پر طرح طرح کے خیالات نہیں پائے جاتے؟

”منصفانہ تقسیم“ کا یہاں کیا مطلب ہے، اسے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے پیراگراف کو اس پیراگراف سے ملا کر پڑھا جائے۔ تیسرے پیراگراف کا کہنا ہے کہ ایسا سماج ہو جس میں ”محنت کے ذرائع سماج کی مشترکہ ملکیت ہوں اور پوری لیبر کے لئے باہمی شرکت کے قاعدے ہوں“، اور پہلے پیراگراف میں ہم دیکھتے ہیں کہ ”محنت کا حاصل بھی کٹوتی کے بغیر اور برابر کے حق سے سماج کے سب ممبروں کو پہنچتا ہے۔“

”سماج کے سب ممبروں کو پہنچتا ہے“؟ ان کو بھی جو کام نہیں کرتے؟ تو پھر ”محنت کا حاصل کٹوتی کے بغیر“ کہاں رہا؟ اور اگر صرف کام کرنے والوں کو؟ تو پھر سماج کے سب ممبروں کا ”برابر کا حق“ کدھر گیا؟

پتہ چلا کہ ”سماج کے سب ممبر“ اور ”برابر کا حق“ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اس کمیونسٹ سماج میں ہر ایک محنت کرنے والے کو لاسال کا بیان کردہ ”کٹوتی کے بغیر محنت کا حاصل“ وصول ہونا چاہئے۔

اور اگر ہم ”محنت کا حاصل“ کا یہ مطلب نکالیں کہ محنت سے تیار کیا ہوا سامان، تو مل جل کر کی ہوئی محنت کا حاصل وہ ہوا جو سماج کی ساری کی ساری پیداوار ہے۔

اس ساری پیداوار میں سے



اول تو وہ حصہ منہا کر دیں جو کھپے ہوئے ذرائع پیداوار کی کمی پوری کرنے کو رکھا جاتا ہے ؛  
دوسرے وہ حصہ نکال دیں جو پیداوار کو اور پھیلانے کے لئے اوپر سے لگایا جاتا ہے ؛

تیسرے ریزرو میں ، یا بطور احتیاط رکھا جانے والا وہ ذخیرہ بھی الگ کرنا ہوگا جو برا وقت پڑنے پر نکالا جاتا ہے ۔

” کٹوتی کے بغیر محنت کے حاصل “ میں سے یہ سب حصے نکالنا ایک اقتصادی مجبوری ہے اور ان کی کمی بیشی منحصر ہے اس پر کہ ذرائع اور قوتیں کیسی ہیں اور کسی حد تک قیاس اور تخمینے سے کام لیا جاتا ہے لیکن کسی صورت میں بھی منصفانہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اب باقی بچتا ہے ساری پیداوار کا دوسرا حصہ ، جسے ضروریات زندگی کے سامان کی حیثیت سے خرچ ہونا ہے ۔

اس بچے ہوئے حصے کو الگ الگ افراد میں بانٹنے سے پہلے ، پھر ہمیں تین مدوں کا حق نکالنا ہوگا :

اول تو انتظامیہ کے وہ عام خرچے ، جنہیں پیداوار کے عمل سے براہ راست کوئی واسطہ نہیں ۔

آج کے سماج میں اس مد پر جتنا خرچ ہوتا ہے ، اس کے مقابلے میں تو شروع سے ہی بہت کم ہو جائے گا ، اور نئے سماج کے بڑھنے کی رفتار کے ساتھ برابر کم ہوتا چلا جائے گا ۔

دوسرے وہ جو ضروریات کی مشترکہ طلب پوری کرنے پر لگنا ہے ، مثلاً اسکول ، ہسپتال وغیرہ ۔

آج کے سماج میں اس مد پر جتنا خرچ ہوتا ہے ، اس کے مقابلے میں تو شروع سے ہی زیادہ ہو جائے گا اور نئے سماج کے بڑھنے کی رفتار کے ساتھ وہ بھی برابر بڑھتا جائے گا ۔

تیسرے وہ فنڈ جو محنت سے معذور لوگوں اور دوسروں کے لئے الگ کیا جاتا ہے ۔ مختصر یہ کہ وہ جسے آجکل غریبوں کی سرکاری امداد کے نام سے الگ کرتے ہیں ۔

یہ سب حصے نکال چکنے کے بعد ہم کہیں اس ” تقسیم “ پر

آتے ہیں جسے گوتھا پروگرام نے لاسال کے اثر میں اتنے تنگ دائرے میں پیش نظر رکھا ہے ، یعنی ضروریات زندگی کے سامان کا وہ حصہ جس میں کوآپرے ٹیو سوسائٹی کے کام کرنے والے اپنا حصہ بٹائیں گے ۔

” کٹوتی کے بغیر محنت کا حاصل “، یوں چپ چاپ ” کٹتا “، چلا گیا ، البتہ یہ ہوا کہ سامان تیار کرنے والے کو بحیثیت ایک فرد کے جو کچھ اپنے حق میں سے کٹوانا پڑا ، وہ سماج کے ایک ممبر کی حیثیت سے اسی کے حق میں براہ راست یا بالواسطہ استعمال بھی ہو گیا ۔

جس طرح ” کٹوتی کے بغیر محنت کا حاصل “، والا جملہ غائب ہو گیا ، اسی طرح اب ” محنت کا حاصل “، بھی کافور ہوتا ہے ۔

اس سماج میں ، جس کی بنیاد امداد باہمی ( کوآپرے ٹیو ) پر ہو ، ذرائع پیداوار کی مشترکہ ملکیت پر ہو ، سامان تیار کرنے والے اپنے سامان کا باہمی تبادلہ نہیں کیا کرتے ؛ سامان کی تیاری میں جو محنت لگی ہے وہ یہاں اس کی ویلیو کی حیثیت میں نہیں ابھرنے پاتی ، نہ وہ اس سامان کی خصوصیات یا خوبی کے اندر پوشیدہ ہوتی ہے ۔ وجہ اس کی یہ کہ سرمایہ داری سماج کے ڈھنگ پر انفرادی محنت گھوم پھر کر جو حیثیت رکھتی تھی ، اب اس کے برخلاف مل جل کر کی ہوئی محنت کا براہ راست ایک جزو بن جاتی ہے ۔ یوں لفظ ” محنت کا حاصل “، کہنا آجکل اپنے دورخے معنی کی بنا پر بھی قابل قبول نہیں ہو سکتا اور بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے ۔

جس کمیونسٹ سماج سے ہمارا واسطہ پڑتا ہے ، وہ خود اپنی بنیاد پر نہیں اٹھا ، بلکہ اس کے برخلاف ایسا کمیونسٹ سماج ہے جو سرمایہ داری سماج میں سے ابھرا ہے اور اس لئے ہر معاملے میں ، چاہے وہ معاشی ہو ، اخلاقی یا ذہنی ، بہر حال اسی پرانے سماج کے پیدائشی داغ دھبے پڑے رہ جاتے ہیں جس کی کوکھ سے اس نے جنم لیا ہے ۔ اس کے مطابق ہوگا یہ کہ سامان تیار کرنے والے ایک ایک آدمی کو سماج سے سب کٹوتیوں کے بعد جو کچھ وصول ہونا ہے وہی اسی قدر ہے جتنا وہ خود سماج کو دیتا ہے ۔ اس کی اپنی انفرادی محنت سوسائٹی میں اس کا حصہ ہے ۔ مثال کے طور پر ، سماجی محنت کا ایک دن وہ مقدار ہے جس میں انفرادی محنت کے سارے گھنٹے یکجا ہوتے ہیں ۔



ہر ایک پیداواری آدمی نے الگ الگ جو وقت محنت کھپایا وہ سماجی محنت کے ایک دن میں اس کی شرکت یا اس کا لگایا ہوا حصہ ہے۔ سوسائٹی اس کو رسید دیتی ہے کہ اس شخص نے محنت کی اتنی مقدار کھپائی ہے (مشترکہ فنڈ کا حصہ اس میں سے منہا کر دیا جاتا ہے)۔ اس رسید کے مطابق سماجی ذخیروں میں سے اس قدر سامان ضرورت وصول پاتا ہے جس کی تیاری میں اتنی ہی محنت کھپی ہوئی ہے۔ محنت کی اتنی ہی مقدار، جو ایک شکل میں سماج کو دی تھی، دوسری شکل میں اسے وصول ہو جاتی ہے۔

ظاہر بات ہے کہ یہاں بھی وہی اصول کارفرما ہے جو مالوں کے تبادلے پر حاوی ہوتا ہے، وجہ یہ کہ یہاں بھی برابر کی قدروں کا مبادلہ ہوتا ہے۔ یہاں واقعے کا ظاہر و باطن بدل گیا کیوں کہ بدلے ہوئے حالات میں کوئی شخص بھی سوائے اپنی محنت کے کچھ نہیں دے سکتا، اور الگ الگ آدمیوں کے ذاتی حصے میں سوائے ذاتی سامان ضرورت کے اور کچھ نہیں آسکتا۔ مگر سامان تیار کرنے والے الگ الگ آدمیوں میں جہاں تک سامان ضرورت کی تقسیم کا سوال ہے، تو یہاں بھی وہی اصول کارفرما ہوگا جو برابر مالیت والے مالوں کے تبادلے میں ہوتا آیا تھا کہ: کسی ایک شکل میں محنت کی ایک مقررہ مقدار کسی دوسری شکل میں محنت کی اتنی ہی مقدار سے بدلی جائے۔

لہذا برابر کا حق یہاں اصولی طور پر وہی بورژوائی حق رہتا ہے، اگرچہ اب اصول اور عمل کا وہ ٹکراؤ نہیں رہتا، جب کہ مالوں کے مبادلے والی صورت میں برابر کی مالیت کا مبادلہ الگ الگ نہیں، بلکہ اوسط میں پڑتا تھا۔

ترقی ضرور ہوئی لیکن اس کے باوجود برابر کا حق ایک حیثیت سے بورژوائی حد بندی کا پابند ہی رہا۔ سامان تیار کرنے والے کو اس کی محنت کے حساب سے حق ملا؛ برابری صرف اس بات میں رہی کہ سب کا ماپ برابر کا ہے، یعنی محنت۔

مگر ایک شخص جسمانی یا ذہنی طور پر دوسرے سے بہتر ہے، چنانچہ یا تو اتنے ہی وقت میں زیادہ محنت دیتا ہے، یا زیادہ وقت تک محنت کرنے قابل ہے۔ اور محنت ہی چوں کہ ایک پیمانہ ہے تو

وہ پھیلاؤ یا گہرائی میں سب کے لئے یکساں ہونی چاہئے ورنہ وہ ماپ کے کام نہیں آسکتی۔ لہذا یہ جو برابر کا حق تھا، یہی نابرابر محنت کے لئے نابرابری کا حق ٹھہرا۔ یہ حق طبقوں کی اونچ نیچ کو نہیں مانتا کیوں کہ اس کے سامنے ہر شخص کی حیثیت اوروں کی طرح کام کرنے والے کی ہے، لیکن خاموشی سے ایک فرق کو مانتا ہے کہ آدمی کی لیاقت ایک سی نہیں ہوتی، نتیجہ یہ کہ کام کی صلاحیت میں اونچ نیچ ہونا قدرتی بات ہے۔ لہذا اندر سے وہ نابرابری کا حق ہے جیسے کہ اور حق ہوتے ہیں۔ اپنی فطرت سے حق صرف اسی میں ہے کہ سب کے لئے ایک پیمانہ اختیار کیا جائے۔ لیکن افراد برابر نہ ہونے پر (اگر وہ نابرابر نہ ہوتے تو ایک دوسرے سے مختلف ہی کیوں ہوتے) سب کو ایک پیمانے سے تبھی ناپا جا سکتا ہے جب انہیں صرف ایک نقطہ نظر سے دیکھا جائے، ان پر کسی ایک خاص پہلو سے ہی نظر ڈالی جائے، مثلاً سوال زیر بحث میں انہیں صرف محنت کرنے والے کی حیثیت سے تولا جائے، اس کے علاوہ کوئی اور حیثیت نظر میں نہ ہو، باقی تمام صفات نظر انداز کردی جائیں۔ آگے چلیے: ایک شادی شدہ ہے، دوسرا نہیں ہے، ایک کے زیادہ بچے ہیں، دوسرے کے کم، وغیرہ وغیرہ۔ برابر کی محنت کرنے پر، یا یوں لیجئے کہ سماجی ضروریات کے فنڈ میں سے برابر کا حصہ پانے پر دراصل ایک کو زیادہ ملتا ہے، دوسرے کو اس سے کم، یعنی ایک کی مالی حالت دوسرے سے بہتر رہتی ہے۔ اسی پر اور قیاس کر لیجئے۔ ان تمام الجھنوں سے بچنے کی صورت یہی ہے کہ حق برابر ہونے کے بجائے نابرابر رہنا چاہئے۔

کمیونسٹ سماج کے پہلے دور میں ان خامیوں سے مفر نہیں ہے، اس حالت میں جب وہ سرمایہ داری سماج کے دردزہ کی مصیبت دیر تک بھگتنے کے بعد جنم لے گا۔ حق کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو معاشی نظام سے اور اس نظام کے لائے ہوئے سماج کی تہذیبی ترقی سے بالاتر ہو۔ کمیونسٹ سماج کے اعلا دور میں، جب آدمی کو محنت کی تقسیم کے شکنجے میں کسنا ختم ہو جائے گا، جب تقسیم محنت کے ساتھ



ساتھ ذہنی اور جسمانی محنت کی لاگ ڈانٹ جاتی رہے گی، جب محنت صرف زندگی باقی رکھنے کا ذریعہ نہ رہ جائے گی، بلکہ زندگی کا اولین تقاضا بن چکی ہوگی، جب فرد کی ہر پہلو، ہر جہت سے ترقی کے دوش بدوش پیداواری طاقتیں بھی بڑھ چکی ہوں گی اور سماجی دولت کے سارے ندی نالے مل کر ایک بھرپور دھارا بن چکے ہوں گے، تب جاکر بورژوا حق کے تنگ دائرے سے نجات ملے گی اور سماج اپنے پرچم پر یہ اعلان لکھ سکے گا: ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق کرے، ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق ملے۔

ایک طرف ”کٹوتی کے بغیر محنت کا حاصل“ سے بحث کرنے میں، دوسری طرف ”برابر کا حق“ اور ”منصفانہ تقسیم“ پر میں نے بڑی تفصیل سے کام لیا ہے۔ مقصد یہ دکھانا تھا کہ ایک تو یہی جرم ہے کہ ہماری پارٹی کے سر وہ خیالات اٹل عقیدے کی طرح پھر سے منڈھے جائیں جو کبھی کسی دور میں با معنی تھے، لیکن وقت گزرنے پر اپنی وقعت اور معنویت بالکل کھو چکے ہیں، دوسرے، اس حقیقت پسندانہ خیال کو بگاڑنے کی بھی کوشش ہے جو بڑی مشکلوں کے بعد اب کہیں جاکر پارٹی کے ذہن نشین ہوا ہے اور جڑ پکڑ چکا ہے، تاکہ حقوق وغیرہ کی فضول نظریاتی قسم کی باتیں بنا کر جو ڈیموکریٹوں اور فرانسیسی سوشلسٹوں کی پرانی عادت ہے، اس تصور میں الجھاؤ ڈال دیا جائے۔

اوپر جتنی کچھ بحث کی گئی ہے، اس سے قطع نظر یوں بھی نام نہاد تقسیم پر اس قدر زور دینا اور اسی کو خاص کر ابھارنا غلط ہے۔ سامان ضرورت کی تقسیم، چاہے وہ کیسی ہی کیوں نہ ہو، ہمیشہ خود پیداواری اسباب کی تقسیم کا ایک لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ اور پیداواری اسباب کی تقسیم سے صرف طریق پیداوار کا کیرکٹر ظاہر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کی بنیاد اس حقیقت پر رکھی ہوئی ہے کہ پیداوار کے مادی اسباب، سرمائے اور زمین جائداد کی شکل میں ان لوگوں کے ہاتھ ہوتے ہیں جو خود مزدور نہیں ہوتے اور عام لوگ پیداوار کے صرف ذاتی اسباب کے، یعنی قوت محنت کے مالک ہوتے ہیں۔ اگر پیداوار کے عناصر اس طرح بٹے ہوئے ہیں

تو سامان ضرورت کی موجودہ تقسیم خود بخود ہوجاتی ہے۔ اور اگر پیداوار کے مادی اسباب خود مزدوروں کی باہمی ملکیت میں ہوں تو اس سے جو سامان ضرورت کی تقسیم ہوگی وہ آجکل کی تقسیم سے مختلف ہوگی۔ گھٹیا سوشلزم نے بورژوا ماہرین معاشیات سے (اور جمہوریت ماننے والے بعض لوگوں نے وہاں سے) یہ سیکھا کہ تقسیم کو طریق پیداوار سے بے تعلق اور بے نیاز کر کے اس طرح دیکھا اور برتا جائے چناں چہ معاملے کو یوں پیش کرنا سیکھ گئے گویا سوشلزم زیادہ تر تقسیم کے سوال کے گرد گھومتا ہے۔ لیکن جب ان دونوں کا اصلی تعلق بہت زمانے پہلے واضح کیا جا چکا ہے تو اب اس کی طرف پلٹنے کی کیا ضرورت ہے؟

۴۔ ”محنت کے سر کا بوجھ اتارنا مزدور طبقے کا ہی کام ہونا چاہئے، جس کے تعلق سے باقی سارے طبقے صرف ایک رجعت پرست ہجوم رہ جاتے ہیں۔“

جملے کا پہلا ٹکڑا انٹرنیشنل کے دستور العمل کی تمہید سے لیا گیا ہے، لیکن اس پر بھی اصلاح کا قلم پھیر دیا گیا۔ وہاں یہ جملہ یوں تھا: ”مزدور طبقے کے سر کا بوجھ اتارنا خود مزدوروں کا ہی کام ہونا چاہئے۔“ \* یہاں الٹا یہ کہا گیا کہ ”مزدور طبقہ، آزاد کرے کس کو؟“۔ ”محنت کو“۔ یہ بھی کوئی بس کی بات ہے! جگہ بھرنے کی خاطر پہلے بیان کا توڑ بھی شامل کر لیا، یہ ہے کھرا جملہ جو لاسال کے ہاں سے لیا گیا ہے کہ ”جس کے تعلق سے باقی سارے طبقے صرف ایک رجعت پرست ہجوم رہ جاتے ہیں۔“

”کمیونسٹ مینی فسٹو“ میں کہا گیا ہے: ”بورژوا طبقے کے روبرو اس وقت جتنے طبقے کھڑے ہیں، ان سب میں ایک پرولتاریہ ہی حقیقت میں انقلابی ہے۔ دوسرے طبقے جدید صنعت کے مقابلے میں

\* ملاحظہ ہو کارل مارکس کی تحریر ”انٹرنیشنل ورکنگ مینز ایسوسی ایشن کے دستور العمل“۔



زوال پذیر اور بالآخر ناپید ہوتے جاتے ہیں۔ پرولتاریہ اس کی مخصوص اور لازمی پیداوار ہے۔ \*،،

یہاں اس بیان میں بورژوازی کو، جدید یا بھاری صنعت لانے والے کی حیثیت سے ایک انقلابی طبقہ قرار دیا گیا اور جاگیرداروں اور درمیانی طبقوں کی نسبت سے ایسا کہا گیا ہے جن کی تمنا ہوتی ہے کہ اپنے دم قدم کے ساتھ وہ سماجی حیثیتیں بھی سنبھالے رہیں جو پرانے طریق پیداوار کی دین تھیں۔ چنانچہ وہ دونوں طبقے بورژوازی سمیت صرف ایک رجعت پرست ہجوم نہیں ہوتے ہیں۔

دوسری طرف پرولتاریہ ایک انقلابی طبقہ ہے بورژوازی کی نسبت سے کیوں کہ وہ بھاری صنعت کے بل پر ابھرتا ہے تو پیداوار پر سے وہ سرمایہ داری بندھن اتارنے کی فکر میں رہتا ہے جنہیں بورژوازی ہمیشہ بنائے رکھنا چاہتی ہے۔ ”کمیونسٹ مینی فسٹو“ نے یہیں پر یہ بھی بڑھا دیا کہ ”درمیانی طبقہ صرف یہی دیکھ کر کہ اس کے لئے پرولتاریہ کے ساتھ ملنے کی گھڑی قریب آپہنچی ہے وہ انقلابی ہو جاتا ہے۔“

اس نقطہ نظر سے دیکھئے تو یوں کہنے کے کوئی معنی نہیں رہ جاتے کہ گویا مزدور طبقے کی نسبت سے یہ لوگ ”بورژوازی کے ساتھ“، بلکہ اور بڑھا دیجئے کہ جاگیرداروں کے ساتھ مل کر ”صرف ایک رجعت پرست ہجوم رہ جاتے ہیں۔“

کیا پچھلے الکشنوں کے موقع پر دستکاروں کو، چھوٹے موٹے کارخانہ داروں وغیرہ اور کسانوں کو خطاب کر کے یہی کہا گیا تھا کہ ”ہماری نسبت سے آپ لوگ بورژوا اور جاگیرداروں سمیت صرف ایک رجعت پرست ہجوم بنتے ہیں؟“

لاسال کو ”کمیونسٹ مینی فسٹو“، اسی طرح زبانی یاد تھا جیسے اس کے چیلوں کو اپنے استاد کی حدیثیں یاد ہیں۔ تب اگر اس نے ”مینی فسٹو“ کو بری طرح موڑا توڑا ہے تو صرف اس غرض سے

\* ملاحظہ ہو اس ایڈیشن کا حصہ اول، صفحہ ۶۵۔ (ایڈیٹر)

تاکہ بورژوازی کے مقابلے پر کھڑے ہوئے من مانے فرماں رواؤں اور جاگیرداروں سے اپنے اتحاد کی سبیل نکال لے۔

اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ مذکورہ بالا پیراگراف میں بڑی ہوشیاری سے لاسال کا قول بال باندھ کر اٹکا دیا گیا ہے حالانکہ اسے انٹرنیشنل کے دستور العمل کے اس حوالے سے دور کا بھی کوئی سروکار نہیں تھا جس پر خواہ مخواہ ”اصلاح کا قلم“، پھیرا گیا۔ چنانچہ ہمارے سامنے جو چیز آئی وہ بے حیائی کا ایک نمونہ ہے، جو مسٹر بسمارک کو بھی ناپسند نہ ہوگا، اور ان گھٹیا قسم کی شرارتوں میں سے ہے جن کا کاروبار برلن کا مراٹ کیا کرتا ہے۔ \*

۵۔ ”مزدور طبقہ اپنے سر کا بوجھ اتارنے کے لئے اول تو عہد حاضر کی قومی ریاست کے دائرے میں رہ کر کوشش کرتا ہے، یہ جانتے ہوئے کہ ان کوششوں کا لازمی نتیجہ، جو سارے مہذب ملکوں کے مزدوروں میں مشترک ہے، یہ ہوگا کہ قوموں میں انٹرنیشنل برادری بنے۔“

”کمیونسٹ مینی فسٹو“، اور پہلے کے تمام سوشلزم کے برخلاف لاسال نے مزدور تحریک کو نہایت ہی تنگ قومی نقطہ نظر سے دیکھا تھا۔ اب اسی کی تقالی کی جارہی ہے، وہ بھی اس وقت جب انٹرنیشنل اپنی کارگزاری دکھا چکا۔

یہ بات بغیر کہے ظاہر ہے کہ یوں بھی مزدور طبقے کو جنگی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے خود اپنے ملک میں طبقے کی حیثیت سے اپنے آپ کو منظم کرنا لازمی ہے اور خم ٹھونکنے کے لئے جو اکھاڑا سامنے ہے وہ خود اس کا ملک ہے۔ یہاں تک تو اس کی طبقاتی جدوجہد قومی ہوتی ہے، اپنے باطن میں نہیں بلکہ ”کمیونسٹ مینی فسٹو“ کے بقول اپنی ”شکل صورت میں“۔ تاہم ”آجکل کی قومی ریاست کا دائرہ“،

\* برلن کا مراٹ ایک طنزیہ اشارہ ہے ہاسسیل مان کی طرف، جو لاسال والوں کے ترجمان اخبار »Neuer Social-Demokrat« کا چیف ایڈیٹر تھا۔ (ایڈیٹر)



مثلاً جرمن سلطنت کا قومی دائرہ خود اقتصادی حیثیت سے ”عالمی منڈی کی چار دیواری کے اندر“، محدود ہوتا ہے اور سیاسی حیثیت سے وہ ”ریاستی نظام حکومت کی حدود میں“، رہتا ہے۔ ہر ایک بیوپاری واقف ہے کہ جرمنی کی تجارت جرمن ہونے کے ساتھ ساتھ غیرملکی بھی ہے اور مسٹر بسمارک کی عظمت قطعی طور سے اس بات میں ہے کہ وہ ایک خاص قسم کی انٹرنیشنل پالیسی بھی چلا رہے ہیں۔

جرمن مزدور پارٹی اپنی بین الاقوامیت کدھر لے جا رہی ہے؟ اس شعور کی طرف کہ ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ”قوموں کی انٹرنیشنل برادری بنے“، بورژوا انجمن ”سن و آزادی کی لیگ“، (۱۵۶) کے یہاں سے مانگا ہوا یہ جملہ اس جملے کی جگہ بٹھایا جا رہا ہے کہ حاکم طبقوں اور ان کی حکومتوں کے خلاف مشترکہ جدوجہد میں مختلف ملکوں کے مزدور طبقوں کی انٹرنیشنل برادری ہو۔ چنانچہ جرمن مزدور طبقے کی انٹرنیشنل ذمہ داری کے بارے میں ایک لفظ تک نہیں کہا۔ اس طرح سے وہ اپنے یہاں کی بورژوازی کو چیلنج کرنے چلے ہیں جو مزدور طبقے کے خلاف تمام ملکوں کی بورژوازی سے برادری کا رشتہ جوڑے ہوئے ہے اور یوں مسٹر بسمارک کی انٹرنیشنل سازشی پالیسی کا مقابلہ کیا جائے گا۔

سچ پوچھئے تو گوٹھا پروگرام کی بین الاقوامیت آزاد تجارت پارٹی کے انٹرنیشنلزم سے بھی نہایت پست سطح پر ہے۔ وہ پارٹی بھی یہی دعوا کرتی ہے کہ اس کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ”قوموں کی انٹرنیشنل برادری بنے“، وہ اس غرض سے کچھ نہ کچھ کرتی تو ہے کہ تجارت کو انٹرنیشنل بنائے اور صرف اس شعور سے مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ رہتی کہ سب قومیں اپنے اپنے یہاں تجارت کر رہی ہیں۔ مختلف ملکوں کے مزدور طبقے کی انٹرنیشنل سرگرمی ہرگز ”انٹرنیشنل ورکنگ مینز ایسوسی ایشن“ کے وجود پر منحصر نہیں۔ یہ تو صرف پہلی کوشش تھی تاکہ اس سرگرمی کے لئے ایک مرکزی ادارہ کھولا جائے، اس نے جو جھٹکا دیا وہ تو خیر ایک یادگار کامیابی ثابت ہوا، لیکن پیرس کمیون ٹوٹنے کے بعد اس کی اولین تاریخی شکل میں یہ کوشش آگے نہیں بڑھائی جا سکتی تھی۔

بسمارک کا »Norddeutsche« (شمالی جرمن) بالکل حق بجانب تھا کہ اس نے اپنے مالک کی تسکین کے لئے باآواز بلند کہہ دیا کہ جرمن مزدور پارٹی اس نئے پروگرام میں انٹرنیشنلزم سے صاف انکاری ہے (۱۵۷)۔

## ۲

”ان اصولوں سے قدم اٹھا کر جرمن مزدور پارٹی تمام قانونی راستوں پر گزرتی ہوئی، آزاد ریاست اور اشتراکی سماج کی منزل کی جانب بڑھتی ہے کہ : کام کی اجرت کا سسٹم اپنے آہنی قانون سمیت مٹا دیا جائے اور ناجائز فائدہ اٹھانے کی ہر شکل کا خاتمہ ہو جائے؛ ہر قسم کی سماجی اور سیاسی نابرابری دور کر دی جائے۔“

”آزاد“، ریاست پر بحث زرا بعد میں کروں گا۔ تو اب جرمن مزدور پارٹی کو آئندہ لاسال والے ”آہنی قانون“، پر بھی ایمان لانا ہوگا! گوٹھا پروگرام میں اس کی گنجائش نکالنے کے لئے ایک سہل ٹکڑا بڑھایا گیا یہ کہہ کر کہ ”کام کی اجرت کا سسٹم اپنے آہنی قانون سمیت مٹا دیا جائے“، (حالانکہ کہنا تھا : اجرتی محنت یا مزدوری کا سسٹم)۔ اگر میں مزدوری کا سسٹم مٹاتا ہوں تو قدرتی بات ہے کہ اس کے قانون بھی مٹا دیتا ہوں، چاہے وہ ”آہنی“، ہوں یا نرم پھوٹے جیسے ہوں۔ لیکن اجرتی محنت سے لاسال کی جنگ کم و بیش اسی نام نہاد قانون کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ چنانچہ صرف یہ دکھانے کے لئے کہ لاسال والے فرقے نے میدان مار لیا ہے ”کام کی اجرت کا سسٹم“، مٹایا جانا چاہئے ”اپنے آہنی قانون سمیت“، اس کے بغیر نہیں۔

یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ ”کام کی اجرت کے آہنی قانون“، والے ٹکڑے میں لفظ ”آہنی“، کے سوا لاسال کا کچھ بھی نہیں، اور یہ لفظ بھی گوئیٹے کی ایک نظم سے مستعار ہے، جہاں وہ کہتا ہے : ”یہ اٹل، آہنی قانون“،۔ ”آہنی“، ایک بندھا ٹکا لفظ ہے جس



سے اہل ایمان قانون اور قانون میں شناخت کرتے ہیں۔ اب اگر میں قانون کو اس کی لاسال والی چھاپ کے ساتھ قبول کرلوں، مطلب یہ کہ قانون کے وہی معنی ذہن میں رکھوں جو لاسال نے لئے ہیں تو مجھے اسی کے بتائے ہوئے متعلقات بھی ماننے پڑیں گے۔ صورت کیا بنے گی؟ ابھی لاسال کے انتقال کو زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ لانگ نے ثابت کر دیا (اور خود لانگ نے اسی کی تبلیغ بھی کی) کہ یہ نظریہ دراصل مالتھوس کا نظریہ آبادی ہے (۱۵۸)۔ اگر یہ نظریہ صحیح ہو، تب بھی میں اس ”آہنی قانون“ کو نہیں مٹا سکتا، چاہے اجرتی محنت سو بار مٹا دوں، کیوں کہ قانون وہ ہے جو صرف اجرتی محنت کے سسٹم پر نہیں بلکہ ہر ایک سماجی نظام پر حاوی ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی بنیاد پر کھڑے ہو کر ماہرین معاشیات پچھلے پچاس سال بلکہ اور زیادہ عرصے سے کہہ رہے ہیں کہ سوشلزم غریبی کو دور نہیں کر سکتا، کہ اس کی جڑیں تو فطرت میں پیوست ہیں، البتہ غریبی کو عام کر سکتا ہے، اسے سماج کی پوری سطح پر ایک ساتھ پھیلا سکتا ہے۔

لیکن اصل بحث یہ نہیں ہے۔ لاسال نے قانون کا جو غلط مفہوم پیش کیا ہے، اس سے بالکل قطع نظر، صحیح معنوں میں تکلیف دہ پسپائی آگے دکھائی گئی ہے۔

لاسال کی موت کے بعد اس علمی تصور نے ہماری پارٹی کے اندر جگہ بنائی کہ اجرتیں وہ نہیں جو نظر آتی ہیں، یعنی محنت کی ویلیو یا قیمت نہیں ہیں بلکہ قوت محنت کی ویلیو یا قیمت کی ایک درپردہ شکل ہیں۔ چنانچہ تب تک اجرت کا جو بورژوا تصور چلا آتا تھا، وہ اور اس پر جتنی کچھ نکتہ چینی ہو چکی تھی، وہ سب ہمیشہ کے لئے رد کر دئے گئے اور یہ بات صاف ہو گئی کہ اجرت پر کام کرنے والے کو اپنی گزراوقات کے یعنی زندہ رہنے کے لئے کام کرنے کی اجازت اسی وقت تک ہے جب وہ کچھ وقت بے معاوضہ کام بھی کرے سرمایہ دار کی خاطر (اور اسی میں یہ بھی کہ اور لوگ جو قدر زائد میں سرمایہ دار سے ساجھا کرتے ہیں، ان کی خاطر)؛ اور یہ کہ پیداوار کا پورا سرمایہ دارانہ نظام اسی مفت کی محنت کو بڑھانے کی فکر میں رہتا ہے،

یا تو کام کے گھنٹے بڑھا کر، یا پیداواری طاقت بڑھا کر، یا یوں کہئے کہ محنت کی قوت میں شدت پیدا کر کے، وغیرہ؛ اور یہ کہ اجرت پر کام لینے والا سسٹم غلامی کا ہی ایک نظام رہتا ہے، ایسی غلامی کا نظام کہ لیبر کی سماجی پیداواری طاقتیں جوں جوں بڑھتی جاتی ہیں یہ غلامی بھی شدید ہوتی جاتی ہے، چاہے اس میں محنت کرنے والے کو اچھے دام ملتے ہوں یا برے۔ جب اجرتوں کے بارے میں یہ تصور ہماری پارٹی میں زیادہ سے زیادہ ذہن نشین ہو چکا تو اب لاسال کے اٹل عقیدے کی طرف الٹا رخ کیا جا رہا ہے، حالانکہ یہ معلوم ہو جانا چاہئے تھا کہ لاسال کو خبر ہی نہ تھی کہ اجرت کیا ہوتی ہے، لیکن بورژوا ماہرین معاشیات کی دیکھا دیکھی اس نے بھی یہی روپ بھرا گویا معاملے کی تمہ میں اتر چکا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ان غلاموں میں جن پر غلامی کا راز کھل چکا، اور جنہوں نے شورش برپا کر دی، ایک ایسا بھی ہے جو ابھی تک پرانے خیالات کے شکنجے میں پڑا ہوا شورش کے پروگرام میں یہ لکھ رہا ہے: غلامی کا خاتمہ ہونا چاہئے کیوں کہ غلامی کے نظام کے ہونے غلاموں کا راشن ایک مقررہ حد سے اوپر نہیں جا سکتا، بلکہ جتنا بھی ہو سکے، کم رکھا جاتا ہے۔

یہی ایک بات کہ ہماری پارٹی کے نمائندوں کے ہاتھوں اس تصور پر جو پارٹی میں عام طور سے ذہن نشین ہو چکا ہے، ایسی مہلک ضرب لگائی جائے، کیا یہ ثابت نہیں کرتی کہ اس سمجھوتے کے پروگرام کی تیاری میں انہوں نے کس قدر مجرمانہ غفلت اور بے شعوری سے عمل کیا ہے۔

پیراگراف کے آخر میں اس مبہم سے جملے پر تمام کرنے کے بجائے کہ ”ہر قسم کی سماجی اور سیاسی نابرابری کا خاتمہ کیا جائے“، انہیں یوں کہنا چاہئے تھا کہ طبقاتی اونچ نیچ مٹنے کے ساتھ ساتھ، اس سے ابھرنے والی ہر قسم کی سماجی اور سیاسی نابرابری بھی آپ سے آپ دور ہو جائے گی۔



۳

”سماجی مسئلے کے حل کا راستہ نکالنے کے لئے جرمن مزدور پارٹی کی مانگ ہے کہ سامان تیار کرنے والوں کی کوآپریٹو سوسائٹیاں قائم کی جائیں جنہیں سرکاری امداد حاصل ہو اور محنت کرنے والوں کا جمہوری کنٹرول رہے۔ یہ کوآپریٹو سوسائٹیاں صنعت اور زراعت دونوں میں اتنے بڑے پیمانے پر وجود میں لائی جائیں کہ ان سے مجموعی محنت کی اشتراکی تنظیم ابھرے۔“

”اجرت کا آہنی قانون“، تو لاسال نے لگایا ہی تھا، اب زخم کا سرہم بھی اسی پیغمبر کے ہاں سے ملا۔ ”راستہ نکالنے“ کی بہت معقول تجویز سوچی گئی۔ موجودہ طبقاتی کشمکش کے بجائے اخباری قلم گھسیٹ جملہ جڑ دیا گیا ہے ”سماجی مسئلہ“، جس کے ”حل کا“، ”راستہ نکالنا“، ہے۔ سماج کی انقلابی کاپاپلٹ کے عمل کی جگہ ”مجموعی محنت کی اشتراکی تنظیم“، ”ابھرتی“، ہے ”سرکاری امداد“، سے، جو کوآپریٹو سوسائٹیوں کو دی جائے گی اور سرکار ہی کے دم سے ”وہ وجود میں لائی جائیں گی“، مزدوروں کے دم سے نہیں۔ لاسال کی خیال آرائی کے عین مطابق ہے یہ بات گویا سرکاری امدادی رقم سے نیا سماج اسی آسانی کے ساتھ بن کر تیار ہو جائے گا جیسے نئی ریلوے لائن بنتی ہے۔

شرم سے جو تلچھٹ رہ گئی تو ”سرکاری امداد“، کو ”محنت کرنے والوں“، کے جمہوری کنٹرول میں دے دیا گیا۔ اول تو یہ کہ ”محنت کرنے والوں“، کی اکثریت جرمنی میں کسانوں کی ہے، پرولتاریوں کی نہیں۔

دوسرے یہ کہ لفظ ”جمہوری“، کا مطلب جرمن میں Volksherr-schaftlich (یعنی جمہور کے ہاتھ میں طاقت) ہوتا ہے۔ سوال،

ہوگا کہ ”محنت کرنے والے جمہور کے ہاتھ میں طاقت کا کنٹرول“، کیا معنی؟ خاص کر ان محنت کرنے والوں کے معاملے میں، جو ریاست کے سامنے اپنی مانگ پیش کر کے پوری طرح یہ مانے لے رہے ہیں کہ نہ تو ان کے ہاتھ میں طاقت ہے، نہ وہ طاقت لینے کے قابل ہوئے ہیں۔ یہاں اس نسخے کی تنقیح غیر ضروری معلوم ہوتی ہے جو کبھی لوئی فلپ کی شاہی حکومت میں بیوشے نے فرانسیسی سوشلسٹوں کے توڑ پر تجویز کیا تھا اور جسے مستری خانوں (۱۵۹) (L'Atelier) کے رجعت پرست مزدوروں نے قبول بھی کر لیا تھا۔ اصل مصیبت یہ نہیں کہ پروگرام میں ایسی کراماتی تدبیر جوڑ دی گئی بلکہ یہ ہے کہ طبقاتی تحریک کے نقطہ نظر سے پیچھے ہٹ کر ایک فرقہ وارانہ تحریک کے نقطہ نظر کی طرف یونہی الٹا قدم بڑھایا جا رہا ہے۔

جب مزدوروں کی نظر میں یہ منزل ہو کہ وہ حالات پیدا کئے جائیں جو پورے سماجی پیمانے پر، اور اس سے بھی اول قومی پیمانے پر کوآپریٹو (باہمی) پیداوار کے لئے سازگار ہوں تو اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ پیداوار کی جو حالت قائم ہے، وہ اسے الشے کی کوشش میں ہیں۔ اس بات کو ایسی کوآپریٹو سوسائٹیوں کے قائم ہونے سے دور کا بھی رشتہ نہیں جو سرکاری امداد سے چلیں گی۔ اور جہاں تک موجودہ کوآپریٹو سوسائٹیوں کا تعلق ہے تو وہ صرف وہیں تک قابل قدر ہیں جہاں بذات خود مزدوروں کی قائم کی ہوئی ہوں، نہ انہیں سرکاری سرپرستی حاصل ہو اور نہ بورژوازی کا سایہ۔

۴

اب میں جمہوری حصے کی طرف آتا ہوں۔

الف: ”ریاست کی آزاد بنیاد“۔

سب سے اول بات یہ کہ سیکشن نمبر دو کے مطابق جرمن مزدور پارٹی ”آزاد ریاست“ کی آرزومند ہے۔ یہ ”آزاد ریاست“، کیا ہوتی ہے؟



ریاست کو ”آزاد“ کرنا ہرگز ان مزدوروں کی منزل مقصود نہیں ہے جو فرمان بردار رعایا کی تنگ ذہنیت سے خود آزاد ہو چکے ہوں۔ جرمن سلطنت میں ”اسٹیٹ“، قریب قریب اتنی ہی ”آزاد“ ہے جتنی روس میں۔ آزادی اس بات میں ہے کہ اسٹیٹ کو ایسے ادارے کے بجائے جو سوسائٹی کے اوپر لدا ہو، ایسا ادارہ بنایا جائے جو سوسائٹی کا ماتحت ہو، اور آج بھی ریاست کی کوئی صورت اسی قدر کم یا زیادہ آزاد ہے جتنی وہ ”ریاست کی آزادی“ پر پابندی لگاتی ہے۔

جرمن مزدور پارٹی نے اگر کہیں یہ پروگرام اپنا لیا تو ظاہر کر دے گی کہ اشتراکی خیالات اس کی کھال کے اندر نہیں اترے۔ بجائے اس کے کہ وہ موجودہ سوسائٹی کو موجودہ ریاست کی بنیاد (اور یہ بات آئندہ ہر قسم کے سماجوں پر بھی صادق آتی ہے) سمجھ کر دیکھے (یا آئندہ کے سماج کو آئندہ کی ریاست کی بنیاد سمجھے) وہ الٹا یہ سمجھ رہی ہے کہ ریاست کوئی الگ سے اپنا وجود رکھتی ہے، جس کی خود اپنی ”ذہنی، اخلاقی اور آزادانہ بنیادیں“، ہوا کرتی ہیں۔

اس پروگرام میں اوپر سے ان لفظوں ”عہد حاضر کی ریاست“، اور ”عہد حاضر کا سماج“، کی ایسی بے جا بھرمار کی گئی ہے اور خود اسی ریاست کا غلط اور بھدا تصور قائم کر لیا گیا ہے جس کے سامنے اپنی مانگیں پیش کی ہیں۔

”عہد حاضر کا سماج“، وہی سرمایہ داری سماج ہے جو تقریباً تمام مہذب ملکوں میں قائم ہے، وسطی زمانے کے رگ و ریشے سے کم و بیش پاک ہے، اور ہر ایک ملک جو تھوڑا بہت ترقی یافتہ ہے، اس کے خاص تاریخی حالات کے مطابق تھوڑی بہت تبدیلی بھی قبول کر چکا ہے۔ لیکن ”عہد حاضر کی ریاست“، کو دیکھئے تو وہ ہر ملک کی سرحدوں کے ساتھ ادلتی بدلتی رہتی ہے۔ پروشیا جرمن سلطنت میں وہ کچھ اور ہے، سوئٹزرلینڈ میں کچھ اور، انگلینڈ میں اس کی حالت ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے مختلف ہے۔ مطلب یہ کہ ”عہد حاضر کی ریاست“، محض ایک افسانہ ہے۔

مختلف تہذیب یافتہ ملکوں کی مختلف ریاستوں میں رنگ روپ کا چاہے کتنا ہی فرق پڑتا ہو، تاہم ان سبھوں میں ایک یہ بات مشترک ہے کہ ان کی بنیاد نئے زمانے کے سرمایہ دارانہ سماج پر ہے، کسی میں سرمایہ دارانہ ترقی زیادہ ہوئی ہے، کسی میں کم۔ اسی لئے ان کی بعض خاصیتیں بھی مشترک ہیں۔ صرف ان معنوں میں ”عہد حاضر کی ریاست“، کا لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے کہ وہ آئندہ کی اس ریاست سے الگ چیز ہے جب اس کی جڑ بنیاد، یعنی بورژوا سماج مر چکا ہوگا۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ : کمیونسٹ سماج میں ریاست کی کیا کلپ کیسی ہوگی؟ دوسرے لفظوں میں سوال یہ ہے کہ تب وہ کونسی سماجی کارگزاریاں رہ جائیں گی جو آج کی سرکاری کارگزاریوں سے میل کھاتی ہیں؟ اس سوال کا صرف علمی جواب دیا جاسکتا ہے۔ ہزاروں بار اگر لفظ ”جمہور“، کو ”ریاست“، سے ترکیب دیا جائے، تب بھی ہم اس مسئلے کے حل کے بال برابر نزدیک نہیں پہنچیں گے۔

سرمایہ دار اور کمیونسٹ سماج کے درمیان ایک دور ایسا گزرتا ہے جس میں ایک کو دوسرے میں ڈھالنے کا انقلابی عمل انجام پاتا ہے۔ اسی کی مناسبت سے ایک ایسا سیاسی عبوری دور بھی گزرتا ہے کہ اس دور کی ریاست پرولتاریہ کی انقلابی ڈکٹیٹری کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔

مگر پروگرام کو دیکھئے تو وہاں نہ اس سے بحث ہے، نہ کمیونسٹ سماج کی آئندہ ریاستی حیثیت سے۔

اس کی سیاسی مانگوں میں بھی کچھ نہیں رکھا، سوائے اس کے کہ وہی جانی پہچانی جمہوری رٹ لگائی گئی ہے : عام رائے دہندگی کا حق، براہ راست قانون سازی، جمہوری حق، والنٹیر پولیس (ملیشیا) وغیرہ۔ یہ سب باتیں بورژوا عوامی پارٹی اور امن و آزادی کی لیگ کی محض صدائے بازگشت ہیں۔ یہ وہی مطالبے ہیں کہ اگر انہیں پیش کرنے میں بڑھا چڑھا کر لفاظی سے کام نہ لیا جائے تو پہلے ہی مل چکے ہیں۔ صرف اتنا ہے کہ جس ریاست میں یہ حقوق مل چکے وہ جرمن سلطنت کی حدوں کے اندر موجود نہیں بلکہ سوئٹزرلینڈ میں ہے،



ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ہے، وغیرہ۔ اس قسم کی ”آئندہ کی ریاست“، خود عہد حاضر میں وجود رکھتی ہے، البتہ جرمن سلطنت کے چوکھٹے سے باہر ہے اس کا وجود۔

مگر ایک بات بھول ہی گئے۔ چوں کہ جرمن مزدور پارٹی نے کھلے لفظوں میں جتا دیا ہے کہ وہ ”عہد حاضر کی قومی ریاست“ کے اندر عمل کرے گی، یعنی خود اپنی ریاست کے اندر، پروشیا جرمن سلطنت کی حدوں میں (ورنہ یہ مطالبے باہر کی دنیا میں بے معنی ہو جاتے کیونکہ وہی تو طلب کیا جائے گا جو میسر نہ ہو) ایسی حالت میں اسے سب سے بڑی بات نہ بھولنی چاہئے تھی، وہ بات یہ کہ جتنی پیاری پیاری مانگیں کی ہیں ان کا دارومدار ہے اس چیز کے تسلیم کئے جانے پر جسے عوام کا اختیار اعلا کہتے ہیں، لہذا وہ جمہوری ریپبلک کے وقت کی راگنی ہیں۔

اگر جمہوری ریپبلک طلب کرنے کی ہمت نہیں تھی، جیسا کہ فرانسیسی مزدوروں نے بادشاہ لوئی فیلپ کے اور لوئی بوناپارٹ کے زمانے میں اپنے پروگراموں میں مطالبہ کیا تھا (اور پھر یہاں حالات کا تقاضا تھا کہ احتیاط سے کام لیا جائے) تو وہ کرتب دکھانا کیا ضرور تھا جس میں نہ ”ایمانداری“، نہ معقولیت، اور ایسی چیزیں مانگی جائیں جو صرف جمہوری ریپبلک میں ہی کچھ معنی رکھتی ہیں، وہ بھی اس ریاست سے جس کی حقیقت سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اوپر سے پارلیمنٹری جھالر ٹنکی ہوئی ہے اور اندر سے جاگیرداری ریشے بھرے ہیں، بیک وقت بورژوازی کا بھی پورا اثر پڑتا ہے اور سرکاری عہدہ داروں کی بھی ریشہ دوانی چلتی ہے، پولیس کی حفاظت میں فوجی اندھیر گردی قائم ہے۔ اور سب پر طرہ یہ کہ اس قسم کی ریاست کو شان کے ساتھ یہ یقین دلایا جا رہا ہے کہ اس کے ہاتھ سے ہمیں ایسا کچھ حاصل وصول کر لینے کا گمان ہے ”قانونی ذریعوں سے“!

اور تو اور، گھٹیا ڈیموکریسی بھی، جسے جمہوری ریپبلک میں حکومت الہیہ کا ہزار سالہ دور زمین پر اترتا نظر آتا ہے اور جسے دور دور گمان نہیں گزرتا کہ بورژوا سماج کی یہ تازہ ترین صورت (جمہوری ریپبلک) ہی وہ وقت ہے جب طبقاتی جدوجہد کا فیصلہ

ہتھیاروں سے ہو جانا چاہئے، وہ ڈیموکریسی تک اس قسم کی جمہوریت پسندی سے کہیں بلند و برتر ہے جس نے خود کو انہی حدوں کے اندر رکھا جن کی روادار پولیس تو ہو، منطقی نہ ہو۔

لفظ ”ریاست“، سے حقیقت میں کیا مراد ہے۔ گورنٹ کی مشین یا اسٹیٹ، کہ تقسیم محنت کے اصول سے وہ اپنا ایک خاص اور سماج سے الگ تھلگ جسمانی وجود بنا لیتی ہے، یہ بات کافی حد تک واضح ہو جاتی ہے ان الفاظ سے کہ ”جرمن مزدور پارٹی یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسٹیٹ کی معاشی بنیاد کی حیثیت سے ایک چڑھتا ہوا انکم ٹیکس ہونا چاہئے“، وغیرہ۔ ٹیکس حکومت کی مشینری کی معاشی بنیاد ہوتے ہیں، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ ”آئندہ کی اسٹیٹ“، میں جو فی الحال سوئٹزرلینڈ میں موجود ہے، یہ مطالبہ اچھی طرح سے پورا کیا جا چکا ہے۔ انکم ٹیکس میں یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ مختلف سماجی طبقوں کی آمدنی کے مختلف ذرائع ہوتے ہیں، یعنی سماج سرمایہ دارانہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس میں کمال کی کوئی بات نہیں اگر شہر لیورپول (انگلینڈ) کے مالیاتی اصلاح پسند بورژواؤں نے، وزیر اعظم گلیڈسٹن کے بھائی کی سربراہی میں وہی مطالبہ آگے بڑھایا جو زیر بحث پروگرام میں موجود ہے۔

ب: ”اسٹیٹ کی ذہنی اور اخلاقی بنیاد کی حیثیت سے جرمن مزدور پارٹی یہ مانگ کرتی ہے کہ نمبر ۱۔ اسٹیٹ کی طرف سے سب کے لئے اور یکساں ابتدائی تعلیم کا اہتمام کیا جائے۔ سب کے لئے اسکول کی حاضری لازمی ہو۔ تعلیم مفت ہو۔“

یکساں ابتدائی تعلیم؟ ان لفظوں کی تہہ میں کیا خیال رکھا گیا ہے؟ کیا یہ یقین کر لیا کہ عہد حاضر کے سماج میں (بحث اسی سے متعلق ہے) تعلیم سب طبقوں کے لئے یکساں ہو سکتی ہے؟ یا مانگ کی جا رہی ہے کہ اوپر کے طبقوں کو بھی مجبور کر کے ابتدائی تعلیم کے اسی ادنا معیار تک، یعنی اس ابتدائی اسکول تک



اتارا جائے جو بیک وقت نہ صرف محنت مزدوری کرنے والوں کی، بلکہ کسانوں کی بھی معاشی حالت سے میل کھاتا ہو؟

”سب کے لئے اسکول کی حاضری لازمی۔ تعلیم مفت۔“ پہلی تو جرمنی میں بھی موجود ہے، دوسری سوئٹزرلینڈ میں اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ابتدائی اسکولوں کی حد تک مہیا ہے۔ اگر امریکہ کی بعض ریاستوں میں ثانوی تعلیمی ادارے بھی ”مفت“ ہیں تو حقیقت میں اس کا مطلب یہی ہوا کہ عام ٹیکس کی آمدنی میں سے اوپر کے طبقوں کا تعلیمی خرچ نکالا جائے۔ اتفاق سے یہی بات الف نمبر ۵ میں ”عدالتی چارہ جوئی مفت“ ہونے کے مطالبے پر بھی صادق آتی ہے۔ فوجداری عدالت کو تو ہر جگہ مفت ہونا ہے؛ رہا دیوانی عدالت کا معاملہ، تو اس میں زمین جائداد کے مقدمے ہی آتے ہیں، اس لئے تنہا صاحب جائداد طبقوں پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ کیا مطالبہ یہ ہے کہ قومی تجوری کے بل پر یہ لوگ عدالتی چارہ جوئی کیا کریں؟ اسکولوں پر جو پیراگراف تھا وہاں ابتدائی اسکول کے ساتھ ٹیکنیکل اسکولوں کا بھی (جن میں کتابی اور عملی دونوں شامل ہیں) مطالبہ کرنا چاہئے تھا۔

”اسٹیٹ کے ذریعے سے ابتدائی تعلیم“، کسی کرم کی نہیں ہوتی۔ عام قانون بنا کر ابتدائی تعلیم کا بجٹ مقرر کرنا، پڑھانے والوں کے اسٹاف کو سند یافتہ بنانا، تعلیمی کورس کھولنا وغیرہ اور پھر جیسا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں قاعدہ ہے، سرکاری انسپکٹروں کے ذریعے ان کا معائنہ کرنا تاکہ ان قانونوں کی مندرجات کی تعمیل ہوتی رہے۔ یہ بالکل اور چیز ہے اور ریاست کے ہاتھ میں ابتدائی تعلیم چھوڑنا کچھ اور۔ اسکولوں پر کسی قسم کا اثر ڈالنے سے حکومت اور کلیسا دونوں کو یکساں بے دخل رکھنا چاہئے۔ خاص کر پروشیا جرمن سلطنت کا معاملہ تو یہ ہے کہ (یہاں خالی خولی بہانہ بازی سے کام نہیں چلنے والا کہ فی الحال ”آئندہ کی ریاست“ سے بحث ہے، ہم نے دیکھ لیا کہ اس معاملے میں حالت کیا ہے) لوگوں کو ریاست سے نہیں، بلکہ الٹا ریاست کو ہی لوگوں کے ہاتھ سے نہایت سخت تعلیم و تادیب کی ضرورت ہے۔

مگر یہ تمام پروگرام، اپنی جمہوری جھنکار کے باوجود، لاسال فرقے کے اس نیازمندانہ اعتقاد کے رنگ میں رنگا ہوا ہے جو اسے ریاست پر ہے، یا جمہوری معجزے پر جو عقیدہ ہے کہ بھی بہتر نہیں، یا غالباً معجزوں پر دونوں قسم کے عقیدوں کا یہ ایک سمجھوتہ ہے، اور یہ دونوں ہی سوشلزم سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔

”سائنس کی آزادی“، — پروشیائی آئین کے ایک پیراگراف میں یوں آیا ہے۔ تو پھر یہاں کیا ضرورت تھی؟

”عقیدے کی آزادی“، — اگر اب Kulturkampf تہذیبی جدوجہد (۱۶۰) کے زمانے میں یہ ضرورت پیش آگئی ہے کہ لبرلوں کو ان کے پرانے نعرے یاد دلانے جائیں تو یہ صرف ان لفظوں میں کیا جاسکتا تھا کہ ”ہر شخص کو موقع ملنا چاہئے کہ وہ اپنی مذہبی اور جسمانی ضرورتیں یوں پوری کر سکے کہ پولیس کا کوئی دخل نہ ہو“۔ لیکن مزدور پارٹی کو چاہئے تھا کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی یہ پختہ رائے ظاہر کر دیتی کہ بورژوازی جو ”عقیدے کی آزادی“، پکارتی ہے وہ آزادی سوائے اس کے کچھ نہیں کہ عقیدے کی مذہبی آزادی کی جتنی بھی قسمیں ممکن ہیں، سب کو برداشت کر لیا جائے۔ لیکن اس کے برعکس مزدور پارٹی انسانی ضمیر کو مذہب کے نشے سے ہی آزاد کرنے کی آرزومند ہے۔ تاہم یہ لوگ ”بورژوا معیار“ کی حدیں نہیں پھلانگنا چاہتے۔

اب میں خاتمے پر آگیا ہوں، کیوں کہ پروگرام میں آگے چل کر جو ضمیمہ دیا گیا ہے وہ اس کا کوئی خاص جزو نہیں ہے۔ لہذا میں بہت اختصار سے کام لوں گا۔

نمبر ۲۔ ”محنت کا نارسل وقت۔“

کسی ملک میں بھی مزدوروں کی پارٹی نے خود کو ایسے مبہم مطالبے میں محدود نہیں کیا (کہ نارسل کہہ کر رہ گئی ہو)، بلکہ ہمیشہ مقرر کر کے کہا ہے کہ بحالات موجودہ اتنے گھٹنے کی محنت کو نارسل سمجھتی ہے۔



نمبر ۳۔ ”عورتوں کی محنت پر کچھ پابندی اور بچوں کی محنت کی ممانعت۔“

محنت کے وقت کا جب ایک معیار مقرر کیا جائے تو اسی میں عورتوں سے محنت لینے پر کچھ پابندی شامل ہونی چاہئے کہ کام کے گھنٹوں کا کل وقت کتنا ہوگا، وقفہ کتنا ہوگا، وغیرہ۔ دوسری صورت میں مطلب صرف یہ ہوگا کہ صنعت کی ان شاخوں میں عورتوں سے محنت نہ لی جائے جو نسوانی صحت کے لئے خاص طور سے نامناسب ہیں یا صنف نازک کو اخلاقی طور سے زیب نہیں دیتیں۔ اگر یہ مطلب ہے تو اس طرح سیدھے سیدھے کہنا چاہئے تھا۔

”بچوں کی محنت کی ممانعت!“، یہاں عمر کی وضاحت کرنا نہایت ضروری تھا۔

بچوں سے محنت لینے کی عام ممانعت بڑے پیمانے کی صنعت کے ہوتے ہوئے قابل عمل نہیں ہے، لہذا ایک لاجواب اور نیک آرزو رہ جاتی ہے۔

اگر اس کا پورا ہونا ممکن ہوتا تو بھی یہ ایک رجعت پرستی تھی کیوں کہ اگر درجہ بدرجہ عمر کے حساب سے محنت کے وقت کی قید لگادی جائے، بچوں کی سلامتی کی خاطر کچھ احتیاطی تدبیریں رکھی جائیں، پیداواری محنت کو تعلیم سے شروع میں ہی جوڑ دیا جائے تو آج کے سماج کی کاپاپلٹ کرنے کا یہ بڑا ہی کارآمد ذریعہ ثابت ہوگا۔

نمبر ۴۔ ”کارخانے، ورکشاپ اور گھریلو کاروبار کی سرکاری نگرانی۔“

پروشیا جرمن ریاست کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ مطالبہ ضرور بڑھا لینا چاہئے تھا کہ فیکٹری انسپکٹروں کو صرف عدالت ہی برطرف کر سکتی ہے؛ اور یہ کہ ہر ایک مزدور کو حق ہوگا کہ انسپکٹروں پر غفلت کے الزام میں مقدمہ دائر کرادے، اور یہ کہ انسپکٹر ڈاکٹری پیشے سے لئے جائیں۔

نمبر ۵۔ ”جیل خانوں کی مشقت میں باقاعدگی۔“

مزدوروں کے عام پروگرام میں یہ مطالبہ کچھ جچتا نہیں۔ کچھ بھی سمجھی، اتنا تو صاف صاف کہا جانا چاہئے تھا کہ مزدوروں کا ہرگز یہ منشا نہیں کہ مقابلے کے ڈر سے عام مجرموں کے ساتھ جانوروں کا سا برتاؤ ہونے دیں اور خاص کر یہ کہ ان کے سدھار کی جو واحد تدبیر ہے کہ پیداواری محنت لی جائے، اس سے انہیں کوئی محروم نہیں کرنا چاہتا۔ سوشلسٹوں سے کم از کم اتنی امید تو کی ہی جاسکتی ہے۔

نمبر ۶۔ ”ذمہ داری کے بارے میں ایک عملی قانون۔“

یہ بتایا جانا چاہئے تھا کہ ذمہ داری کے بارے میں ”عملی“ قانون سے مطلب کیا ہے۔

ضمناً یہ جتنا چلوں کہ اس پیراگراف میں، جہاں محنت کے نارمل وقت کا ذکر آیا ہے، فیکٹری ایکٹ کا وہ حصہ نظر انداز کر دیا گیا جس کا تعلق ہوتا ہے صحت و صفائی کے انتظام اور احتیاطی کارروائیوں سے تاکہ حادثوں وغیرہ سے بچاؤ کیا جاسکے۔ ذمہ داری والا قانون ہی عمل میں آتا ہے جب ان اصولوں کی خلاف ورزی کی جائے۔ مختصر یہ کہ اس ضمیمے پر بھی بدسلیقہ کاٹ چھانٹ کی چھاپ لگی ہے۔

Dixi et salvavi animam meam. (میں نے بات کہہ دی اور اپنی جان بچا لی۔)

کارل مارکس نے اپریل اور مئی ۱۸۷۵ء کے شروع میں جرمن زبان میں لکھ کر تمام کیا۔ کسی قدر اختصار کے ساتھ رسالہ »Die Neue Zeit« شمارہ ۱۸ (۹۱ - ۱۸۹۰ء) میں شائع ہوا۔

اصل مسودے کے مطابق شائع کیا گیا۔



ہوئے ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ان کی الجھی ہوئی حالت سے فائدہ اٹھائیں اور اس بات کی ہر ممکن گارنٹی لے لیں کہ یہ لوگ مزدوروں میں اپنی کھوئی ہوئی ساکھ ہماری پارٹی کے بل پر نہ بنا سکیں۔ جہاں تک بس چلے، ان لوگوں کے ساتھ سردمہری اور بے اعتباری سے پیش آنا چاہئے تھا اور اتحاد کو اسی حد کا پابند کرنا چاہئے تھا جس حد تک وہ اپنے تنگ نظری کے نعروں اور ”سرکاری امداد“ والی باتوں سے ہاتھ دھونے کو آمادہ ہوتے اور آئزی ناخ کے ۱۸۶۹ء میں دئے ہوئے پروگرام کو یا بحالات موجودہ اس کی ترمیم شدہ صورت کو بنیادی طور سے قبول کرنے پر رضامند ہوتے۔ ہماری پارٹی کو نظریاتی طور پر یعنی پروگرام کے فیصلہ کن معاملے میں لاسال سے کچھ سیکھنے کی قطعی ضرورت نہیں، البتہ لاسال والوں کو ہماری پارٹی سے ضرور کچھ نہ کچھ سیکھنا ہے۔ اتحاد کی شرط اول یہ ہونی چاہئے تھی کہ لوگ علاحدگی پسندی سے یا لاسال کی پیروی سے ہاتھ دھوئیں اور اس نظرئے کی بدولت جو ہر معاملے میں سرکاری امداد کی رٹ لگائے رہتے ہیں، یا تو اس سے پوری طرح دست بردار ہوں، یا پوری طرح نہیں، تو کم از کم اتنا ضرور مان لیں کہ سرکاری امداد بھی اور بہت سی امکانی تدبیروں کی طرح محض ایک وقتی یا عارضی تدبیر رہے گی۔ پروگرام کے خاکے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے لوگ نظرئے کے معاملے میں تو لاسال خیال کے لیڈروں سے سوگنا بہتر ہیں لیکن سیاسی جوڑ توڑ میں اتنے ہی کچھے بھی رہتے ہیں؛ ”ایمانداروں“ کو پھر اس بار بے ایمانوں کے ہاتھوں مار کھانی پڑی ہے۔

اول تو یہی کہ لاسال کا، بظاہر زوردار لیکن تاریخی لحاظ سے فریبی جملہ قبول کر لیا گیا اور وہ یہ کہ : مزدور طبقے کی نسبت سے دوسرے تمام طبقے صرف رجعت پرست ہجوم ہیں۔ یہ بیان محض چند اتفاقی واقعات کی حد تک درست ہے : مثلاً اگر پرولتاری انقلاب برپا ہو جیسا کہ پیرس کمیون تھا، یا ایسے ملک میں جہاں

\* ”ایمانداروں“ کا لفظ مارکس نے یہاں آئزی ناخ والوں کے لئے استعمال کیا ہے۔ (ایڈیٹر)

## فریڈرک اینگلس

## بیل کے نام خط ۱۶۱

لندن، ۲۸-۱۸ مارچ ۱۸۷۵ء

عزیز من بیل !

مجھے تمہارا ۲۳ فروری والا خط ملا اور یہ جان کر خوشی ہوئی کہ صحت اتنی اچھی ہو گئی ہے۔

تم نے دریافت کیا ہے کہ پارٹی اتحاد کے بارے میں ہمارا کیا خیال ہے۔ بدقسمتی سے یہاں بھی تمہاری جیسی کیفیت ہے۔ نہ تو لیکنیخت نے ہمیں کوئی اطلاع بھیجی، نہ کسی اور نے، چنانچہ ہمیں بھی صرف اسی قدر اطلاع پہنچی جو اخباروں میں آئی ہے۔ اخباروں میں پچھلے ہفتے جو پروگرام کا خاکہ شائع ہوا اس سے پہلے کوئی خیر خبر نہ تھی۔ یہ خاکہ پڑھ کر ہم بھی دنگ رہ گئے۔

ہماری پارٹی نے لاسال والوں کی طرف اتنی بار ہاتھ بڑھایا، صلح صفائی کی تجویزیں رکھیں، اور کچھ نہیں تو مل جل کر کام کرنے کی تحریکیں کیں، لیکن ہیزن کاپوروں، ہیزل مینوں اور تیولکیوں نے بار بار ان تجویزوں کو ایسی بدتمیزی سے ٹھکرایا کہ ایک بچہ بھی اس سے یہ نتیجہ نکالتا کہ اب جو یہ صاحبان اپنی طرف سے صلح صفائی کی تجویزیں لے آئے ہیں تو ضرور بری طرح پھنسنے ہوں گے۔ ان لوگوں کا کردار جو ہم پر خوب آشکار ہے، اسے نظر میں رکھتے



نہ صرف بورژوازی نے ہی ریاست اور سماج کو اپنی پسند کے سانچے میں ڈھالا ہو، بلکہ اسی کی لپیٹ میں جمہوری خیالات کی چھوٹی بورژوازی بھی ڈھالنے کے اس عمل کو انجام تک پہنچا چکی ہو۔ فرض کیجئے کہ اگر جرمنی میں جمہوریت پسند چھوٹی بورژوازی اسی رجعت پرست ہجوم سے ہوتی تو یہ کیوں کر ممکن تھا کہ سوشل ڈیموکریٹک ورکرز پارٹی اس کے یعنی عوامی پارٹی کے کاندھے سے کاندھا ملائے برسوں کام کرتی رہتی؟ آپ کا «Volksstaat» (عوامی ریاست) اخبار اپنا تقریباً تمام سیاسی مسالہ چھوٹی بورژوازی کے جمہوری اخبار (۱۶۲) «Frankfurter Zeitung» سے کیسے حاصل کرتا؟ اور یہ کیسے ہوتا کہ اسی پروگرام میں کم از کم سات مطالبے تو وہی شامل ہیں جو براہ راست اور لفظ بلفظ عوامی پارٹی اور چھوٹی بورژوازی والی ڈیموکریسی کے پروگرام سے مطابقت رکھتے ہیں؟ میرا مطلب ہے ان سات سیاسی مطالبوں سے جو نمبر ایک سے نمبر پانچ تک اور ایک سے دو تک موجود ہیں۔ اور ان میں ایک بھی ایسا نہیں جو بورژوا ڈیموکریٹک نہ ہو۔ (۱۶۳)

دوسرے، یہ اصول کہ مزدوروں کی تحریک انٹرنیشنل تحریک ہے، ہر لحاظ سے فی الحال عملی طور پر رد کر دیا گیا، رد کرنے والے بھی وہی لوگ جنہوں نے پانچ سال تک سخت سے سخت آزمائشوں کے سامنے بڑی شان سے اسے سینے سے لگائے رکھا تھا۔ یورپی تحریک میں سب سے آگے جرمن مزدوروں کی پوزیشن بننے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے جنگ کے دوران (۱۶۴) صحیح معنوں میں انٹرنیشنل رویہ اپنائے رکھا، یہ کسی اور ملک کے پرولتاریہ کے بس کی بات نہ تھی۔ اور اب جب کہ تمام دوسرے ملکوں میں جا بجا مزدوروں کی طرف سے تحریک کے اس پہلو پر اتنا ہی زور دیا جانے لگا ہے جتنا حکومتوں کی طرف سے یہ زور دیا جاتا ہے کہ جس تنظیم میں بھی اس کی جھلک نظر آئے، اسے سختی سے کچل دیا جائے، تو اس اصول کے علمبردار ہی اسے رد کرنے چلے ہیں! تو پھر مزدوروں کی تحریک کے انٹرنیشنلزم میں سے کیا باقی بچا؟ ایک دھندلا سا اسکاں رہ گیا، اتنا بھی نہیں کہ کبھی آگے چل کر یورپ کے مزدور اپنے سر کا بوجھ اتارنے کے لئے

باہمی تعاون کریں، بلکہ صرف اتنا کہ آئندہ ”قوموں میں کوئی انٹرنیشنل برادری“ کی صورت بنے، یا اس لیگ والی بورژوازی ”یورپ کی متحدہ ریاستوں“ کی صورت اختیار کر لے۔

یہ سہی کہ انٹرنیشنل کا ذکر کرنے کی یہاں کچھ ایسی ضرورت نہ تھی۔ تاہم ۱۸۶۹ء میں جو پروگرام طے پاچکا تھا اس سے ایک قدم پیچھے ہٹانے کی بھی کیا ضرورت تھی۔ اتنا تو کہنا ہی چاہئے تھا کہ: اگرچہ جرمن مزدور پارٹی اول انہی حدوں کے اندر رہ کر کام کر رہی ہے جو ریاستی سرحدیں مقرر ہیں، (اسے یورپی پرولتاریہ کی طرف سے بولنے کا اور خواہ مخواہ غلط بیانی کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا)، لیکن اسے تمام ملکوں کے مزدوروں سے بھائی چارے کا پورا احساس ہے، اور پہلے کی طرح آئندہ بھی یہی ہوگا کہ جرمن مزدور پارٹی اس برادرانہ احساس کی عائد کی ہوئی ذمہ داریاں ادا کرتی رہے۔ اس قسم کی ذمہ داریاں، خود کو انٹرنیشنل کا شریک سمجھے یا کھلے لفظوں میں اعلان کئے بغیر بھی، باقی رہتی ہیں۔ مثلاً ہڑتالوں میں مدد کرنا اور ہڑتالیں توڑنے والوں کا مقابلہ کرنا، پوری توجہ رکھنا کہ پارٹی کے اخبار و رسائل جرمن مزدوروں کو باہر ملکوں کی تحریک سے باخبر رکھیں، خاندانی بادشاہتوں کے لئے جنگ کے خطرے یا خود جنگ کے خلاف ایجنڈیشن چلانا، اور اگر ایسی جنگیں چھڑ جائیں تو اسی طرح پیش آنا جیسے ۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۱ء وغیرہ میں ایک مقررہ طرز اختیار کیا گیا تھا وغیرہ وغیرہ۔

تیسرے یہ کہ ہمارے لوگوں نے لاسال کے ”اجرتوں کے آہنی قانون“، والے نظریے کو اپنے اوپر سوار کر لیا جس کی بنیاد ایک دقیانوسی معاشی نظریے پر رکھی ہے یعنی مزدوروں کو جس قدر ممکن ہے کم اجرت دی جاتی ہے، وجہ اس کی یہ کہ مالتھوس کے نظریہ آبادی کے مطابق مزدوروں کی تعداد ہمیشہ کافی سے زیادہ رہتی ہے (لاسال نے اسی خیال کو دلیل بنا رکھا تھا)۔ مارکس نے کتاب ”سرمایہ“، میں تفصیل کے ساتھ ثابت کر دیا ہے کہ اجرتوں کے قانون بہت پیچیدہ ہوتے ہیں۔ کبھی ایک قاعدے کا عمل دخل ہوتا ہے، کبھی دوسرے کا۔ حالات کے اتار چڑھاؤ پر منحصر ہے۔ اس لئے انہیں



”آہنی“ کہنے کی گنجائش نہیں، اس کے برعکس نہایت لچکدار کہہ سکتے ہیں۔ لہذا یہ معاملہ چند لفظوں میں ٹال دینے کا نہیں جیسا کہ لاسال سمجھتا تھا۔ مالتھوس نے اس قانون اجرت کے حق میں جو دلیل دی تھی [جسے لاسال نے مالتھوس اور ریکارڈو کے یہاں سے (ریکارڈو کا بیان بگاڑ کر) نقل کر لیا اور جسے دیکھنا ہو تو ”مزدوروں کے مطالعے کی کتاب“ کے صفحہ ۵ پر دیکھا جا سکتا ہے جہاں لاسال کے کسی اور پمفلٹ کے حوالے سے بیان آیا ہے] مارکس نے اپنی تصنیف ”سرمایہ“ کے حصہ »Accumulation of Capital« (سرمائے کا ارتکاز) میں تفصیل سے اس دلیل کا توڑ کر دیا ہے۔ چنانچہ لاسال کا ”اجرت کے آہنی قانون“ والا ٹکڑا اپنا کر ہماری پارٹی نے ایک غلط خیال کو اس کی غلط بنیاد کے ساتھ قبول کیا ہے۔

چوتھے یہ کہ پروگرام نے ایک ہی سماجی مطالبہ بڑھایا اور وہ ہے لاسال کا نظریہ ”سرکاری امداد“، بالکل برہنہ صورت میں، جیسا کہ لاسال نے اسے بیوشے کے یہاں سے اڑایا تھا۔ یہ بھی ایسے وقت جبکہ براکے نے اس مطالبے کی دھجیاں بکھیر دی تھیں (۱۶۵) اور اگر ہماری پارٹی کے سب مقرروں نے نہیں، تو قریب قریب سبھی نے لاسال کے توڑ پر ”سرکاری امداد“ کے اس نظریے کے خلاف زبان کھولی تھی۔ ہماری پارٹی اس سے بڑھ کر اور کیا اپنی تذلیل کر سکتی تھی! انٹرنیشنلزم کو اس کے مقام سے اتار کر اماندوس گیوگ کی سطح پر اور سوشلزم کو اس شخص بیوشے کے بورژوا رہبلکن ازم کی حد تک پہنچا دیا گیا جس نے یہ مطالبہ خود سوشلسٹوں کے مقابلے پر پیش کیا تھا تاکہ انہیں چوٹ دی جا سکے۔

لاسال کے خیال میں ”سرکاری امداد“ کی حیثیت پر زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ منزل تک پہنچنے کی تدبیروں میں سے صرف ایک تدبیر ہے اور یہاں پروگرام کے خاکے میں اسے یوں کچے پن سے پیش کر دیا ”تاکہ سماجی سوال حل کرنے کی راہ تیار کی جائے“، گویا ابھی تک ہمارے سامنے سماجی سوال کا کوئی نظریاتی حل موجود نہیں۔ اب اگر کوئی کہے کہ: ”جرمن مزدور پارٹی صنعت اور

زراعت دونوں میں کوآپریٹو طریقہ پیداوار پورے قومی پیمانے پر جاری کر کے اجرت کا خاتمہ کرنے کے درپے ہے اور یوں طبقاتی اونچ نیچ مٹانا چاہتی ہے؛ اور اس غرض سے جو بھی تدبیر اختیار کرنی پڑے وہ اسے اختیار کرنے کو آمادہ ہے،— تو لاسال کے حاسیوں میں کوئی اس پر انگلی نہیں اٹھا سکتا۔

پانچویں یہ کہ پروگرام کے خاکے میں کہیں اس کا ذکر نہیں کہ مزدور طبقے کی تنظیم بحیثیت طبقے کے ٹریڈ یونینوں کے ذریعے ہو۔ یہی ایک نہایت ضروری نکتہ ہے کیوں کہ ٹریڈ یونین ہی پرولتاریہ کی ایک سچی طبقاتی تنظیم ہوتی ہے جہاں یہ طبقہ سرمائے کے مقابلے پر اپنی روزانہ کی جدوجہد کرتا ہے، جہاں یہ طبقہ اپنی تربیت کرتا ہے اور جو آجکل کے زمانے میں، بدترین رجعت پرستی کے گھیرے میں بھی (جیسا کہ پیرس میں ہو رہا ہے) توڑ پھوڑ کر برابر نہیں کی جا سکتی۔ ٹریڈ یونین تنظیم نے خود جبرنی میں بھی جو اہمیت اختیار کر لی ہے اسے نظر میں رکھیں تو ہماری رائے میں یہ انتہائی ضروری ہے کہ پروگرام میں اس کا ذکر کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو پارٹی تنظیم میں بھی اس کو خاص مقام دیا جائے۔

ہمارے لوگوں نے لاسال والوں کی خوشنودی کے لئے کیا کچھ نہیں کیا! مگر فریق ثانی نے کونسی رعایت کی؟ یہی کہ پروگرام میں خالص جمہوری مطالبوں کے اچھے خاصے الجھاؤں کا انبار نظر آتا ہے، جن میں سے بعض تو فیشن بن چکے ہیں، مثلاً یہ کہنا کہ ”قانون سازی عوامی ہو“۔ سوئٹزرلینڈ میں یہ پہلے سے موجود ہے، اور اگر اس سے کچھ حاصل ہے تو نفع کے بجائے نقصان۔ ”عوام کے ذریعے سرکاری انتظام“، کہا جاتا تو کچھ بات ہوتی۔ ہر قسم کی آزادی کی جو شرط اول ہے کہ تمام سرکاری عہدہ داروں کو اپنے سرکاری فرائض کی ادائیگی میں عام عدالت کے روبرو اور عام قانون کے ماتحت ہر ایک باشندے کے سامنے جوابدہ ہونا چاہئے وہی یہاں غائب ہے۔ رہا یہ امر کہ سائنس کی آزادی اور ضمیر و عقیدے کی آزادی جیسے مطالبے ہر ایک لبرل بورژوا پروگرام میں شامل ہوا



کرتے ہیں اور یہاں ان کی موجودگی عجیب معلوم ہوتی ہے، میں مزید کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

آزاد عوامی ریاست کو بدل کر آزاد ریاست کر دیا گیا۔ اگر قواعد کی رو سے دیکھئے تو آزاد ریاست وہ ہوئی جو اپنے باشندوں کے معاملات میں آزاد ہو، یعنی ایسی اسٹیٹ جس میں جاہلانہ حکومت ہو۔ اسٹیٹ کے بارے میں زبان کھولنی ہی نہ چاہئے تھی، خاص کر پیرس کمیون کے بعد، جو اس لفظ کے خاص معنوں میں ایک ریاست نہیں تھا۔ انارکسٹوں نے لفظ ”عوامی ریاست“ کی دھول ہماری آنکھوں میں بہت جھونک لی۔ اور وہ بھی مارکس کی اس تصنیف (”فلسفے کا افلاس“) کے بعد جو فلسفی پرودہوں کے جواب میں لکھی گئی اور پھر ”کمیونسٹ مینی فیسٹو“، بھی نکلا جو براہ راست یہ جتانے لگا ہے کہ سماج میں اشتراکی نظام قائم ہو جانے کے بعد اسٹیٹ تحلیل ہو کر غائب ہو جائے گی۔ چنانچہ اس صورت میں، جبکہ اسٹیٹ ایک ایسا عارضی ڈھانچہ ہوا جو مقابلے کے وقت انقلاب میں اس غرض سے استعمال کیا جاتا ہے کہ مخالفین کو بزور بازو دبا کر رکھا جائے، تو آزاد عوامی ریاست کی باتیں بگھارنا بالکل بے معنی ہے۔ جب تک پرولتاری طبقے کو اسٹیٹ کی ضرورت رہتی ہے، وہ اسے آزادی کے حق میں استعمال نہیں کرتا بلکہ صرف اس غرض سے کہ مخالفین کو قابو میں رکھا جائے، اور جو نہی آزادی کی بات زبان پر لانا ممکن ہو جاتا ہے، پھر خود اسٹیٹ کا وجود باقی نہیں رہتا۔ اس لئے جہاں لفظ ”اسٹیٹ“، یا ”ریاست“، آیا ہے وہاں ہم پرانے زمانے کا ایک نہایت عمدہ جرمن لفظ ”برادری“ (Gemeinwesen) رکھنا پسند کریں گے جو فرانسیسی لفظ ”کمیون“، کا ہم معنی ہے۔

”ہر قسم کی سماجی اور سیاسی نابرابری مٹا دینا“، یہ جملہ بھی بحث طلب ہے۔ اس کی جگہ ”تمام طبقاتی اونچ نیچ کا خاتمہ“، ہونا چاہئے تھا۔ زندگی کے حالات دیکھتے ہوئے، ایک ملک کی دوسرے ملک سے، ایک صوبے کی دوسرے سے، ایک علاقے کی دوسرے سے، نابرابری ایک حد تک ہمیشہ باقی رہے گی۔ یہ فرق کم سے کم تو کرنا ممکن ہے، مگر پوری طرح مٹا دینا ممکن نہیں۔ پہاڑی باشندے

میدان کے بسنے والوں سے زندگی کے حالات میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ مختلف رہیں گے۔ یہ خیال کہ اشتراکی سماج مساوات کی آماجگاہ ہوتا ہے، یہ وہ ایک طرفہ خیال ہے جس کی بنیاد اسی پرانے فرانسیسی قول ”آزادی، برابری اور برادری“ پر رکھی ہے۔ یہ خیال اپنے وقت اور مقام کی نسبت سے، ترقی کے خاص مرحلے پر تو برحق تھا۔ لیکن پہلے کے اشتراکی مکاتیب فکر سے آئے ہوئے اور بہتیرے یک طرفہ خیالات کی طرح اب اسے بھی ناکارہ سمجھنا چاہئے، کیوں کہ اب اس سے لوگوں کے دماغ میں الجھن پیدا ہوتی ہے اور پھر یہ بھی کہ اب اصل معاملے کو پیش کرنے کے بہتر ذریعہ اظہار ہاتھ آچکے ہیں۔

میں یہیں تمام کرتا ہوں، اگرچہ اس پروگرام کا تقریباً ہر لفظ، جو ویسے ہی بجھی ہوئی اور سپاٹ زبان میں تحریر ہوا ہے، اس قابل ہے کہ تنقید کا نشانہ بنے۔ یہ اس قسم کا پروگرام ہے کہ اگر اسے قبول بھی کر لیا جائے تو مارکس اور میں ہرگز اس نئی پارٹی میں شامل نہ ہوں جو اس پروگرام کی بنیاد پر بنائی جائے اور واقعی سنجیدگی سے اس سوال پر غور کریں کہ ایسی پارٹی سے عام پبلک میں بھی کس طرح کا واسطہ رکھا جائے۔ تم یہ ذہن میں رکھنا کہ جرمن سوشل ڈیموکریٹک ورکرز پارٹی کے ہر ایک قول و فعل کا غیر ملکوں میں ہم کو ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ باکونین نے اپنی تصنیف ”ریاستی حیثیت اور نراج“، میں ہم کو بے خیالی سے کہے ہوئے اس ایک ایک لفظ کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے جو لیکنیخت نے رسالہ (۱۶۶) »Demokratisches Wochenblatt« کی بنیاد پڑنے کے بعد سے اب تک کہا یا لکھا ہے۔ لوگوں نے اپنی جگہ سوچ رکھا ہے کہ ہم یہاں بیٹھے بیٹھے ساری تحریک کے تار ہلا رہے ہیں، حالانکہ سیری طرح تم پر بھی یہ حقیقت روشن ہے کہ ہم نے پارٹی کے اندرونی معاملات میں غالباً کبھی زرا دخل اندازی نہیں کی اور کبھی دخل دیا بھی تو صرف اسی غرض سے کہ ان غلطیوں کی اصلاح کر دی جائے جو ہماری نظر میں غلطیاں تھیں اور صرف نظریاتی۔ لیکن خود تمہارے سوچنے کی بات ہے کہ یہ پروگرام ایسا ایک موڑ ہے جہاں پہنچ کر،



ہم آسانی سے مجبور ہو جائیں گے کہ جو پارٹی یہ پروگرام قبول کرے اس کی کسی قسم کی ذمہ داری لینے سے انکار کر دیں۔  
یوں تو کسی پارٹی کے باقاعدہ پروگرام کی اہمیت اس کے عمل کے مقابلے میں کم ہے، تاہم نیا پروگرام ایک ایسا پرچم ہے جو پبلک کے سامنے بلند کیا جاتا ہے اور باہر کی دنیا اسی پروگرام سے پارٹی کا اندازہ لگاتی ہے۔ لہذا اسے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹانا چاہئے جیسا کہ یہ مسودہ آئری ناخ کے پیش کئے ہوئے پروگرام کے بنسبت پیچھے ہٹ رہا ہے۔ اور یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ دوسرے ملکوں کے مزدور یہ پروگرام دیکھ کر کیا کہیں گے اور پورے جرمن اشتراکی پرولتاریہ نے جو لاسال والوں کے نظریے کے سامنے گھٹنے ٹیک دئے ہیں اس پر دنیا کیا سوچے گی۔

ساتھ ہی میں قائل ہو گیا ہوں کہ اس بنیاد پر جو اتحاد قرار پائے گا وہ سال بھر بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ کیا ہماری پارٹی کے بہترین دماغ اس پر تیار ہو جائیں گے کہ اپنی تقریروں میں لاسال کے رئے ہوئے جملے ”اجرت کے آہنی قانون“، اور ”سرکاری امداد“ کے بارے میں بار بار دہراتے پھریں؟ مثلاً میں تصور کرتا ہوں کہ خود تم پر اس صورت میں کیا گزرے گی۔ اور اگر وہ یہ سب باتیں کہنے پر تیار بھی ہو گئے تو حاضرین ان کا ناطقہ بند کر دیں گے۔ مگر مجھے یہ بھی یقین ہے کہ لاسال کے حامی پروگرام کے انہی نکتوں پر اصرار کریں گے جیسے یہودی شائی لاک نے ایک پونڈ گوشت کی رٹ لگائی تھی\*۔ آخر طلاق کی نوبت آئے گی۔ مگر تب تک ہاسسپل مان، ہیزن کلیور، تیولکے قسم کے لوگوں کو ہم پھر ”ایماندار“ بنا چکے ہوں گے۔ جب جدائی کا لمحہ آئے گا تو ہم کمزور ہو چکے ہوں گے اور لاسال والے مضبوط۔ ہماری پارٹی کی سیاسی آبرو لٹ چکی ہوگی اور وہ کبھی اس قابل نہ ہوگی کہ لاسال کے ان مقررہ جملوں کے مقابلے پر

\* شیٹکسپیر کا ڈرامہ ”وینس کا تاجر“، ایکٹ اول، سین ۳۔  
(ایڈیٹر)

تن من سے سامنے نکل آئے جن جملوں کو وہ کسی وقت اپنے جھنڈے پر چڑھا چکی ہے۔ اور پھر اگر لاسال کے حامیوں نے زبان کھولی کہ وہی سب سے کھرے نکلے اور وہی اصل میں مزدوروں کی پارٹی ہیں حالانکہ دوسرے لوگ بورژوا خیالات رکھتے ہیں، تو ان کی بات ثابت کرنے کو پروگرام موجود ہوگا؛ اس پروگرام میں جتنا کچھ اشتراکی عنصر ہے وہ تو ان کا ٹھہرے گا اور ہماری پارٹی نے اس میں جو کچھ ملایا وہ چھوٹی بورژوازی کی جمہوریت کے مطالبے رہ گئے یعنی اس طبقے کے جسے یہ پارٹی اسی پروگرام میں پہلے سے ”رجعت پرست ہجوم“ قرار دے چکی ہے۔

میں نے یہ خط روک رکھا کیوں کہ تم پہلی اپریل کو ہی بسمارک کی سالگرہ کی خوشی میں قید سے چھوٹنے والے تھے اور میں چوری چھپے جیل کے اندر خط بھیجنے کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔ اتنے میں ایک خط براکے کا موصول ہوا ہے جس میں انہوں نے بھی پروگرام کے متعلق اپنے وزنی شکوک ظاہر کئے ہیں اور ہماری رائے معلوم کرنی چاہی ہے۔ لہذا میں یہ خط انہی کو بھیجے دیتا ہوں کہ وہ پڑھ کر آگے بڑھا دیں اور مجھے پھر سے یہ سب باتیں لکھنی نہ پڑیں۔ یہاں اتنا اور بڑھادوں کہ میں نے رام (Ramm) کو بھی یہ احوال کھلے لفظوں میں بتا دیا ہے۔ لیکن سخت کو البتہ مختصراً لکھا ہے۔ ان کی یہ خطا معاف نہیں کروں گا کہ ہمیں اس تمام معاملے سے بالکل بے خبر رکھا، ایک لفظ بھی اس وقت تک نہ لکھا (حالانکہ Ramm اور دوسرے لوگ سوچتے رہ گئے کہ ہمیں اس نے پوری پوری اطلاع بھیجی ہوگی) جب تک کہ وقت نہ نکل گیا۔ مگر یہ کوئی نئی بات نہیں، اس کا معمول یہی رہا ہے۔ اسی وجہ سے مارکس اور میں، ہم دونوں کی اس سے اتنی ساری خط و کتابت میں تلخی رہی ہے۔ اس بار تو بہت ہی بری حرکت کی۔ اور ہم اسے گلے اتارنے کو قطعی تیار نہیں ہیں۔



کچھ ایسی تدبیر کرو کہ گرمیوں کا موسم یہاں گزرے، میرے پاس ٹھہرو گے اور اگر موسم خوشگوار رہا تو ہم دو چار دن کے لئے سمندر میں غوطے لگانے چل دیں گے۔ لمبی قید کاٹنے کے بعد یہ وقت تمہارے لئے بہت مفید رہے گا۔

دوستانہ سلام،

تمہارا ایف۔ ای۔

مارکس نے حال میں ہی مکان بدل لیا ہے۔ اب ان کا پتہ یہ ہے :  
۳۱، میٹلینڈ پارک، نارتھ ویسٹ، لندن۔

اصل مسودے کے مطابق  
شائع کیا گیا۔

پہلی بار اس کتاب  
میں شائع ہوا : اے۔ بیبل  
”میری زندگی سے“  
(Aus meinem Leben) جلد ۲،  
اشٹونگارٹ، ۱۹۱۱ء۔

## فریڈرک اینگلز

### ”فطرت کی جدلیات“ کا تعارف ۱۶۷

۱۴۵۰

عہد قدیم کے زبردست نیچرل فکری وجدان، اور عربوں کی انتہائی اہم مگر بکھری ہوئی دریافتوں کے مقابلے میں، جو بار آور ہونے سے پہلے ہی ناپید ہو گئیں، صرف جدید نیچرل سائنس نے علمی، باقاعدہ، اور ہر پہلو سے ترقی کی منزلیں طے کی ہیں۔ اس موجودہ قدرتی سائنس کی شروعات، ساری تازہ ترین تاریخ کی طرح اسی زبردست دور سے ہوتی ہے جسے ہم جرمن لوگ، اس زمانے میں آئی ہوئی قومی آفت کی نسبت سے دور اصلاح (Reformation) کہتے ہیں، فرانسیسی اسے Renaissance (نشاة ثانیہ) اور اطالوی \* Cinquencento کا نام دیتے ہیں، اگرچہ ان میں سے کوئی نام بھی پورا حق ادا نہیں کرتا۔ یہ وہ دور ہے جو پندرھویں صدی کے دوسرے ادھے سے ظہور میں آنے لگا تھا۔ شاہی نے شہری چودھریوں کا سہارا لے کر جاگیردار امرا کی طاقت توڑ ڈالی اور ان بڑی بڑی بادشاہیوں کو جنم دیا جو دراصل قومیتوں پر قائم ہوئی تھیں اور جن میں سے آج کل کی یورپی قوموں اور موجودہ بورژوا سماج نے ابھرنا شروع کیا۔ اور اس وقت جبکہ شہر کے چودھری اور امرا ایک

\* Cinquencento — لفظی معنی پنج صدسالہ، مطلب سولہویں صدی۔ (ایڈیٹر)



دوسرے سے دست و گریباں تھے، جرمن کسانوں کی جنگ نے طبقاتی جنگ کی ہوا کا رخ دکھا دیا کیوں کہ یہاں صرف باغی کسان ہی میدان میں نہیں اترے، ایسا ہونا کوئی نئی بات نہیں تھی، بلکہ ان کے پیچھے پیچھے وہ مزدور بھی، جنہیں آج کے پرولتاریہ کا پیشرو کہنا چاہئے، ہاتھوں میں لال جھنڈے، اور زبانوں پر مشترکہ ملکیت کے نعرے لٹے ہوئے نکل پڑے۔ بازنطینی زوال سے جو مسودے بچ رہے اور روم کے کھنڈروں سے جو قدیم سورتیاں ہاتھ لگیں، انہوں نے حیرت زدہ مغرب کو ایک نئی دنیا کا جلوہ دکھا دیا؛ یہ دنیا ہے یونان قدیم جس کے تابندہ چہروں کے سامنے قرون وسطیٰ کی پرچھائیاں ہوا ہو گئیں۔ اٹلی میں آرٹ نے وہ فروغ پایا کہ قدیم کلاسیکی جھلک نظر آنے لگی، نہ پہلے کبھی اس کا وہم و گمان تھا، نہ اس کے بعد کبھی وہاں تک نوبت پہنچی۔ اٹلی، فرانس اور جرمنی میں بالکل نیا ادب ابھرا جو نئے زمانے کا پہلا ادب تھا۔ ان کے فوراً بعد انگریزی اور اسپینی ادب کے کلاسیکی دور شروع ہوئے۔ پرانے حصار \* ٹوٹ گئے۔ اب جاکر کہیں روئے زمین کی دریافت ہوئی اور وہ زمین ہموار ہوئی جس پر آگے چل کر عالمی تجارت کھڑی ہو اور دستکاری کی جگہ مینوفیکچر (صنعتی سرگرمی) آئے، جو اور بڑھی تو آجکل کی بڑے پیمانے کی صنعت کا نقطہ آغاز ثابت ہوئی۔ کلیسائی نظام کی روحانی ڈکٹیٹری ٹوٹ پھوٹ گئی۔ اسے جرمن قوموں کی اکثریت نے سیدھے سیدھے اتار کر پھینک دیا اور پروٹسٹنٹ عقیدہ اختیار کر لیا اور لاطینی قوموں میں زندگی سے سرشار آزاد خیالی کا وہ تخم جڑ پکڑ گیا جو عربوں سے پہنچا تھا اور جسے نو دریافت فلسفہ یونان نے پروان چڑھایا تھا؛ اس نے اٹھارویں صدی کے فلسفہ مادیت کے لئے فضا ہموار کر دی۔

ترقی کی طرف یہ زبردست انقلاب تھا جو عالم انسانیت پر پہلے کبھی نہیں گزرا تھا، ایسا دور جس کا تقاضا تھا کہ دیوقامت لوگ سامنے آئیں اور اس نے خود دیوقامت لوگ پیدا کئے، خیال، جذبے

\* حصار کی جگہ یہاں اینگلز نے قدیم رومن لفظ orbis terrarum استعمال کیا ہے، یعنی روئے زمین۔ (ایڈیٹر)

اور کردار کے لحاظ سے بھی، پہلوداری اور علم و آگاہی کے اعتبار سے بھی۔ وہ لوگ جنہوں نے بورژوازی کے اقتدار کی بنیاد رکھی، ان میں جو بھی خاصی ہو، البتہ بورژوا تنگ نظری نہیں تھی۔ اس کے برعکس وہ لوگ اپنے دور کے لحاظ سے زبردست اور وسیع حوصلہ مندی کے جذبے میں سرشار تھے۔ اس زمانے کے لوگوں میں شائد ہی کوئی ایسا اہم آدمی گزرا ہو جس نے ملکوں ملکوں کی خاک نہ چھانی ہو، جسے چار پانچ زبانوں کی مہارت نہ رہی ہو اور جو زندگی کے کئی میدانوں میں اپنی آب و تاب نہ دکھا چکا ہو۔ لیوناردو داوینچی صرف ایک عظیم مصور ہی نہیں تھا بلکہ اعلا درجے کا ماهر ریاضی، مستری اور انجنیر بھی تھا جس کی بدولت علم طبیعیات (فزیکس) کی مختلف شاخوں میں کئی اہم دریافتیں حاصل ہوئیں۔ البرخت دیوریر مصور بھی تھا، نقاش بھی، سنگ تراش اور ماهر تعمیر بھی۔ ان سب صفات کے علاوہ اس نے قلعہ بندی کا ایک ایسا سسٹم ایجاد کیا جس میں بہت سے ان خیالات نے جگہ پائی جنہیں آگے چل کر مونتالیمر نے اپنایا اور قلعہ بندی کے موجودہ جرمن علم نے اختیار کر لیا۔ میکاویلی ایک مدبر، مورخ، شاعر ہونے کے علاوہ آج کے زمانے کا سب سے پہلا قابل قدر فوجی مصنف تھا۔ لوتھر نے صرف کلیسائی نظام کے اوجیائی اصطبل (۱۶۸) کی پرانی گند نہیں دھوئی بلکہ جرمن زبان کو بھی پاک صاف کیا، جدید جرمن نثر کی داغ بیل ڈالی، بلکہ فتح کے شادیانوں کی وہ دھن بنائی اور اس کے بول لکھے جو سولہویں صدی کا ”مارسیلیز گیت“، بن کر دلوں میں اتر گئے (۱۶۹)۔ اس زمانے کے سورما ابھی تقسیم محنت کے بندھن میں نہیں پھنسے تھے جو آدمی کو پابند کر کے صرف ایک انگی چیز پیدا کرنے کے قابل چھوڑتے ہیں اور جو بعد والوں میں اس قدر عام ہو گئے۔ جو خصوصیت ان پہلے کے لوگوں میں خاص طور سے ابھری دکھائی دیتی ہے، وہ یہ کہ قریب قریب سبھوں نے اپنے زمانے کی تحریکوں میں اور عملی کشمکش میں رہ کر زندگی اور سرگرمی کے جوہر دکھائے؛ انہوں نے کسی نہ کسی فریق کی طرفداری بھی کی اور جنگوں میں شرکت بھی، ایک نے زبان سے، دوسرے نے قلم سے، اور کسی نے تلوار سے اور بہتوں نے تیغ و قلم



دونوں سے۔ اسی لئے ان کے کردار بھر پور ہیں اور ان میں وہ جان ہے جس سے وہ ہورے آدمی بنے ہیں۔ سطلعے کے بند کمرے کے عالم صرف شاذ و نادر ملیں گے؛ ان میں یا تو دوسرے تیسرے درجے کے لوگ ہوں گے یا محتاط قسم کے وہ تن آسان جو اپنے اوپر آنچ نہیں آنے دیتے۔

اس زمانے میں عالم فطرت کی چہان بین بھی عام انقلاب کی لپیٹ میں بڑھتی جا رہی تھی اور خود بھی پوری طرح انقلابی تھی کیوں کہ اسے زندہ رہنے کے حق کی خاطر لڑنا تھا اور یہ حق جیتنا تھا۔ جدید فلسفے کی ابتدا کرنے والے ان زبردست اطالویوں کے ساتھ ساتھ اس سائنس نے اپنی جانوں کی بازی لگا دینے والے بھی مہیا کئے اور بدعقیدگی کی (Inquisition) سزائیں کاٹنے والے بھی۔ یہ خصوصیت دیکھنے قابل ہے کہ پروٹسٹنٹ عقیدے والوں نے فطرت کی آزادانہ تلاش کا ناطقہ بند کرنے میں کتھولکوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ کالوین نے سرویس کو اس وقت زندہ جلوا دیا جب وہ دوران خون دریافت کرنے کے قریب پہنچ چکا تھا، اور دو گھنٹے تک اسے آگ میں جلتا رکھا، حالانکہ Inquisition کے حامیوں نے جیوردانو برونو کو پھونک ڈالنے پر ہی اکتفا کی تھی۔

وہ انقلابی عمل جس سے عالم فطرت کی تحقیقات نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا، اور لوتھر نے جو پاپائے روم کے Bull کو جلتی آگ میں ڈالا تھا، اسی کو گویا دھرا دیا، وہ اس زندہ جاوید تصنیف کی اشاعت تھی جس میں کوپرنیکس نے، دیے لفظوں میں اور مرتے دم ہی سمی، تاہم فطرت کے معاملات و مسائل میں کلیسائی اختیار کو چیلنج کر دیا (۱۷۰۰)۔ عالم فطرت کی سائنس کا دینیات کے بار سے سبکدوش ہونا اسی دن سے شروع ہوا، اگرچہ ان دونوں کے درمیان دعویٰ اور جواب دعویٰ کا سلسلہ ہمارے زمانے تک چلتا رہا اور بعض دماغ تو آج تک اس مخمضے سے آزاد نہیں ہو سکے ہیں۔ بہر حال تبھی سے سائنسوں کی ترقی نے لمبے لمبے ڈگ بھرنے شروع کر دیے تھے اور یوں کہنا چاہئے کہ جہاں سے قدم بڑھایا تھا (وقت کے حساب سے) چوکور فاصلے نسبتاً بہت تیزی سے طے کرنے میں جان پڑ گئی۔

گویا ساری دنیا کو دکھا دینا تھا کہ آج سے نامیاتی مادے کی سب سے اعلا پیداوار، یعنی انسانی دماغ کے لئے صرف حرکت و رفتار کا قانون ہی اصل قانون ہے اور یہ غیرنامیاتی مادے کی حرکت و رفتار کے بالکل برعکس ہے۔

قدرتی علوم کی ترقی کے جس دور کی اب شروعات ہوئی، اس میں سب سے بڑا کام یہ تھا کہ سردست جو مادہ موجود ہے، اس پر قابو پایا جائے۔ اکثر شعبوں میں بالکل الف ب سے ابتدا کرنی تھی۔ زمانہ قدیم نے اقلیدس کی تحقیقات اور بطلمیوس کا نظام شمسی وراثت میں چھوڑا تھا؛ عربوں نے اعداد و شمار کا نظام اعشاریہ، ابتدائی الجبرا (الجبر و المقابله)، جدید ہندسہ اور علم الکیمیا دیا تھا؛ مسیحی قرون وسطیٰ نے کچھ بھی نہیں چھوڑا تھا۔ ایسی صورت حال میں اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ قدرتی علوم میں سب سے ابتدائی مسائل کو اول جگہ دی جائے، یعنی اجسام ارضی اور اجرام فلکی کے قانون حرکت و کشش کا پتہ لگایا جائے، اور اس تحقیق میں خدمت لینے کی خاطر اسی کے ساتھ علم الحساب کے قاعدوں قرینوں کی دریافت اور ان کی تکمیل کی جائے۔ یہاں بڑا میدان مارا گیا۔ اس دور کے ختم ہوتے ہوتے، جس دور کو نیوٹن اور لینیٹی کے ناسوں سے پہچانا جا سکتا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ علم الحساب کی شاخیں کافی پروان چڑھ چکی ہیں۔ حسابی طریقوں میں جن کی حیثیت بنیادی تھی، ان کا خاکہ بن کر تیار ہو چکا ہے: تجزیاتی جیومیٹری کو بڑی حد تک ڈیکارٹ نے، منطقی ریاضی کو نیوٹن نے، تفریقی اور ترکیبی علم الحساب کو لیبنز اور غالباً نیوٹن نے تیار کر دیا ہے۔ ٹھوس اجسام کی حرکیات معلوم کرنے کے بارے میں بھی یہی کہنا درست ہوگا، کیوں کہ اس کے بھی اصل اصول ہمیشہ کے لئے وضع ہو گئے۔ آخر نظام شمسی کے علم فلکیات میں کیپلر نے سیاروں کی حرکت کے قاعدے قانون دریافت کر لئے اور نیوٹن نے انہیں مادے کی حرکت کے عام اصولوں کے نقطہ نظر سے ایک شکل عطا کر دی۔ قدرتی علوم کی دوسری شاخیں ابھی ترتیب و تکمیل کے اس ابتدائی مرحلے پر پہنچنے سے بھی رہ گئی تھیں۔ کہیں اس دور کے خاتمے پر رقیق اور ابخراتی اجسام (gaseous bodies)



کی حرکیات پر کچھ قابل قدر تحقیقات ہوئی \*۔ خاص طبیعیات کا علم جہاں سے چلا تھا، وہیں رکا رہا، بشرطے کہ اس میں علم ہئیت کی ضرورت سے ہونے والی ان بے مثال ترقیوں کو شمار نہ کیا جائے جو دوربینی (optics) کے شعبے میں ہوئی تھیں۔ Phlogistic نظریے (۱۷۱۰ء) کے ذریعے جدید کیمسٹری نے پرانے علم الکیمیا سے جان چھڑانے کی ابھی ابتدا ہی کی تھی۔ علم طبقات الارض ابھی تک معدنیات کے تشکیلی دور میں پڑا تھا، چنانچہ palaeontology کے پیدا ہونے کا وقت ہی نہیں آیا تھا۔ آخر علم حیات (بایولوجی) کے شعبے میں ابھی یہی دقت طلب سوال درپیش تھا کہ صرف علم نباتات اور حیوانات میں ہی نہیں بلکہ تشریح اعضا (اناٹومی) اور جسمانیات (فزیالوجی) میں بھی جو بے پناہ ذخیرہ بکھرا پڑا ہے، اسے جمع کر کے چھانا پھٹکا جائے۔ ابھی اس بحث کی گنجائش کہاں تھی کہ زندگیوں کی جو مختلف شکلیں ہیں ان کے درمیان موازنہ ہو، ان کی جغرافیائی خانہ بندی کا پتہ لگایا جائے اور آب و ہوا وغیرہ کے مطابق بود و باش کی درجہ بندی معلوم کی جائے۔ لینی کی بدولت صرف نباتیات (بوٹانی) اور حیوانیات (زولوجی) کے علم میں کسی قدر درست نتیجوں تک رسائی ہوئی تھی۔

لیکن زیر نظر دور کی نمایاں خصوصیت کوئی ہے تو یہ کہ اپنی قسم کا ایک ایسا عالمی نقطہ نظر ابھرا جس نے عالم فطرت کے قطعی ناقابل تبدیل ہونے کو مرکزی خیال ٹھہرایا۔ خود فطرت چاہے کیسے ہی عالم وجود میں آئی ہو لیکن جب آپکی تو جب تک موجود ہے، جون کی توں رہے گی۔ سیارے اور ان کے تابع سیارے ایک دفعہ کسی پراسرار ”پہلے جھٹکے“ سے حرکت میں آنے کے بعد ابدالاباد تک یوں ہی اپنی مقررہ راہ پر گھومتے رہیں گے، یا جب تک ہر ایک شے کا خاتمہ نہ ہو جائے تب تک یہ حرکت قائم رہے گی۔ ستارے اپنی

\* اینگلز نے مسودے کے حاشیے پر پنسل سے یہ لفظ بڑھائے ہیں : ”توری چیلی نے پہاڑی دھاروں کی رفتار کے قاعدے کے سلسلے میں جو کام کیا،“۔ (ایڈیٹر)

اپنی جگہ یوں ہی ہمیشہ سے ٹنکے ہوئے ہیں اور ایک ”عام جذب باہم“ کے اثر سے یہ ”محفل انجم“، ایک دوسرے کو تھامے ہوئے ہے۔ زمین بغیر کسی ادل بدل کے ہمیشہ سے یا آپ چاہیں تو کہہ لیجئے کہ تخلیق کے روزاول سے یونہی چلی آرہی ہے۔ آج کے ”پانچوں براعظم“، ہمیشہ سے تھے اور ان میں سدا سے یہی پہاڑ تھے، یہی وادیاں اور دریا، یہی آب و ہوا اور یہی منظر اور پھل پھول، سوائے اس کے کہ انسانی ہاتھ نے کچھ تبدیلیاں اور مقام کی ادل بدل کر دی ہو۔ اپنے ظہور کے ساتھ ہی پودوں اور جانوروں کی یہ قسمیں ہمیشہ کے لئے قرار پا گئی تھیں۔ ایک ڈھب کی چیز سے ہمیشہ اسی ایک ڈھب کی چیز پیدا ہوتی رہی ہے۔ لینی نے یہ گنجائش رکھ کر بہت بڑی چھوٹ دے دی کہ ممکن ہے نسلوں یا تخموں میں پیوند لگنے کی بدولت کچھ نئی قسمیں بھی پیدا ہوئی ہوں۔ نسل انسانی کی تاریخ جو وقت (زمان) کی بساط پر بڑھتی پھیلتی گئی ہے، اس کے برخلاف فطرت کی تاریخ کا پھیلاؤ صرف مقام (مکان) کی بساط پر بیان کیا گیا۔ فطرت میں ہر قسم کی تبدیلی، ہر طرح کی ترقی سے انکار کیا گیا۔ قدرتی سائنس جو شروع سے اس قدر انقلابی تھی، اچانک سراسر کٹر فطرت سے اس کا واسطہ پڑا جہاں آج بھی ہر شے اسی نہج پر ہے جس پر وہ ابتدا سے تھی اور جس میں ابد تک، یا قرون اور صدیوں تک ہر شے ویسی ہی رہے گی جیسی وہ ازل میں تھی۔

اٹھارویں صدی کے پہلے ادھے کی قدرتی سائنس اپنے علم و خبر کی وسعت میں اور سروسامان کی چھان پھٹک میں قدیم یونان سے جس درجہ بلند تھی، وہ اس کی نظریاتی تسخیر میں، اور فطرت کے متعلق عام نقطہ نظر میں اتنی ہی پست نکلی۔ یونانی فلاسفہ سمجھتے تھے کہ یہ دنیا دراصل کچھ ایسی ہے کہ افراتفری میں سے نکلی، کچھ ایسی کہ ابھر کر یہاں تک پہنچی اور یہاں پہنچ کر ٹھہری ہے۔ لیکن زیر نظر دور کے قدرتی سائنس دان کے نزدیک دنیا ایک ہڈیالی چیز تھی، جس میں مزید تبدیلی کی گنجائش نہ ہو اور بہتوں کی نظر میں وہ ایک دم وجود میں آئی ہوئی شے تھی۔ سائنس کے قدم ابھی تک دینیات میں دھنسے ہوئے تھے۔ وہ ہر طرف تلاش کرتی ہے اور اسے کہیں



باہر سے دیا ہوا کوئی جھٹکا حرف آخر کی طرح سجھائی دیتا ہے جس کا جواب فطرت کے پاس نہیں ہے۔ اگر مادے کی اصل خاصیت اس کشش کو قرار دیا جائے جسے نیوٹن نے ”عام جذب باہم“ کا شاندار نام دیا تھا تو سوال یہ ہے کہ فہم سے بالاتر اس بے تحاشا قوت کا سرچشمہ کہاں ہے جس نے سیاروں کے مدار معین کئے؟ پودوں اور حیوانوں کی یہ بے شمار نوعیں کہاں سے وجود میں آگئیں؟ خاص کر انسان کہاں سے وجود میں آگیا جس کے متعلق یہ قطعی طے ہے کہ ازل سے موجود نہیں تھا۔ اس طرح کے سوالوں پر قدرتی سائنس کے جواب کی تان ضرورت سے زیادہ یہاں ٹوٹتی رہی کہ سب کے خالق پر ذمہ داری ڈال دی جائے۔ اس دور کے آغاز میں ہی کوپرنیکس نے تمام دینیات (۱۵۲۰) سے دامن پاک کر لیا تھا؛ نیوٹن نے اس دور کو تمام کرتے وقت کسی پہلے غیبی جھٹکے کے آگے سپر ڈال دی۔ عام خیال نے جو سب سے زیادہ بلند پروازی دکھائی تو نیچرل سائنس یہاں تک پہنچی کہ فطرت کے قاعدوں قرینوں میں کسی مقصد کی کارفرمائی ہے، یہ وولف کا بے تہہ فلسفہ مقصدیت (Teleology) (۱۷۳۰) تھا، جس کے مطابق بلی اس لئے وجود میں آئی کہ چوہے کھائے اور چوہے اس لئے کہ بلی کی خوراک بنیں، اور سارا عالم فطرت اس لئے کہ اپنے خالق کی دانائی ثابت کرے۔ بہر حال اس دور کے فلسفے کو داد دینی چاہئے کہ قدرتی سائنس کا علم اپنے وقت میں اتنا مہرود ہوتے ہوئے بھی وہ راہ سے بے راہ نہیں ہوا اور فلسفی اسپینوزا سے لے کر عظیم الشان فرانسیسی مادیت پسندوں تک فلسفہ برابر اسی کوشش میں لگا رہا کہ دنیا کا راز خود دنیا کے اندر سے کھوجے اور تفصیلات کے پیچ معلوم کرنا مستقبل کی قدرتی سائنسی تحقیقات پر چھوڑ دے۔

میں نے اٹھارویں صدی کے مادیت پسندوں کو اس دور میں یوں شامل کیا کہ قدرتی سائنس کے جس سروسامان کا ذکر اوپر آچکا ہے، انہیں اس کے سوا اور کچھ نہیں ملا تھا۔ کانٹ فلسفی کا عہد آفریں کارنامہ ان کے لئے ایک راز رہا اور لپلاس فلسفی ان کے کافی زمانے بعد ظاہر ہوا (۱۷۸۴)۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اگرچہ سائنس کی ترقی نے فطرت کے متعلق ان تمام بوسیدہ نظریوں کو چھلنی کر دیا

تھا، پھر بھی انیسویں صدی کا پہلا ادھا انہی کے زیر اثر رہا \* اور اصلیت یہ ہے کہ آج بھی تمام اسکولوں میں انہی بوسیدہ نظریوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ \*\*

فطرت کے متعلق اس بے روح نظریے کی چٹان پر پہلا شگاف کسی قدرتی سائنس دان نے نہیں بلکہ ایک فلسفی نے ڈالا۔ ۱۷۵۰ء میں کانٹ کی تصنیف ”قدرت کی عام تاریخ اور نظریہ غیب“، سامنے آئے ہی پہلے جھٹکے والا مسئلہ تو مسمار ہو گیا؛ زمین اور نظام شمسی کا

\* حاشیے پر اینگلز کا نوٹ: ”عالم فطرت کے متعلق پرانے نظریے کی سخت گیری نے تمام نیچرل سائنس کو ایک اکائی کی حیثیت سے سمجھنے کی بنیاد ڈال دی، فرانسیسی انسائیکلوپیڈسٹوں (قاموسیوں) (۱۷۵۰) کے ذریعے الگ الگ پہلوؤں سے اور پھر بیک وقت سین سائن اور جرمن فلسفہ فطرت کے ذریعے، جسے بعد میں ہیگل نے مکمل کیا،“ (ایڈیٹر) \*\* ایک ایسا شخص جس کی اپنی سائنسی کاوشوں اور کوششوں نے اس نظریے کو دفن کرنے کے لئے اتنا اہم سالہ اکٹھا کر دیا تھا، وہ خود ۱۸۶۱ء تک اسی پرانے نظریے کی رٹ کیسے لگائے رہا، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل کلاسیکی لفظوں سے ہو سکتا ہے:

”جہاں تک ہمارا ذہن کام کرتا ہے، ہمارے نظام شمسی کی ترکیب و ترتیب کا مقصد یہ ہے کہ جو موجود ہے، اسے برقرار رکھا جائے اور یوں ایک ناقابل تبدیل سلسلہ چلتا رہے۔ جس طرح قدیم سے آج تک کوئی پودا، کوئی حیوان زیادہ مختلف اور زیادہ مکمل نہیں ہوا، جس طرح ہم تمام جانداروں کو ایک دوسرے کے ساتھ نہ کہ ایک دوسرے کے بعد مختلف منزلوں پر پاتے ہیں، جس طرح خود ہماری نسل آدم ہمیشہ سے اپنی جسمانی ساخت میں ایک ہی وضع پر رہی ہے، اسی طرح اجرام فلکی میں چاہے جس قدر فرق ہوا ہو، ہمارا یہ سوچنا غلط ہوگا کہ یہ اجرام نشو و نما کے صرف مختلف مرحلوں میں ہیں۔ اس کے برخلاف صحیح بات یوں ہوگی کہ ہر شے جو وجود میں آئی، اپنی جگہ مکمل ہے،“ (میلڈر ”آسان فلکیات“، برلن، ۱۸۶۱ء، پانچواں ایڈیشن، صفحہ ۳۱۶)۔



معاملہ اس طرح سامنے آیا کہ وقت کے ساتھ ان کا ظہور ہوا ہے۔ اگر قدرتی سائنس دانوں کی بھاری اکثریت نے اس خیال پر اتنی ناک بھوں نہ چڑھائی ہوتی جو نیوٹن نے اس وارننگ میں ظاہر کیا تھا کہ ”طبیعیات، زرا مابعد الطبیعیات سے ہوشیار رہنا!“، (۱۷۶) تو وہ کانٹ کے اسی ایک زبردست ذہنی کارنامے سے ایسے نتیجے ضرور نکال لیتے جو انہیں بے سری بھول بھلیوں میں پڑنے سے بچا لیتے اور گمراہیوں میں جو بے شمار وقت اور محنت کی بربادی ہوئی، اس کی نوبت نہ آتی۔ کیوں کہ کانٹ کی دریافت سے اتنا تو ہوا کہ آئندہ قدم بڑھانے کا نقطہ آغاز مل گیا۔ اگر زمین کوئی ایسی چیز ہے جو ابھر کر نکھر کر وجود میں آئی تو پھر اس کی موجودہ جغرافیائی اور موسمی حالت بھی، اس کے نباتات اور حیوانات بھی اسی طرح ظہور میں آئے ہوئے، ٹھہرتے ہیں۔ اور پھر نہ صرف خلا میں دوسرے سیاروں کے ساتھ اس کے وجود کی، بلکہ وقت کے دائرے میں اس کے تسلسل کی ایک تاریخ بھی ہونی چاہئے۔ اگر اس نقطے سے تحقیقات کا قدم مضبوطی سے آگے کی طرف اٹھتا تو قدرتی سائنس جہاں آج ہے، اس سے کہیں آگے پہنچ چکی ہوتی۔ مگر فلسفے سے بھلا کسے بھلائی کی امید تھی! کانٹ کی فلسفیانہ تصنیف اس وقت تک بے مصرف پڑی رہی جب تک کہ بہت سال بعد، لپلاس اور ہرشل نے اس کا مضمون اور نہیں پھیلا دیا، اسے اور تفصیلات دے کر پکا نہیں کیا، اور اس طرح رفتہ رفتہ ”نیبولائی نظریے“ (nebular hypothesis) کو دنیا سے سنوالینے کی پوری تیاری نہیں کر لی۔ بعد کی دریافتوں نے آخر اس نظریے کے سرفتح کا سہرا باندھ دیا، ان میں زیادہ کارگر انکشاف یہ ثابت ہوئے: ثابت ستاروں کی خاص حرکت، خلا میں ایسے ذریعوں کا وجود ثابت ہونا جو ایک دوسرے کا توڑ کرتے ہیں، بصارتی (اسپیکٹرم) تجزیے سے کائنات کے مادے کی کیمیائی مشترک خاصیت معلوم ہونا اور تپتے ہوئے دھندلے ہیولوں کا وجود، جن کا خیال کانٹ ظاہر کر چکا تھا۔ \*

\* مسودے کے حاشیے پر ایک نوٹ درج ہے: ”کانٹ نے جو پتہ لگایا تھا کہ پانی کا مدوجزر زمین کی گردش میں رکاوٹ ڈالتا ہے، اب جا کر سمجھ میں آیا۔“ (ایڈیٹر)

بہر حال اس شبہ کی گنجائش باقی رہتی ہے کہ اگر اس ابھرتے ہوئے خیال کو کہ قدرت کا صرف وجود ہی نہیں بلکہ وہ عالم وجود میں داخل ہوتی ہے اور عالم وجود سے خارج ہو جاتی ہے، دوسری طرف سے تائید نہ ملی ہوتی تو قدرتی سائنسدانوں کی اکثریت اتنی جلدی اس تضاد کو محسوس کر لیتی کہ بدلتی ہوئی دنیا میں ناقابل تبدیل جاندار موجود ہیں۔ علم طبقات الارض نے سر اٹھایا اور صرف ایسے زمینی طبقوں کا ہی سراغ نہیں دیا جو یکے بعد دیگرے بنے ہوں گے اور اب زمین کے پرتوں میں تہہ برتہہ رکھے ہوئے تھے، بلکہ انہی پرتوں میں ایسے جانوروں کے ڈھانچے، خول اور دانت بھی ملے، ان درختوں کے پتے اور پھل بھی نکلے جن کا زمین پر اب نام و نشان نہیں رہا۔ اس سے یہ فیصلہ کرنا لازم آیا کہ مجموعی طور پر صرف زمین کی ہی نہیں، بلکہ آج جو روئے زمین ہے اس کی بھی، اور زمین پر بسنے والے نباتات اور حیوانات کی بھی ایک تاریخ زمانی ضرور ہے۔ شروع شروع میں اسے کافی بے دلی سے تسلیم کیا گیا۔ کیونکہ زمین کے انقلابات کا جو نظریہ پیش کیا، وہ قول میں انقلابی اور فعل میں رجعت پرست تھا۔ جہاں پہلے غیب سے تخلیق کے ایک عمل کا ذکر تھا، کیونکہ زمین نے وہاں ایک جیسے تخلیقی عمل کی پوری قطار لگا دی، اور معجزے کو فطرت کے پورے نظام کا اصلی کل پرزہ بنا کر رکھ دیا۔ صرف لائل وہ شخص تھا جس نے طبقات الارض میں عقل کو دخل دیا اور ناگہانی انقلابوں کا سبب، بھگوان کی لایا یا خالق کے کرشموں کے بجائے یہ بتایا کہ زمین کی سست رو اندرونی تبدیلی کا اثر رفتہ رفتہ ظاہر ہوا کرتا ہے۔ \*

\* لائل کے نظریے کی، کم از کم اپنی پہلی صورت میں خرابی یہ تھی کہ اس نے زمین پر اثر انداز ہونے والی قوتوں کو قائم مان لیا تھا، یعنی ایسی جو اپنے کیف و کم (خاصیت اور مقدار) دونوں میں غیر متحرک تھیں۔ زمین کے آہستہ آہستہ سرد پڑنے کا علم اسے نہیں تھا، زمین کسی ایک مقررہ سمت میں تو نشوونما پاتی نہیں، وہ ایسے ڈھنگ سے بدلتی ہے جو بے ربط (inconsequent) اور اتفاقی (fortuitous) ہوتا ہے۔



لائل نے جو نظریہ پیش کیا اس کی مطابقت ناسیاتی جسموں کی مختلف نوعوں کو مستقل بنانے کے ساتھ پہلے کے تمام نظریوں کے مقابلے میں اور بھی کم تھی۔ روئے زمین کی اور ساتھ ہی زندگی کے تمام حالات کی رفتہ رفتہ اندرونی تبدیلی کے خیال نے یہ راہ دکھائی کہ ناسیاتی جسموں میں بھی رفتہ رفتہ تبدیلی آتی ہے اور وہ گرد و پیش کے حالات کے مطابق خود کو ڈھالتے رہتے ہیں اور نوعوں میں فرق آتا رہتا ہے۔ مگر پرانا چلن بھی ایک طاقت ہے، جو صرف کتھولک چرچ میں نہیں، بلکہ قدرتی سائنس میں بھی اثر رکھتا ہے۔ برس گزر گئے لیکن لائل کو خود تضاد نظر نہیں آیا، اس کے شاگردوں کو تو کیا نظر آتا۔ اگر اس کی کوئی وجہ ہوگی تو تقسیم محنت جو تب تک قدرتی سائنس پر بالکل چھا گئی تھی اور ہر شخص کو خاص شعبے کا پابند کر چکی تھی، صرف کچھ ہی لوگ اس کی زد سے بچے رہ گئے جن سے وہ سائنس کی ہمہ گیر نظر نہیں چھین سکی۔

اس عرصے میں طبیعیات کے علم نے زبردست معرکے سر کئے اور ان کا حاصل تقریباً یک وقت ۱۸۴۲ء میں تین مختلف آدمیوں نے خلاصہ کر کے رکھ دیا۔ یہ سال قدرتی سائنس کی اس شاخ میں بڑے معرکے کا سال نکلا۔ ہیلبرون کے مقام پر مائیر نے اور مانچسٹر سے جوؤل نے یہ عمل کر کے دکھایا کہ حرارت کس طرح میکانیکی طاقت میں اور میکانیکی طاقت حرارت میں ڈھل جاتی ہے۔ حرارت کا میکانیکی ہم وزن قائم ہونے کی بدولت، اس مسئلے میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہ گئی۔ انہی دنوں طبیعیات کے الگ الگ حاصل شدہ نتیجوں کو ملا کر، ان پر کام کر کے گرو (Grove) نے جو پیشے کا سائنس داں نہیں بلکہ ایک انگریز قانون داں تھا، ثابت کر دیا کہ وہ سب چیزیں جنہیں طبیعیاتی طاقتیں کہا جاتا ہے، جن میں میکانیکی طاقت، حرارت، روشنی، بجلی، مقناطیسیت، بلکہ حقیقت میں وہ بھی جسے کیمیائی طاقت سے منسوب کرتے ہیں، وہ خاص حالات کے تحت ایک دوسری میں ڈھل جاتی ہیں، اور اس تبدیلی کے عمل میں طاقت کا کوئی فرق یا فتور بھی نہیں پڑتا اور یوں آگے چل کر خود مادی لائنوں پر ڈیکارٹ کے اس خیال کو عملی ثبوت مہیا کر دیا کہ دنیا میں حرکت کی کل مقدار جتنی ہے

اتنی ہی رہتی ہے۔ اس کی بدولت مختلف طبیعیاتی طاقتیں، یعنی جسمانیات کی یہ نہ بدلنے والی ”نوعیں“ (species) مادے کی حرکت کی ایسی کم و بیش ہوتی ہوئی مختلف شکلیں بن گئی ہیں جو مقررہ قاعدوں کی رو سے ایک دوسری میں ڈھلتی رہتی ہیں۔ طبیعیاتی طاقت کا کسی میں کتنا اور کسی میں کتنا پائے جانے کا بظاہر اتفاقی امر، اب ان کے باہمی ربط ضبط اور ایک سے دوسرے میں ڈھل جانے کا ثبوت ملتے ہی سائنس کی دنیا سے خارج کر دیا گیا۔ جیسے فلکیات میں ہوا تھا، ایسے ہی اب طبیعیات بھی ایسے نتیجے تک پہنچی جس نے لازمی طور سے سائنس کا حاصل حصول بنا کر دکھا دیا کہ متحرک مادہ ہمیشہ گردش میں رہتا ہے۔

کیمسٹری نے حیرت انگیز ترقی کا قدم لاوواژ نے کے اور خاص کر ڈالٹن کے زمانے سے اتنی تیزی سے اٹھایا کہ فطرت کے متعلق پرانے تصور پر دوسری طرف سے ضرب لگائی۔ ایسے کیمیائی مرکب جو تب تک صرف زندہ جسموں میں ہی پرورش پایا کرتے تھے، انہیں غیر ناسیاتی (inorganic) طریقوں سے تیار کر کے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچا دی گئی کہ کیمسٹری کے قانون ناسیاتی اور غیر ناسیاتی دونوں طرح کے جسموں میں ایک ہی تاثیر رکھتے ہیں اور یوں ناسیاتی و غیر ناسیاتی فطرت کے درمیان وہ ظاہر خلیج بڑی حد تک پاٹ دی، جسے کانٹ ابھی تک ناقابل عبور سمجھتا تھا۔

آخر یہ ہوا کہ حیوانی جسموں کی ریسرچ (بایولوجی) کے میدان میں بھی، بڑی حد تک تلاش علم کے ان سفروں اور سیاحتوں کی بدولت جن کا باقاعدہ اہتمام پچھلی صدی کے وسط سے ہی کیا جانے لگا تھا، دنیا کے تمام حصوں میں پھیلی ہوئی یورپی نوآبادیوں کی اس گہری چھان بین کی بدولت جو وہاں رہنے والے ماہرین نے کی تھی، palaeontology، علم تشریح الاعضا اور عموماً خاصیت ابدان (فزیاولوجی) میں جو آگے ترقی ہوئی، خاص کر خوردبین کے باقاعدہ استعمال سے اور خلیے کی دریافت سے جو تحقیق کا قدم بڑھا، ان سب کی بدولت اتنا سروسامان جمع ہو گیا کہ تقابلی مطالعے سے کام لینے کی سبیل بھی نکل آئی اور



یہ لازمی بھی ٹھہرا \*۔ ایک طرف تو مختلف قسم کے نباتات و حیوانات کی زندگی کے حالات کا طبیعی جغرافیے کی تقابلی روشنی میں دیکھا جانے لگا؛ دوسری طرف یہ مشاہدہ کیا جانے لگا کہ مختلف نامیاتی جسموں میں ان کے ایک جیسے اعضا کی بنا پر کیا نسبت رہتی ہے، اور یہ بھی صرف پختگی کی منزل پر نہیں، بلکہ نشوونما کے ہر ایک مرحلے پر۔ یہ ریسرچ جس قدر گہرائی اور نپے تلے انداز سے آگے بڑھتی گئی، نامیاتی فطرت کے ٹھوس بن اور بے تبدیلی کا وہ بے لوچ سسٹم اسی قدر پگھلتا چلا گیا۔ نباتات اور حیوانات کی جدا جدا نوعیں (species) تو آپس میں ایسی خلط ملط ہوتی چلی گئیں کہ شناخت نہ ہو سکے، لیکن اس کے علاوہ ایسے حیوانات بھی ملے، جیسے amphioxus اور lepidosiren (۱۷۷) جن کے ہوتے پرانی تمام درجہ بندیوں مذاق ہو کر رہ گئیں\*۔ اور آخر ایسے جاندار جسموں سے سابقہ پڑا جن کے متعلق یہ تک کہنا ممکن نہیں رہا کہ وہ نباتات کی دنیا کے باسی ہیں یا حیوانات کی۔ Palaeontology کے ریکارڈ کا زیادہ سے زیادہ خلا بھرتا گیا جس نے سب سے کٹر منکروں کو بھی ماننے پر مجبور کر دیا کہ بحیثیت مجموعی جاندار دنیا کی ارتقائی تاریخ اور ذی حیات فرد کی ارتقائی تاریخوں میں حیرت انگیز ایکسانی پائی جاتی ہے۔ یوں وہ ڈور ہاتھ آئی جس نے علم نباتات اور علم حیوانات، دونوں کو ان بھول بھلیوں سے نکالا جن میں وہ ظاہر اور پھنستے جا رہے تھے۔ نکتے کی بات ہے کہ تقریباً اسی وقت جب نظام شمسی کی ابدیت پر کانٹ کا حملہ جاری تھا تو ک۔ وولف نے ۱۷۵۹ء میں نوعوں کے مستقل اور بے تغیر رہنے کے نظریے پر وار کیا اور ان میں ارتقا کا خیال دیا (۱۷۹)۔ لیکن یہ خیال جو اس کے ہاں محض ایک زبردست ذہنی پیش قدمی تھی، اوکن، لامارک اور بے ایر کے ہاں پہنچ کر معقول شکل اختیار کر گیا اور ڈارون نے ۱۸۵۹ء میں، ٹھیک سو سال بعد

\*مسودے کے حاشیے پر نوٹ: «Embryology» - (ایڈیٹر)

\*\*مسودے کے حاشیے پر نوٹ: «Ceratodus. Ditto» (۱۷۸) archaeopteryx» (ایڈیٹر)

فاتحانہ شان سے اس کو سائنس بنا دیا (۱۸۰)۔ تقریباً اسی زمانے میں یہ بھی ثابت ہو گیا کہ protoplasm اور خلیہ، جن کے متعلق پہلے خیال تھا کہ ہر قسم کے نامیاتی جسموں کی بناوٹ میں بالکل اولین پرزہ ہیں، وہ نامیاتی وجود (organic form) کی سب سے نچلی حیثیت میں بذات خود زندگی رکھتے ہیں۔ یہ ثابت ہونا تھا کہ نامیاتی اور غیرنامیاتی فطرت کے درمیان سارے فاصلے تو چھنٹ ہی گئے، ان کے علاوہ ایسی ایک بھاری رکاوٹ بھی دور ہو گئی جس نے نامیاتی جسم کے متعلق ارتقا کے نظریے کی راہ روک رکھی تھی۔ فطرت کے متعلق نیا تصور اپنے خاص پہلوؤں کے ساتھ مکمل ہو گیا کہ: تمام جمود پگھل گیا، ہر ایک ٹھہراؤ میں حرکت آگئی، تمام وہ خصوصیت جو تب تک ازلی وابدی سمجھی جاتی تھی، گزراں شمار ہونے لگی اور ثابت ہو گیا کہ تمام عالم فطرت ہمیشہ ہمیش لہر اور گردش کے عالم میں رہتا ہے۔

اب ہم پھر فلسفہ یونان کے عظیم الشان بانیوں کے اس نقطہ نظر کی طرف آتے ہیں، جو وہ سوچتے تھے کہ تمام فطرت چھوٹی سے چھوٹی چیز سے بڑی سے بڑی تک، ذرہ بے مقدار سے آفتاب عالم تاب تک، (۱۸۱) protista سے لے کر انسان تک، ہمیشہ وجود و عدم، ظہور و غیب کے مقام سے، مسلسل بہاؤ سے، مستقل حرکت اور تغیر سے گزرتی رہتی ہے۔ اصلیت میں فرق صرف اتنا ہے کہ یونانیوں کے ہاں جو بات ذہن و تصور کی بے مثل پرواز تک تھی، وہ ہمارے ہاں تجربے کی روشنی میں نپے تلی سائنسی تحقیق کا نتیجہ ہے، لہذا زیادہ پختہ اور واضح شکل میں سامنے آتی ہے۔ مانا کہ اس گردش کے تجرباتی ثبوت ابھی تک کوتاہیوں سے پاک نہیں، مگر جتنا کچھ قطعی ثابت ہو چکا ہے، اس کے مقابلے میں یہ کوتاہیاں خاص اہمیت نہیں رکھتیں اور یوں بھی سال بہ سال کمی پوری ہوتی جاتی ہے۔ اگر آدمی ذہن میں یہ رکھے کہ سائنس کی سب سے اہم شاخوں، یعنی ستاروں کے درمیان فلکیات، کیمسٹری، طبقات الارض نے ابھی تحقیقی عمر کے سو سال بھی پورے نہیں کئے ہیں، فزیالوجی میں تقابلی



مطالعے کا طریقہ سائنسی طور پر شروع ہوئے پچاس برس نہیں گزرے اور زندگی کی تقریباً تمام تر اٹھان کی جو بنیادی شکل ہے، یعنی خلیہ، اس کی دریافت کو ابھی چالیس سال بھی نہیں ہوئے ہیں تو کسی نہ کسی تفصیل میں ثبوت کی کچھ نہ کچھ خاصی تو بہر حال رہے گی۔

بہنور کی طرح چکر کاٹنے، دھکتے ہوئے ابخرات کے مانند چھائے ہوئے دھندوں سے سکرٹنے سمٹنے اور ٹھنڈا پڑنے کی بدولت ہمارے اس خلائی جزیرے کے بے شمار سورج اور شمسی نظام ابھرے، جس جزیرے کی حد بندی کہکشاں (Milky way) کے بالکل آخری ستاروں کے حصار سے ہوتی ہے۔ اس دھند کی حرکت و رفتار کے قانون، ممکن ہے، ہم پر تب کھلیں جب ہم سیکڑوں سال تک برابر نظر لگائے رکھنے کے بعد ستاروں کی گردش کی تمہ میں اتر چکے ہوں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ ترقی ہر جگہ ایک ہی رفتار سے نہیں ہوئی۔ فلکیات زیادہ سے زیادہ اس امر کے ماننے پر مجبور ہوتی جاتی ہے کہ ہمارے ستاروں کے نظام میں سیاہی مائل صرف سیارے نہیں بلکہ اور بھی اجرام ہیں جو بجھے ہوئے سورج ہوں گے (میڈلر کا قیاس)؛ دوسری طرف (سیککی کے کہنے کے مطابق) ابخرات جیسے دھندلے دھبوں کا ایک حصہ ایسا ہے، جو ابھی نامکمل سورجوں کی حیثیت سے ہمارے ہی ستاروں کے نظام سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اس سے یہ بات خارج نہیں ہوتی کہ دوسرے دھندلے دھبے، بقول میڈلر کے، کہیں دور دراز پر قائم بالذات خلائی جزیرے ہیں، جن کی ترقی کا مرحلہ فضائی کیفیت چانچنے والی دور بین ہی بتا سکتی ہے۔

لیپلاس نے تفصیل کے ساتھ اور ایسے کمال سے جس کی نظیر نہیں ملتی، یہ دکھایا ہے کہ الگ الگ دھند کے ہجوم سے نظام شمسی کیسے ابھرتا ہے۔ جس لائن پر لیپلاس نے سوچا تھا، تازہ ترین سائنسی تحقیق نے زیادہ سے زیادہ اس کی توثیق بھی کر دی۔

اس صورت سے الگ الگ جو اجرام بنتے ہیں، یعنی سورج، سیارے اور ان کے تابع سیارے، ان پر شروع میں مادے کی حرکت کی وہ

شکل غالب رہتی ہے جسے ہم حرارت کہتے ہیں۔ اس درجہ حرارت کے ہوتے جو آجکل بھی سورج میں پائی جاتی ہے عناصر کے کیمیائی مرکب کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ان حالات میں حرارت کس حد تک بجلی یا مقناطیسی طاقت میں بدل جاتی ہے، یہ بات ایک زمانے تک مسلسل سورج کا مشاہدہ کر کے ہی معلوم ہوگی؛ البتہ یہ ابھی سے ثابت سمجھنا چاہئے کہ سورج پر جو میکانیکی حرکتیں ہوتی ہیں ان کا سبب حرارت اور کشش کے درمیان ٹکراؤ کے سوا کچھ نہیں۔ الگ الگ جسم جتنے چھوٹے ہوتے ہیں اتنی ہی جلدی ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ پہلے تابع سیارے، asteroids اور ٹوٹتے ستارے ٹھنڈے پڑے، جیسے بہت زمانے پہلے ہمارا چاند ٹھٹھکر رہ گیا۔ سیاروں کو ٹھنڈا ہونے میں زیادہ وقت لگتا ہے اور مرکزی روشن سیارے کی باری سب سے دیر میں آتی ہے۔

رفتہ رفتہ ٹھنڈا پڑنے کے ساتھ حرکت کی ایک دوسری میں ڈھلنے والی طبعی شکلوں کا باہمی اثر تاثیر زیادہ سے زیادہ سامنے آنے لگتا ہے اور یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا ہے جب تک کہ آخر وہ مقام نہ آجائے جہاں پہنچ کر کیمیائی اجزا کا اندرونی رشتہ خود کو ظاہر کرنے لگے اور وہ کیمیائی عناصر جن میں تب تک فرق نہیں کیا جا سکتا تھا، یکے بعد دیگرے کیمیائی تفریق کے قابل ہو جائیں، یہ اجزا کیمیائی خاصیتیں پیدا کر لیں اور ایک دوسرے سے مرکب ہونا شروع کر دیں۔ درجہ حرارت گھٹنے کے ساتھ ساتھ یہ مرکب برابر بدلتے رہتے ہیں۔ درجہ حرارت گھٹنے کا اثر نہ صرف ہر ایک عنصر پر دوسرے سے مختلف ہوتا ہے، بلکہ ان اجزا کی الگ الگ ترکیب پر بھی مختلف ہی رہتا ہے۔ درجہ حرارت کم ہونے کے سبب ابخراتی مادے کا کچھ حصہ پہلے تو سیال یا رقیق مادے میں اور پھر ٹھوس جامد حالت میں قدم رکھتا ہے، اور یوں نئے پیدا شدہ حالات کے مطابق ڈھل جاتا ہے۔ سیارے پر چھلکا چڑھنے اور اس کی سطح پر پانی اکٹھا ہونے کا وقت، عین وہی زمانہ ہے جب اس کی اپنی حرارت کی اہمیت اس حرارت کے مقابلے میں گھٹتی چلی جاتی ہے جو وہ روشن مرکز سے حاصل کرتا ہے۔ اس سیارے کی فضا آجکل کے معنوں میں موسمیاتی تبدیلیوں



کی جلوہ گاہ بن جاتی ہے۔ اور اس کی سطح ان اوپری چھلکے کے اندر کی تبدیلیوں کی آما جگہ بنتی ہے، جن کے ہوتے فضائی رطوبت کے نتیجے میں سطح پر اکٹھے ہونے والے پرت دھکتے ہوئے رقیق اندرونی مغز کے ان بیرونی اثرات پر حاوی ہونے لگتے ہیں جو سست رفتار سے برابر کمزور پڑتے جاتے ہیں۔

آخر یہ کہ اگر ٹمپریچر یہاں تک اتر جائے کہ سطح کے کم از کم کسی اچھے خاصے رقبے میں وہ اس حد سے نہ گزرے جس حد کے اندر سفید مادہ (albumen) زندگی کے آثار قبول کرنے قابل ہوتا ہے تو دوسری ابتدائی کیمیائی شرطوں کے مناسب حال ہونے پر زندہ protoplasm کی نمود ہو جاتی ہے۔ وہ کونسی ابتدائی کیمیائی شرطیں ہوتی ہیں، ہمیں ابھی نہیں معلوم۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیوں کہ ابھی ہمارا علم سفید مادے (albumen) کے کیمیائی فارمولے تک بھی نہیں پہنچا اور یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ کیمیائی لحاظ سے albumen کے کتنے مختلف جسم موجود ہیں، اور یہ پتہ چلے بھی کوئی دس سال ہوئے ہوں گے کہ بغیر کسی ڈھانچ کا albumen ہی ہے جو زندگی کے سارے فعل انجام دیتا ہے، یعنی کھانا ہضم کرنا، فضلہ خارج کرنا، ہلنا جلنا، سکڑنا، ناگوار بات کا اثر لینا اور نسل پھیلانا۔

غالباً ہزاروں سال گزرنے پر وہ حالات بنے ہوں گے جن میں اگلا قدم بڑھانا ممکن ہوا اور گٹھلی اور جھلی کے شکل پکڑنے کی بدولت، albumen کے لوتھڑے سے پہلا خلیہ بن کر تیار ہوا۔ مگر اس پہلے خلیے نے ہی تمام نامیاتی جسموں کی دنیا کے لئے روپریکھا کی داغ بیل ڈال دی۔ Palaeontology کے پورے ریکارڈ کو نظر میں رکھ کر یہ قیاس کر لینا جائز ہے کہ سب سے پہلے خلیوں والی اور بے خلیہ protista کی بے شمارا نوعوں (species) کے جسم ابھرے۔ اب ان میں سے صرف ایک (۱۸۲) Eozoon canadense ہم تک پہنچا ہے۔ ہوتے ہوتے انہی میں سے کچھ تو اولیں پودوں کی شکل پا گئے اور کچھ پہلوئی جانور بن گئے۔ اور پھر ان سب سے اول کے حیوانوں میں بھی، خاص کر طویل ارتقا اور تفریق در تفریق (differentiation) کے ذریعے جانوروں کے بے شمار درجے، خانہ بندیوں، خاندان، نسلیں

اور قسمیں ہوتی گئیں، تو آخر وہ شکل نکھر کر آئی جس میں اعصابی نظام کو بھر پور حیثیت ملتی ہے، یعنی ریڑھ کی ہڈی والے جانور۔ اور پھر انجام کار انہی میں سے ریڑھ کی ہڈی والا وہ حیوان نکلا جس میں فطرت خودشناس ہو جاتی ہے، یعنی انسان۔

انسان بھی تفریق ہوتے ہوتے ابھرا ہے، اور اس میں یہ عمل صرف انفرادی طور سے نہیں ہوا کہ ایک بیضے کے خلیے سے، جیسا کہ فطرت پیدا کرتی ہے، وہ انتہائی پیچیدہ نامیاتی جسم تک بڑھ گیا ہو، نہیں، بلکہ یہ عمل تاریخی لحاظ سے بھی ہوا ہے۔ جب ہزاروں برس ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد ہاتھ اور پاؤں کی تفریق ہو چکی اور آدمی صرف پاؤں پر کھڑے قد سے چلنے پر قادر ہو گیا تو انسان نے خود کو بندر سے الگ کر لیا اور یوں گفتگو کے اعضا کے ابھار اور دماغ کے زبردست نشوونما کی بنیاد پڑ گئی، جس کی بدولت تبھی سے انسان اور بندر کے درمیان کی خلیج ناقابل عبور ہو گئی۔ ہاتھوں کی خاص سہارت سے اوزار نکلے اور اوزار کا مطلب ہوا خاص وضع کی انسانی کارکردگی۔ کہ جب وہ فطرت پر اپنی طرف سے کاٹ چھانٹ کا عمل کرتا ہے تو یہ پیداوار کا عمل ہے۔ محدود معنی میں حیوانوں کے پاس بھی اوزار ہوئے ہیں، لیکن وہ صرف ان کے اعضا ہیں: چیونٹی، شہد کی مکھی، اودبلاؤ؛ یہ جانور بھی کچھ نہ کچھ پیدا کرتے ہیں، تاہم انسان کے مقابلے میں ان حیوانات کا ارد گرد کی فطرت پر پیداواری اثر برائے نام رہتا ہے۔ محض انسان ہے جسے فطرت پر اپنی گہری چھاپ لگانا نصیب ہوا۔ وہ بھی صرف نباتات اور حیوانات کو ایک جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھنے میں نہیں بلکہ خود اپنے ٹھکانے کا رنگ روپ اور آب و ہوا بدل ڈالنے اور نباتات و حیوانات تک کو کچھ سے کچھ کر دینے میں یہاں تک قدرت ہو گئی کہ اب اس کی کارکردگی کے ثمرے تبھی مٹ سکتے ہیں جب پورا روئے زمین غارت ہو جائے۔ یہ جتنا کچھ اس نے کر دکھایا، وہ بھی سب سے مقدم اور سب سے اہم انسانی ہاتھوں کی برکت ہے۔ بھاپ کا انجن بھی، جو فطرت کی کاپیلت کرنے میں آج تک کا سب سے زبردست انسانی اوزار بنا، خود اوزار ہونے کی حیثیت سے، بالآخر ہاتھوں کی حرکت کا ہی



محتاج ہے۔ ہاتھوں کی ترقی کے ساتھ ایک ایک قدم کر کے دماغ کی ترقی بھی ہوئی، شعور ابھرا۔ اول تو ان حالات و اسباب کا شعور، جن سے جدا جدا عملی مفید نتیجے نکلے، اور آگے چل کر اسی کی بنیاد پر، ان لوگوں میں، جو زیادہ خوشگوار حالت میں پائے جاتے تھے، فطرت کے ایسے قاعدے قانونوں کی سوجھ بوجھ پیدا ہوئی جن سے مفید مطلب نتیجے نکلے تھے۔ قانون فطرت کے تیزی سے بڑھتے ہوئے علم کے شانہ بشانہ وہ ذریعے بھی بڑھے کہ پلٹ کر فطرت پر اثر انداز ہونے میں ان سے کام لیا جائے۔ اگر ہاتھ کے ساتھ اور کسی حد تک اس کی بدولت، اسی مناسبت سے انسانی دماغ ترقی نہ کرتا رہتا تو صرف ہاتھوں کے آسے بھاپ کا انجن کبھی نہ بن پاتا۔

انسان کے دم سے ہم تاریخ میں قدم رکھتے ہیں۔ یوں تو جانوروں کی بھی تاریخ ہے کہ وہ کہاں سے نکل کر رفتہ رفتہ ترقی کر کے اپنی موجودہ حالت تک پہنچے۔ لیکن وہ اس تاریخ کے عامل نہیں، معمول ہیں اور چوں کہ وہ خود اس میں شریک رہے، یہ عمل ان کی خبر اور خواہش کے بغیر ہی چلتا رہا ہے۔ البتہ انسان، محدود معنوں میں جتنا جتنا حیوان سے فاصلہ اختیار کرتا جاتا ہے، اتنا ہی وہ بالارادہ اپنی تاریخ کا عامل بنتا جاتا ہے، اس تاریخ پر انہونی باتوں کا اور قابو سے باہر طاقتوں کا اثر اتنا ہی کم پڑتا ہے، تاریخی نتائج پہلے سے طے کئے ہوئے نشانوں کے مطابق اتنے ہی زیادہ درست نکلتے ہیں۔ اب اگر ہم اسی پیمانے سے انسانی تاریخ کو ناپیں، اور تو اور آجکل کی سب سے ترقی یافتہ قوموں کی تاریخ پر پیمانہ رکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہاں بھی مقررہ مرادوں اور حاصل شدہ نتیجوں کے درمیان زبردست بے جوڑ پن موجود ہے اور یہ کہ یہاں بھی انہونی باتوں کا اور قابو سے باہر طاقتوں کا اثر ان طاقتوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ چھایا ہوا ہے جو منصوبے کے مطابق حرکت میں لائی جاتی ہیں۔ اس کے سوا اور ہونا بھی کیا تھا جب تک کہ لوگوں کی سب سے اصلی تاریخی سرگرمی، یعنی وہ کارکردگی جس نے انہیں جانوروں کی حالت سے اٹھا کر انسانی حالت میں پہنچایا، اور جو باقی دوسری سرگرمیوں کی مادی بنیاد کا کام دیتی ہے یعنی پیداواری عمل، جس کی غرض یہ ہے

کہ لوگوں کی ضروریات زندگی پوری کرے، جسے ہم آج کے زمانے میں سماجی پیداوار کہیں گے، خود یہی سماجی پیداوار قابو سے باہر طاقتوں کی خواہ مخواہ اندھی اچھل کود سے خاص کر دی ہوئی ہے اور جب تک یہ حال ہے کہ اگر کبھی مراد مل بھی گئی تو محض اتفاق سے، اور اکثر مراد کے خلاف ہی نتیجے نکلتے رہتے ہیں۔ نہایت ترقی یافتہ صنعتی ملکوں میں ہم نے فطرت کی طاقتوں پر بندش لگائی اور انہیں انسان کی خدمت میں لگا دیا۔ اس تدبیر سے ہم نے پیداوار کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا، یہاں تک کہ اب ایک بچہ بھی پہلے کے سیکڑوں آدمیوں کے مقابلے میں زیادہ پیدا کر لیتا ہے۔ مگر اس کا حاصل کیا؟ حد سے زیادہ مشقت اور بڑھ گئی، عام لوگوں کی محتاجی اور بڑھ گئی، اور ہر دس برس بعد توڑ کا وقت آنے لگا۔ ڈارون کو گمان بھی نہ ہوگا کہ لوگوں پر، خاص کر اپنے اہل وطن پر وہ کیسی سخت چوٹ کر گیا جب اس نے ثابت کیا کہ آزادانہ مقابلہ اور زندہ رہنے کی کشمکش، جسے ماہرین معاشیات انسان کی بڑی بھاری تاریخی حیت کہہ کر بانس پر چڑھاتے ہیں، وہ جانوروں کی دنیا کا معمول ہے۔ سماجی پیداوار کی سمجھی بوجھی تنظیم، جس کے اندر پیداوار اور سامان کی تقسیم دونوں کے قاعدے مقرر ہوں، صرف یہ ایک تدبیر لوگوں کو جانوروں پر، سماجی لحاظ سے، عین اسی طرح بلند کر سکتی ہے جس طرح عموماً پیداوار کے عمل نے انسان کو حیاتیاتی لحاظ سے بلند کیا ہے۔ تاریخ کا قدم آگے بڑھنا روز بروز اس قسم کی تنظیم کو لازمی اور روز بروز ممکن بناتا جاتا ہے۔ یہیں سے تاریخ انسانی کا وہ نیا دور طلوع ہوگا جس میں خود لوگ بھی، اور ساتھ میں انسانی سرگرمیوں کے تمام شعبے بھی، خاص کر مطالعہ فطرت کی سائنس، اتنے زبردست معرکے سر کریں گے، جن کے آگے اب تک کا سب کیا کرایا بے حیثیت معلوم ہوگا۔

✓ بہرحال ”جو وجود میں آیا، اس نے عدم کا حق اپنایا،“ \*۔ ہو

\* گوئیٹے کے ڈرامے ”فاؤسٹ“، میں پہلا حصہ، تیسرا منظر۔ (ایڈیٹر)



سکتا ہے کہ اور کروڑوں سال گزر جائیں، لکھوکھا نسلیں یکے بعد دیگرے وجود سے عدم کی طرف کوچ کر جائیں، مگر وہ وقت آنا اٹل ہے جب سورج کی گھٹتی ہوئی حرارت اس برف کو پگھلاتے قابل نہ رہے گی جو قطبین سے بڑھتا چلا آ رہا ہے، جب خط استوا کی طرف برابر هجوم کرتی ہوئی نسل انسانی کو آخر وہاں بھی اتنی حرارت میسر نہ ہوگی جو زندگی کے لئے درکار ہے، جب نامیاتی زندگی کا آخری نام و نشان بھی اڑ جائے گا، اور یہ کرۂ ارض بھی، چاند کی طرح مردہ اور افسردہ گولا، گھنے اندھیرے میں بجھتے ہوئے سورج کے اور چھوٹے ہونے ہوئے چکر کاٹتا رہ جائے گا اور آخر تھک ہار کر اسی پر گر پڑے گا۔ کچھ سیارے زمین سے پہلے اور کچھ سیارے بعد میں اسی انجام کو پہنچ چکے ہوں گے۔ جہاں اب روشن، گرم اور کڑی سے کڑی ملاہوا شمسی نظام قائم ہے، وہاں صرف ایک سرد، بے جان کرہ کائنات کی وسعت میں اپنی راہ پر آپ اکیلا گھومنا کرے گا۔ اور جو ہمارے نظام شمسی پر گزرنے والی ہے، وہی ہمارے خلائی جزیرے کے باقی بے شمار ستاروں کے نظام پر بھی گزرے گی، یہاں تک کہ ان پر بھی، جن کی روشنی زمین پر نہ آئی ہے، نہ انسانی آنکھ کے دیکھتے کبھی آسکے گی۔

لیکن جب اس قسم کا نظام شمسی اپنی عمر پوری کر چکے گا، اور عالم فانی کے انجام، یعنی موت کو پہنچ جائے گا تو پھر اس کے آگے کیا ہے؟ کیا سورج کی لاش ہمیشہ ہمیش کے لئے یونہی لامحدود وسعتوں میں لوٹتی پھرے گی اور پہلے سے بے انتہا مختلف سمتوں میں تفریق در تفریق ہونے والی فطرت کی طاقتیں ابدیت کے ساتھ حرکت کی صرف ایک اور واحد صورت، یعنی کشش میں بدل کر رہ جائیں گی؟ یا یوں ہونے والا ہے، جیسا کہ سیکی نے (صفحہ ۸۱۰ پر) سوال کیا تھا کہ:

”کیا فطرت میں ایسی طاقتیں پوشیدہ ہیں جو مردہ نظام کو پھر سے دھکتے ہوئے دھند کی اولین شکل میں لے آئیں اور اس میں نئی زندگی کے آثار جگا دیں؟ ہمیں اس کا علم نہیں ہے۔“

ہاں، واقعی اس بات کا علم ویسا نہیں جیسا دو اور دو چار ہونے کا علم ہے، یا یہ علم ہے کہ مادے کی کشش فاصلے کے مربع کے حساب سے بڑھتی گھٹتی ہے۔ مگر نظریاتی نیچرل سائنس کے معاملے میں، جس نے امکانی حد تک فطرت کو اپنی بصیرت میں ایک ہم آہنگ کل کی حیثیت دی ہے، اور جس کے بغیر آجکل تجربے پر قیاس کرنے والے نہایت بے پروا آدمی کی بھی گزر نہیں ہو سکتی، ہمیں اکثر و بیشتر ایسی معلومات کا سہارا لینا پڑتا ہے، جن کی ناپ ابھی مکمل نہیں ہوئی اور کسی خیال کا ایک تسلسل پر قائم رہنا ہر زمانے میں ناکافی علم کو آگے بڑھنے میں سہارا دیتا رہا ہے۔ جدید فطری سائنس کو فلسفے سے یہ اصول مانگنا پڑا کہ حرکت و رفتار کبھی نہیں مٹنے والی۔ اور اب اس اصول کے بغیر فطری سائنس زندہ نہیں رہ سکتی۔ لیکن مادے کی حرکت ایک بھدی سی میکانیکی حرکت نہیں، صرف جگہ بدلنا نہیں؛ وہ حرارت اور روشنی بھی ہے، برقی اور مقناطیسی کشش بھی ہے، کیمیائی ترکیب و تحلیل بھی ہے، زندگی اور بالآخر شعور بھی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ مادے کو اپنے تمام ابدی وجود کی مدت میں لے دے کے صرف ایک بار (اس کے وجود کی ابدیت کو دیکھتے ہوئے یہ ایک بار محض ایک لمحے کے برابر ہوگا) یہ موقع ملا کہ اپنی حرکت سے تفریق کا کام لے اور اسی سے حرکت کی تمام برکت پھیلا دے، بلکہ اس سے پہلے اور اس کے بعد مادے کی حرکت صرف جگہ بدل لینے تک محدود رہی ہے تو یہ کہنے کا مطلب ہوگا کہ مادہ فنا ہونے والا ہے اور حرکت ایک عارضی کیفیت ہے۔ حرکت کا لازوال ہونا صرف کمیت (مقدار) میں نہیں بلکہ کیفیت میں بھی سمجھنا چاہئے۔ مادہ جس کا خالص میکانیکی انداز سے جگہ بدلنا اپنے اندر یہ گنجائش رکھتا ہے کہ مناسب حالات و اسباب کے ہوتے خود حرارت، بجلی، کیمیائی تاثیر اور زندگی میں ڈھل جائے، لیکن یہ گنجائش نہیں رکھتا کہ اپنے اندر سے یہ حالات پیدا کر سکے، ایسا مادہ اپنی حرکت میں خاص نقصان کا شکار ہو جاتا۔ وہ حرکت جو اپنی خاصیتوں کے مناسب حال مختلف شکلوں میں ڈھلنے کی صلاحیت سے محروم ہو، اس میں اندرونی صلاحیت (dynamis) ہوئی بھی



تو کیا، اثراندازی (energeia) نہیں ہوگی، یوں وہ جزوی طور سے برباد ہو جائے گی۔ مگر یہ اور وہ، دونوں باتیں تصور سے باہر ہیں۔

کچھ بھی سہی، اتنا تو یقینی ہے کہ : ایک وقت ایسا تھا جب ہمارے کائناتی جزیرے کے مادے نے حرکت کی اتنی زبردست مقدار کو حرارت میں بدلا (یہ کس قسم کی حرارت تھی، ہمیں ابھی تک نہیں معلوم) جس حرارت سے وہ شمسی نظام نکلے، جن سے کم از کم (بقول میڈلر کے) دو کروڑ ستارے وابستہ؛ ان شمسی نظاموں کا رفتہ رفتہ خاتمہ بھی اتنا ہی یقینی ہے۔ یہ ایک کا دوسرے میں ڈھلنا کیسے ہوا؟ ہمیں اس کے بارے میں اتنا تھوڑا علم ہے جتنا پادری سیککی کو اس بات کا علم کہ آیا ہمارے شمسی نظام کا آئندہ سر بے جان \* (caput mortuum) کبھی پھر سے اس قابل ہوگا کہ نئے شمسی نظاموں کا سروسامان بن سکے۔ یہاں پہنچ کر ہمارے سامنے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں : یا تو خالق سے رجوع کریں، یا پھر اس نتیجے پر پہنچیں کہ ہمارے کائناتی جزیرے کے شمسی نظاموں کا لاوا (سروسامان) قدرتی طور سے، حرکت کے ایک دوسری صورت میں ڈھل جانے سے نکلا تھا، اور ڈھل جانے کی یہ صلاحیت حرکت میں رہنے والے مادے کو فطرت کی طرف سے ملی ہوئی ہے، اور اس کے حالات و اسباب، لازم ہے کہ مادہ پھر سے سہیا کرے، اگر اس میں لاکھوں کروڑوں سال نکل جائیں، تب بھی کم و بیش اتفاق وقت سے ایسا ہو، لیکن اس تلازم کے ساتھ کہ یہ اندرونی صلاحیت بھی اتفاق وقت سے وابستہ ہے۔

یوں ایک کے دوسرے میں ڈھل جانے کے امکان کو اب زیادہ سے زیادہ مانا جانے لگا ہے۔ رائے بنتی جارہی ہے کہ اجرام فلکی کا انجام یہی ہونا ہے کہ وہ ایک دوسرے پر ٹوٹ کر گریں، اور حرارت کی اس مقدار کا بھی حساب کیا جا رہا ہے جو اس قسم کے ٹکرائو سے خارج ہوگی۔ فلکیات کا علم جو ہمیں اچانک نئے ستارے دمک اٹھنے اور

\* بے جان سر— یہاں مراد ہے مردہ باقیات سے۔ (ایڈیٹر)

پرانے ستاروں کی دمک بڑھ جانے کی بشارت دیتا ہے، وہ بھی اس تصادم کی روشنی میں آسانی سے گلے اترتی ہے۔ یہاں یہ بھی خیال رہے کہ صرف ہمارے سیاروں کا جھرمٹ ہی سورج کے چکر نہیں کاٹتا، اور ہمارا سورج ہی ہمارے کائناتی جزیرے کے اندر اندر نہیں گھومتا، بلکہ ہمارا یہ خلائی جزیرہ بھی کائنات کی بے کراں وسعتوں میں منڈلاتا رہتا ہے اور دوسرے ایسے ہی خلائی جزیروں سے اس کا وقتی توازن بنا رہتا ہے، کیوں کہ آزادانہ ہلتے ڈولتے اجرام کا یہ باہمی توازن بھی اسی حالت میں چل سکتا ہے جب آپس میں حرکت کے جوڑ ٹھیک بیٹھے ہوں۔ اس کے علاوہ بعضوں کا خیال ہے کہ عالم وجود کی وسعتوں میں ٹمپرچر ہر جگہ یکساں نہیں ہوتا۔ بالآخر اب ہم کو معلوم ہے کہ برائے نام زرا سا حصہ چھوڑ کر ہمارے خلائی جزیرے کے بے شمار سورجوں کی باقی تمام حرارت انہی بے کراں وسعتوں میں گم ہو جاتی ہے اور ان کا ٹمپرچر ایک ڈگری کا لاکھواں حصہ بڑھانے میں بھی ناکام رہتی ہے۔ حرارت کی یہ بے پناہ مقدار کہاں جاتی ہے؟ کیا وہ ان وسعتوں کو گرم کرنے کی کوشش میں ہمیشہ کے لئے برباد ہو جاتی ہے؟ عملی لحاظ سے اپنا وجود کھو بیٹھتی ہے؟ اور خیال کے لحاظ سے صرف اس حقیقت کی حد تک باقی رہتی ہے کہ کائنات کی بے کراں وسعتوں میں اپنے حصے کی حرارت ڈال دی، اور یہ حصہ ایک ڈگری کا ایک بٹا لاکھ کے قریب ہوتا ہے؟ یہ قیاس خود حرکت کے لازوال ہونے سے منکر ہے؛ البتہ اس بات کا امکان قبول کرنے کو تیار ہے کہ اجرام فلکی کے یکے بعد دیگرے ایک دوسرے پر ٹوٹ کر گرنے سے ساری موجودہ میکانیکی حرکت حرارت میں بدل جائے، اور وہ کائنات کی وسعتوں میں اپنی شعاعیں پھیلائے، جس کا نتیجہ یہ ہو کہ ”قوت کے لازوال“، ہونے کے باوجود حرکت کا سلسلہ عام طور سے ٹوٹ کر رہ جائے۔ (اتفاق سے یہاں اس بیان کی پول کھلتی ہے کہ لفظ ”حرکت کے لازوال ہونے“ کے بجائے ”قوت کا لازوال ہونا“، استعمال کیا گیا۔) یوں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کائنات کی وسعتوں میں حرارت کی شعاع ریزی کسی نہ کسی صورت سے یہ امکان ضرور رکھتی ہے کہ حرکت کی کسی اور شکل میں بدل جائے اور وہاں پھر سے



اکٹھی ہو کر اپنی عملی تاثیر دکھانے لگے۔ کس صورت سے ایسا اسکاں پیدا ہوتا ہے، یہ نیچرل سائنس کا فرض ہے کہ بعد میں کبھی ثابت کردے۔ بجھے ہوئے سورجوں کے پھر دھکتے ہوئے دھند میں بدل جانے کی راہ میں جو اصل دشواری تھی، وہ بھی اس طرح سے دور ہو جاتی ہے۔

یہ بھی ہے کہ دنیاؤں کا لگاتار ہمیشہ ہمیش کے لئے لامتناہی وقت میں دھرایا جانا منطقی لحاظ سے تکمیل کرتا ہے اس خیال کی کہ بے کراں وسعت میں بے شمار دنیاؤں بیک وقت موجود رہی ہیں۔ یہ ایسا کلیہ ہے کہ یانکی ڈریپر کا نظریہ شکن دماغ بھی اس کی ضرورت تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا \*۔

یہ ہے وہ ابدی چکر جس میں مادہ گھومتا رہتا ہے۔ اس چکر کے پورا ہونے میں اتنا کچھ وقت لگ جاتا ہے کہ ہمارا ارضی سال اس کے ناپ کی اکائی بننے قابل نہیں ہو سکتا؛ یہ وہ چکر ہے جس میں بڑی سے بڑی ترقی کا وقت بھی، نامیاتی جسموں کی زندگی کا وقت، اور اس سے بڑھ کر، ان موجودات کی مدت العمر جنہیں اپنا اور فطرت کا شعور ہے، یہ ساری مدت اتنا بے حیثیت پیمانہ ہے جیسے وہ وسعت جس کی حدوں کے اندر زندگی اور شعور ذات اپنا وجود رکھتے ہیں؛ یہ وہ چکر ہے کہ جس میں مادے کے وجود کی ہر ایک محدود شکل، عام اس سے کہ وہ سورج ہو یا دھکتا ہوا دھند، الگ الگ حیوانات ہوں یا ان کی پوری نسلی نوع، کیمیائی ترکیب ہو یا تحلیل، ایک سی حیثیت میں گزراں ہے، اور اس چکر میں کسی شے کو دائمی ثبات نہیں، ”ثبات صرف ایک تغیر کو ہے“، — دائمی صرف ہمیشہ ہمیش متحرک اور متبادل مادہ ہے، اور اس کی حرکت و تغیر

\* ”خلا کی بے کراں وسعت میں بہت ساری دنیاؤں کا وجود اس تصور کی طرف لے جاتا ہے کہ لامتناہی وقت میں یکے بعد دیگرے دنیاؤں کا وجود ہوا“۔

(J. W. Draper, «History of the Intellectual Development of Europe», Vol. 2, p. [325].)

کے قانون ہمیشہ رہتے ہیں۔ یہ چکر چاہے کتنی ہی بار، اور کتنی ہی بے دردی سے وقت اور مقام میں کیوں نہ چلتا ہو؛ چاہے کتنے ہی لاکھوں سورج اور زمینیں کیوں نہ ابھریں اور ڈوبیں؛ کسی ایک شمسی نظام میں، کسی بھی ایک سیارے پر نامیاتی جسموں کی زندگی کے حالات بننے میں وقت کا طول چاہے کتنا ہی ہوتا ہو؛ چاہے کتنے ہی بے شمار موجودات دنیا میں پہلے آئیں اور پہلے ہی سدھار جائیں تاکہ ان کے بعد انہی میں سے وہ حیوان اٹھیں جن کے پاس سوچنے قابل دماغ ہو، اور تھوڑی سی مدت کے لئے انہیں زندگی گزارنے کے مناسب حالات میسر آئیں، تاکہ پھر بے رحمی سے ان کا صفایا ہو جائے؛ یہ سب کچھ سہی، مگر ہمیں اتنا یقین ضرور نصیب ہے کہ مادہ کتنے ہی روپ بدل لینے پر بھی سدا جوں کا توں رہتا ہے، کہ اس کی ایک بھی صفت یا خاصیت کبھی برباد نہیں ہونے پاتی اور اسی لئے، اسی آہنی تلازم کے ساتھ، جس کے بل پر وہ کبھی نہ کبھی زمین پر اپنی سب سے اعلا تخلیق، یعنی سوچنے والے دماغ کو تباہ کرے گا، وہ بہر حال اسے پھر کہیں نہ کہیں کسی اور مقام، کسی اور وقت پر جنم دئے بغیر نہیں رہے گا۔

اینگلز نے ۷۶-۱۸۷۵ء میں تحریر کیا۔ اصل مسودے کے مطابق پہلی اشاعت جرمن اور روسی زبانوں میں ”مارکس اور اینگلز کے کاغذات کا محافظ خانہ“ کی کتاب دوم، ۱۹۲۵ء میں ہوئی۔



کے مطالعے نے مصنف کو اپنے پہلے والا ارادہ بدل ڈالنے کی راہ سجھائی۔ اب صورت یہ بنی کہ الگ الگ کتاب لکھنے کے بجائے مارکس نے کتاب ”سرمایہ“ (Capital) لکھ دی جس میں اپنی کتاب ”سیاسی معاشیات کی تنقید پر“ کے خاص خاص خیالات بھی نظرثانی کے بعد شامل کر لئے۔ صفحہ ۷

۲۔ یہاں اشارہ ہے اس نامکمل ”دیباچہ“ کی طرف جو مارکس نے سوچا تھا کہ معاشیات پر اپنی جامع تصنیف کے شروع میں دے گا۔ صفحہ ۷

۳۔ «Rheinische Zeitung für Politik, Handel und Gewerbe»

(”سیاست، تجارت اور صنعت کے مسائل پر رائی اخبار“)

یہ ایک روزنامہ تھا جو پہلی جنوری ۱۸۴۲ء سے ۳۱ مارچ ۱۸۴۳ء تک کولون سے جرمن زبان میں شائع ہوتا رہا۔ اپریل ۱۸۴۲ء سے مارکس نے اس اخبار میں لکھنا شروع کیا اور اکتوبر میں وہ بھی اس کے ایڈیٹروں میں شامل ہو گیا۔ صفحہ ۸

۴۔ «Allgemeine Zeitung» (”عام اخبار“)

یہ ایک رجعت پرست روز نامہ تھا جو ۱۷۹۸ء سے شائع ہوا، ۱۸۱۰ء سے ۱۸۸۲ء تک وہ آگس برگ کے مقام سے چھپتا رہا۔ ۱۸۴۲ء میں اس نے ایک مضمون میں یوٹیوپیائی (قیاسی) کمیونزم اور سوشلزم کے خیالات توڑ مروڑ کر چھاپے۔ مارکس نے اپنے مضمون ”کمیونزم اور آگس برگ« Allgemeine Zeitung»، میں اس بدعنوانی کا کچا چٹھا پیش کر دیا۔ صفحہ ۸

۵۔ «Deutsch - Französische Jahrbücher» (”جرمن فرانسیسی

سال نامہ“)

پیرس سے جرمن زبان میں یہ کتاب شائع ہوئی تھی۔ کارل مارکس اور آرنلڈ روگے اس کے ایڈیٹر تھے۔ فروری ۱۸۴۴ء میں اس کی ایک ڈبل اشاعت نکلی جس میں مارکس اور اینگلس کی وہ تحریریں شامل تھیں جن تحریروں سے ظاہر

## تشریحی نوٹ

۱۔ ”سیاسی معاشیات (پولٹیکل اکنومی) کی تنقید پر“، کارل مارکس

کی تصنیف مارکسی سیاسی معاشیات کے وجود میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ اس کتاب پر قلم اٹھانے سے پہلے مارکس نے پندرہ سال تحقیق اور تلاش میں بسر کئے، بے شمار ادب چھان مارا، تب جا کے وہ اپنے معاشی نظریے کا خاکہ تیار کرنے قابل ہوا۔ شروع میں نیت یہ تھی کہ اپنی تحقیقات کے نتیجے ایک ایسی جامع تصنیف میں پیش کر دے جو خاص اسی مضمون سے متعلق ہو۔ اگست ستمبر ۱۸۵۷ء میں اس نے اپنے علم ذخیرے کو ترتیب دینا اور پہلا کچا خاکہ پھیلانا شروع کیا۔ چند مہینے گزرے ہوں گے کہ مارکس نے مفصل پلان تیار کر لیا اور فیصلہ کیا کہ اپنی تصنیف الگ الگ اشاعتوں کی صورت میں حصے حصے کر کے شائع کر دے۔ چنانچہ برلن کے ایک پبلشر ڈنکر سے ایک ابتدائی معاہدہ کر کے اس نے پہلے مضمون پر کام کا بیڑا اٹھایا اور یہ کتاب جون ۱۸۵۹ء میں شائع بھی ہو گئی۔

پہلی اشاعت کے فوراً بعد مارکس نے دوسری کی تیاری کی، جس میں سرمائے کے مسائل سے بحث ہونی تھی۔ لیکن آگے



ہوتا ہے کہ یہ دونوں مادیت کے فلسفے اور کمیونزم کے نظریے کی طرف کوچ کرنے کو تیار ہو چکے ہیں۔ سالنامہ اس کے بعد نہیں نکلا اور بڑی وجہ یہ کہ مارکس کے خیالات نے بورژوا ریڈیکل روگے کے خیالات سے میل نہیں کھایا اور اختلاف نے اشاعت روک دی۔ صفحہ ۹

۶۔ جرمن ورکرز سوسائٹی کی بنیاد مارکس اور اینگلس نے اگست ۱۸۴۷ء میں بروسیلز میں اس نیت سے رکھی تھی کہ بلجیم میں جو جرمن ورکر بستی ہیں، ان کی سیاسی تعلیم ہو اور ان میں سائنسی کمیونزم کے خیالات کا پرچار کیا جائے۔ ان دونوں رہنماؤں اور ان کے حامیوں کی سرپرستی میں یہ سوسائٹی بلجیم میں جرمن انقلابی پرولتاریہ کو جوڑنے کا ایک قانونی مرکز بن گئی۔ اس کے بہترین کارکن بروسیلز میں کمیونسٹوں کی لیگ میں شامل ہو گئے۔ فروری ۱۸۴۸ء میں جب فرانس کا انقلاب برپا ہوا تو بلجیم کی پولیس نے اس سوسائٹی کے ممبروں کو جلاوطن کر دیا اور یوں بروسیلز میں اس جماعت کی سرگرمیاں بکھر کر رہ گئیں۔ صفحہ ۱۲

۷۔ یہاں اشارہ ہے فروری ۱۸۴۸ء کے اس انقلاب کی طرف جو فرانس میں برپا ہوا تھا۔ صفحہ ۱۲

۸۔ «Neue Rheinische Zeitung. Organ der Demokratie» (”نیا رائنی اخبار۔ ڈیموکریسی کا ترجمان“،)۔ جرمن زبان کا روزنامہ تھا جو کولون شہر سے مارکس کی ایڈیٹری میں پہلی جون ۱۸۴۸ء سے ۱۹ مئی ۱۸۴۹ء تک نکلتا رہا۔ اس کی ادارت میں مارکس کے ساتھ اینگلس بھی شریک تھا۔ صفحہ ۱۲

۹۔ «The New York Daily Tribunes» — یہ ایک ترقی پسند بورژوا روزنامہ تھا جو ۱۸۴۱ء سے ۱۹۲۴ء تک برابر شائع

ہوتا رہا۔ مارکس اور اینگلس نے اس کے کالموں میں اگست ۱۸۵۱ء سے مارچ ۱۸۶۲ء تک لکھا۔ صفحہ ۱۳

۱۰۔ پہلی انٹرنیشنل کی جنرل کونسل کا اجلاس جون ۱۸۶۵ء لندن میں ہوا تھا جہاں مارکس نے یہ مقالہ اپنی تقریر کی صورت میں پڑھا تھا۔ مارکس نے پہلی بار اس موقع پر قدرزائد (surplus value) کے اپنے نظریے کی بنیاد مجمع عام میں پیش کی۔ اگرچہ اس مقالے کا روئے سخن انٹرنیشنل کے ایک ممبر جان ویسٹن کی طرف ہے، جس کا کہنا تھا کہ اجرتیں بڑھوانے سے مزدوروں کی حالت بہتر نہیں ہو سکتی لہذا ٹریڈیونین سرگرمی کو ورکروں کے مفاد کے خلاف سمجھنا چاہئے، لیکن ساتھ ہی اس مقالے سے مارکس نے پرودھوں اور لاسال، دونوں کے نظریات پر بھی سخت ضرب لگائی، جنہیں مزدوروں کی معاشی جدوجہد اور ٹریڈیونینوں کی سرگرمی ناگوار تھی۔ مارکس نے یہاں اس بات کی ڈٹ کر مخالفت کی ہے کہ مزدوروں کو سرمائے کی لوٹ کھسوٹ کے سامنے بے بسی اور فرمان برداری سکھائی جائے، وہ نظریے کی بنیاد تیار کر کے بتاتے ہیں کہ مزدوروں کی معاشی جدوجہد کی کیا اہمیت ہے، اس کا کیا رول ہے اور کیسے اس لڑائی کو پرولتاریوں کے اس مقصد کی پابندی کرنی اور اس منزل کی لگن رہنی چاہئے کہ اجرتی محنت (مزدوری) کے اس نظام کا ہی صفایا کر دیا جائے۔ اس تقریر کی اصل عبارت مارکس کے مسودوں میں محفوظ رہ گئی۔ پہلی بار ۱۸۹۸ء میں لندن میں مارکس کی بیٹی ایلینورا نے ”قدر، قیمت اور منافع“ کے عنوان اور اپنے شوہر انگریزی سوشلسٹ ایڈورڈ ایویلینگ کے دیباچے کے ساتھ یہ مقالہ شائع کرایا۔ مارکس کے مسودے میں تعارف اور شروع کے چھ بابوں کا کوئی عنوان نہیں تھا۔ ایویلینگ نے ان پر عنوان لگائے اور یہاں جس صورت میں شائع کیا جا رہا ہے بعینہ اصل کے مطابق ہے، سوائے اس کے کہ مضمون کا نام بدل دیا گیا۔ صفحہ ۱۴



۱۱۔ انٹرنیشنل ورکنگ مینز ایسوسی ایشن (پہلی انٹرنیشنل)۔ یہ پروتاریوں کی پہلی بین الاقوامی جماعت تھی جس کی رہنمائی مارکس اور اینگلس کر رہے تھے (۱۸۷۶ء-۱۸۶۳ء)۔ اس جماعت نے بڑے بڑے سرمایہ دار ملکوں کے ترقی یافتہ مزدوروں میں سائنسی سوشلزم کے خیالات پھیلانے اور (لینن کے الفاظ میں) ”محنت کشوں کی بین الاقوامی انجمن کی بنیاد ڈالی تاکہ سرمائے پر انقلابی حملے کی تیاری کی جائے“۔ اس انٹرنیشنل کا تفصیلی بیان دیکھنا ہو تو ملاحظہ کیجئے اینگلس کا وہ دیباچہ جو اس نے ”کمیونسٹ پارٹی کے مینی فسٹو“ کے جرمن ایڈیشن ۱۸۹۰ء پر لکھا ہے اور مارکس کا وہ خط، جو اس نے ۲۳ نومبر ۱۸۷۱ء کو بولٹے کے نام بھیجا تھا (یہ تحریریں پہلی اور چوتھی جلد میں شامل ہیں)۔ صفحہ ۱۴

۱۲۔ محنت کشوں نے کام کے دن پر دس گھنٹے روز کی قانونی پابندی لگوانے کے لئے ۱۸ ویں صدی کے آخر میں اور پھر ۱۸۳۰ء کے بعد کے برسوں میں جو جدوجہد انگلینڈ میں چھیڑی اس نے پروتاریوں کی بہت بڑی تعداد کو اپنی لیپٹ میں لے لیا۔ چنانچہ ۸ جون ۱۸۴۷ء کو برطانوی پارلیمنٹ نے بچوں اور عورتوں کے حق میں دس گھنٹے کی پابندی منظور کر لی۔ قانون منظور ہونے پر بھی بہت سے مالکان کارخانہ نے اس پر ایک عرصے تک عمل نہیں کیا۔ صفحہ ۲۵

۱۳۔ فرانس بورژوا انقلاب ۹۴-۱۷۹۳ء کے زمانے میں جیکوبین کنونشن نے ایک قاعدہ بنایا جس کے مطابق بازار کے بعض سامانوں پر قیمتوں کا کنٹرول کر دیا گیا اور اسی کے ساتھ اجرتوں کی بھی اونچی سے اونچی حد مقرر کر دی گئی۔ صفحہ ۲۵

۱۴۔ سائنس کی ترقیوں کی برطانوی سوسائٹی ۱۸۳۱ء میں بنی تھی اور آج تک چل رہی ہے۔ مارکس نے یہاں ایک تقریر کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس سوسائٹی کے معاشی بازو کے اجلاس

منعقدہ ستمبر ۱۸۶۱ء میں ایک شخص ڈبلیو۔ نیوسین (نیو مارچ) نے کی تھی (مارکس نے نام لکھنے میں زرا سی غلطی کی ہے)۔ صفحہ ۲۶

۱۵۔ ملاحظہ ہو رابرٹ اووین کی کتاب ”کارخانہ داری نظام کے اثر پر کچھ مشاہدے“، R. Owen «Observations on the Effect of the Manufacturing System», London, 1817. p. 76 صفحہ ۲۶

۱۶۔ جنگ کرائیمیا کا حوالہ آیا ہے جو ۱۸۵۳ء سے ۱۸۵۶ء تک چلی۔ صفحہ ۲۸

۱۷۔ پچھلی صدی کے وسط میں دیہاتی علاقوں کے بہت سارے رہائشی مکان ڈھا ڈھے گئے۔ اس کی وجہ یوں بیان کی جا سکتی ہے کہ جاگیرداروں سے جو ٹیکس غریبوں کی بھلائی کے لئے وصول کیا جاتا تھا، وہ بڑی حد تک غریبوں کی اس تعداد کے حساب سے ہوتا تھا جو ان کی زمین جائداد پر آباد ہو۔ جاگیرداروں نے ایسے مکانات، جن کی ضرورت نہ رہ گئی تھی، مگر جن میں دیہات کی زائد آبادی سر چھپانے کی جگہ پاتی تھی، جان بوجھ کر سمار کرا ڈھے۔ صفحہ ۲۸

۱۸۔ سوسائٹی آف آرٹس (Society of Arts)۔ یہ ایک بورژوا تعلیمی اور رفاه عام کی سوسائٹی تھی جو لندن میں ۱۷۵۴ء میں قائم کی گئی۔ یہاں جس تقریر کا حوالہ آیا ہے وہ جان مارٹن کے صاحبزادے جان چالمرس مارٹن نے پڑھی تھی۔ صفحہ ۲۸

۱۹۔ اناج کے قانون کے نام سے انگلینڈ نے قانون بنایا تھا تاکہ باہر ملکوں سے اناج کی درآمد پر پابندی لگائی جائے اور ملکی جاگیرداروں کے مفاد کی حفاظت کی جائے۔ ۱۸۳۸ء میں مانچسٹر کے مل مالکوں کو بڈین اور براٹھ نے ایک انجمن بنائی ”اینٹی کورن لیگ“ کے نام سے، مقصد یہ کہ کھلی تجارت کے مطالبے پر زور دیا جائے۔ اس لیگ نے ”اناج کے قانون“ کے خلاف ہنگامہ کھڑا کر دیا تاکہ ایک طرف



مزدوروں کی اجرت گھٹائی جائے، دوسری طرف جاگیرداروں کی معاشی اور سیاسی حیثیت گرائی جائے۔ چنانچہ ۱۸۳۶ء میں یہ قانون منسوخ کر دیا گیا جس کے معنی تھے کہ صنعتی بورژوازی نے صاحب جائیداد طبقے پر فتح پائی۔ صفحہ ۲۹

۲۰۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی خانہ جنگی (۶۵-۱۸۶۱ء)۔

اس میں ایک جانب شمال کی صنعتی ریاستیں تھیں اور دوسری جانب جنوب کی غلاموں سے محنت لینے والے شورش پسندوں کی ریاستیں۔ انگلینڈ کے مزدور طبقے نے اپنے یہاں کے سرمایہ داروں کے خلاف آواز بلند کی جن کی پالیسی یہ تھی کہ غلاموں والے فریق کی مدد کی جائے۔ مزدور طبقے نے انگلینڈ کو اس خانہ جنگی میں دخل دینے سے روکا۔ صفحہ ۲۹

۲۱۔ Physiocrats — فرانس میں اٹھارویں صدی کے وسط میں بورژوا

سیاسی معاشیات میں یہ ایک رجحان چلا تھا۔ اس رجحان کے حامی بڑی سختی سے اس بات کے حق میں تھے کہ بڑے پیمانے پر سرمایہ دارانہ زراعت ہونی چاہئے، بعض طبقوں کو جو خاص حقوق حاصل ہیں، ان کا خاتمہ اور حفاظتی محصولات کا خاتمہ ہونا چاہئے۔ ان لوگوں کو جاگیرداری نظام کے خاتمے کی ضرورت کا پورا احساس تھا لیکن پرانے اصلاحات کے ذریعے اس طرح یہ عمل کرنا چاہتے تھے جس سے حکمران طبقے اور مطلق العنانی کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ فزیوکریٹوں کے فلسفیانہ خیالات تقریباً ویسے ہی تھے جیسے اٹھارویں صدی کے فرانسیسی روشن خیال اہل علم کے۔ اس صدی کے آخر میں جب انقلاب فرانس برپا ہوا تو ان لوگوں کی تجویز کی ہوئی اکثر معاشی اصلاحوں کو عملی جامہ پہنا دیا گیا۔ صفحہ ۵۱

۲۲۔ آدم اسمتھ کی تصنیف ”فطرت اور قوموں کی دولت کے اسباب کی تحقیق“ (A. Smith «An Inquiry into the Nature and Causes of the Wealth of Nations». Vol I, Edinburgh, p. 93.) صفحہ ۵۲

۲۳۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں انقلاب فرانس کے زمانے میں انگلینڈ نے فرانس سے جو جنگیں لڑی تھیں، ان کی طرف اشارہ ہے۔ ان دنوں انگلینڈ میں حکومت نے دہشت کا دور دورہ کر رکھا تھا تاکہ محنت کشوں کی زبان بندی کی جائے، خاص کر عوامی شورشوں کو بے رحمی سے کچلا گیا اور مزدور یونینوں کی ممانعت کے قانون بنائے گئے۔ صفحہ ۷۴

۲۴۔ مارکس نے یہاں مالتھوس کے اس مشہور پمفلٹ کا حوالہ دیا ہے: ”لگان کی فطرت، اس کے بڑھنے کی اور ان اصولوں کی تحقیق، جو لگان کے قانون طے کرتے ہیں“ (Malthus «An Inquiry into the Nature and Progress of Rent, and the Principles by Which it is Regulated». London, 1815.) صفحہ ۷۵

۲۵۔ ”محنت گھر“، سترھویں صدی کے انگلینڈ میں بنائے گئے تھے۔ ۱۸۳۴ء میں جب ”قانون مفلسی“ جاری ہوئے تو پھر یہ محنت گھر صرف خیرات گھر رہ گئے۔ ان کے قاعدے قانون جیلوں کی طرح اتنے کڑے تھے کہ بعد میں لوگوں نے انہیں ”غریبوں کے جیل گھر“ کہنا شروع کر دیا۔ صفحہ ۷۵

۲۶۔ جگن ناتھ — ہندو مت میں بھگوان وشنو کا ایک روپ۔ اس مت کے ماننے والوں میں مذہبی جنون اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ رتھ یا ترا کے موقع پر بعض لوگ خود کو جگن ناتھ کے بھاری بھرکم رتھ کے نیچے ڈال دیا کرتے تھے اور ایسی موت کو شبہ سمجھتے تھے۔ اب بھی یہ تیوہار بڑے پیمانے پر منایا جاتا ہے۔ صفحہ ۷۷

۲۷۔ ”قانون مفلسی“، جو ۱۶ ویں صدی کے انگلینڈ میں جاری تھا، اس کے مطابق ہر ایک کھاتے پیتے زمیندار کو غریبوں کی بھلائی کے لئے ٹیکس دینا پڑتا تھا۔ جو خاندان اپنی کفالت کے قابل نہ رہتے انہیں خیراتی سوسائٹیوں کے فنڈ سے مالی مدد دی جاتی تھی۔ صفحہ ۸۲



۲۸ - حوالے کے لئے ملاحظہ ہو ڈیوڈ ریکارڈو کی تصنیف ”سیاسی معاشیات اور محصول لگانے کے اصولوں پر“ (D. Ricardo, «On the Principles of Political Economy, and Taxation». London, 1821, p. 479.) صفحہ ۸۴

۲۹ - کتاب ”سرمایہ“، «Das Kapital» - مارکس کی وہ زبردست تصنیف، جو اس کی عمر بھر کی محنت کا حاصل ہے۔ ۱۸۴۰ء کے بعد سے مارکس نے اس پر کام شروع کیا اور چالیس سال تک یہ تصنیف زیر نظر رہی (پھر مصنف کی عمر نے وفا نہ کی)۔ ۱۸۴۳ء کے آخر میں پیرس کے دوران قیام میں مارکس نے سیاسی معاشیات کے باضابطہ مطالعے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ شروع کی تحقیقات کا ثمرہ ان تصنیفوں میں ملتا ہے جن کے نام ہیں: ”۱۸۴۴ء کے معاشیاتی اور فلسفیانہ مسودے“، ”جرمن آئیڈیالوجی“، ”فلسفے کا افلاس“، ”مزدوری اور سرمایہ“، ”کمیونسٹ پارٹی کا مینی فسٹو“، وغیرہ وغیرہ۔ انہی تحریروں میں مارکس نے اس بنیاد کا کھوج لگایا جو سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ کی تہہ میں ہوتی ہے، سرمایہ داروں کے مفاد اور محنت مزدوری پر کام کرنے والوں کے مفاد میں جو ناقابل حل تضاد ہوتا ہے، سرمایہ داری کے اقتصادی رشتوں میں جو ٹکراؤ اور عارضی کیفیت پائی جاتی ہے، اس کا سراغ نکالا۔ ۱۸۴۸-۴۹ء کے انقلاب نے کام کا تسلسل توڑ دیا، لیکن جب اگست ۱۸۴۹ء میں مارکس ترک وطن کر کے لندن پہنچا تو پھر معاشی مطالعے اور چھان بین کی کڑیاں ملانے بیٹھ گیا۔ ۱۸۵۷-۵۸ء میں پچاس سے زیادہ فارم کا ایک مسودہ تیار کیا جسے کتاب ”سرمایہ“ کا نقش اول کہنا چاہئے۔ ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۱ء کے درمیان اصل جرمن زبان میں اس کی پہلی اشاعت ہوئی جو سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے مارکسی لیننی انسٹیٹیوٹ کی طرف سے عمل میں آئی تھی۔ اور اس کا وہی نام بھی تھا: «Grundrisse der Kritik der politischen Oekonomie» (”سیاسی معاشیات

کی تنقید کے خاص پہلو“۔ انہی دنوں مارکس نے پوری تصنیف کا پہلا مکمل خاکہ بھی تیار کر لیا تھا جسے بعد کے مہینوں میں تفصیلات سے آراستہ کیا۔ اپریل ۱۸۵۸ء میں مارکس کا خیال تھا کہ یہ کتاب چھ جلدوں میں شائع کی جائے۔ مگر ہوا یہ کہ الگ الگ جلدوں میں اس کی قسطوار اشاعت کا فیصلہ کر دیا۔ ۱۸۵۸ء میں اس سلسلے کی کتاب اول لکھنی شروع کی جس کا عنوان تھا ”سیاسی معاشیات کی تنقید پر“۔ ۱۸۵۹ء میں یہ کتاب شائع ہو گئی۔ ۱۸۶۱ء اور ۱۸۶۳ء کے درمیان جب اگلے حصوں کی تیاری جاری تھی مارکس نے کوئی ۲۰۰ فارموں کی ایک بڑی کتاب ۲۳ نوٹبکوں پر لکھ لکھ کر پوری کر لی اور اس کا بھی وہی عنوان تھا جو ۱۸۵۹ء والی کتاب کو دیا تھا۔ اور اس کا بیشتر حصہ (چھٹی سے پندرھویں نوٹبک اور اٹھارویں نوٹبک) معاشی نظریات کی تاریخ سے بحث کرتا تھا۔ یہ مسودہ اشاعت کے لئے تیار کیا گیا اور مارکسی لیننی انسٹیٹیوٹ (ماسکو) کی طرف سے روسی زبان میں ”قدرزائد کے نظریے“ کے نام سے شائع ہوا (کتاب ”سرمایہ“ کی جلد چہارم)۔ دوسری نوٹبکوں میں کم و بیش وہی موضوعات ہیں جن کا تفصیلی بیان کتاب ”سرمایہ“ کی پہلی تین جلدوں میں آچکا ہے۔

اپنے کام کا سلسلہ آگے بڑھاتے وقت مارکس نے تصنیف کا منصوبہ اس طرح بدل ڈالا کہ جتنا کچھ جلدوں میں دینا تھا، وہ چار میں ہی مکمل کر دیا جائے۔ ۱۸۶۳ء اور ۱۸۶۵ء کے درمیان ایک تازہ اور جامع مسودہ تیار کیا جو کتاب ”سرمایہ“ کی اول تینوں جلدوں کا ایک مفصل بیان تھا۔ جب تصنیف کے سارے کاغذات جنوری ۱۸۶۶ء میں مکمل ہو گئے، تب مارکس نے آخری قلم لگایا اور ترتیب ہاتھ میں لی۔ اینگلس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اس نے فیصلہ کیا کہ پیرس کے لئے پوری تصنیف کو ایک ساتھ اور ایک دم نہیں، بلکہ باری باری تیار کرے اور یوں وہ



جلد اول کو پہلے مکمل صورت دے دے۔ آخری قلم لگاتے وقت مارکس نے اتنی گہرائی اور بصیرت سے کام لیا کہ نتیجے میں کتاب ”سرمایہ“ کی جلد اول بالکل نئی صورت میں ڈھل کر سامنے آئی۔

ستمبر ۱۸۶۷ء میں جلد اول کی اشاعت کے بعد بھی مارکس اس پر کام کرتا رہا اور اسی عرصے میں جرمن زبان کے نئے ایڈیشن کی تیاری اور دوسری زبانوں میں اس کے ترجمے کی ترتیب بھی جاری رکھی۔ ۱۸۷۲ء کے دوسرے ایڈیشن میں اس نے بہت سی تبدیلیاں کر ڈالیں، اور روسی ایڈیشن کی تیاری کے سلسلے میں مفصل ہدایات بھیجیں۔ یہ روسی ایڈیشن سینٹ پیٹرسبورگ (حال لینن گراد) سے ۱۸۷۲ء میں شائع ہوا جو کتاب ”سرمایہ“ کا کسی غیرملکی زبان میں پہلا ترجمہ تھا۔ فرانسیسی ترجمے کی اشاعت ۱۸۷۲ء سے ۱۸۷۵ء تک جدا جدا حصوں میں ہوئی اور اس پر بھی مارکس نے کاٹ چھانٹ اور اہم تبدیلیوں کا عمل جاری رکھا۔

ساتھ ساتھ مارکس باقی جلدوں پر بھی برابر کام کرتا رہا تاکہ پوری کی پوری تصنیف تھوڑی مدت میں تیار ہو جائے۔ مگر اس ارادے کی تکمیل یوں نہ ہو سکی کہ اپنی تصنیف پر محنت کرنے کے علاوہ مصنف کو پہلی انٹرنیشنل کی جنرل کونسل کی کارروائیوں میں وقت دینا پڑتا تھا۔ کثرت کار سے صحت بگڑتی گئی اور کام میں زیادہ سے زیادہ خلل پڑتا چلا گیا۔ پہلی جلد مارکس کے سامنے نکل چکی تھی، باقی کی دو جلدیں مارکس کی آنکھ بند ہونے کے بعد اینگلس نے پریس کے حوالے کیں۔ دوسری ۱۸۸۵ء میں اور تیسری ۱۸۹۴ء میں۔ اس کام کو تکمیل کے درجے تک پہنچانے میں اینگلس نے سائنسی کمیونزم کے خزانے میں پیش بہا جواہرات کا اضافہ کر دیا۔ اس حصہ دوم میں کتاب ”سرمایہ“ کی جلد اول کے ۲۴ ویں باب کا تھوڑا سا مضمون شامل ہوا ہے اور یہاں مارکس کے دئے ہوئے حاشیے جوں کے توں رہنے دئے گئے ہیں۔ صفحہ ۸۸

۳۰۔ مارکس کا مطلب یہاں کتاب ”سرمایہ“ کے پہلے جرمن ایڈیشن کی جلد اول کے پہلے باب سے ہے (”مال اور زر“۔)۔ اس جلد کے دوسرے ایڈیشن اور بعد کے جرمن ایڈیشنوں میں یہی باب پہلا حصہ ہو جاتا ہے۔ صفحہ ۸۸

۳۱۔ یہاں اشارہ ہے تیسرے باب کی طرف، ملاحظہ ہو فرڈیننڈ لاسال کی کتاب: ”بستیاشولتسے دیلیچ صاحب، معاشی جولیان یعنی سرمایہ اور محنت“ (Ferdinand Lassalle «Herr Bastiat-Schulze von Delitsch, der ökonomische Yulian, oder: Kapital und Arbeit». Berlin, 1864) صفحہ ۸۹

۳۲۔ شمالی امریکہ کی جنگ آزادی جو ۱۷۷۵ء سے ۱۷۸۳ء تک چلی۔ انگلینڈ کی شمالی امریکی نوآبادیوں میں وہ امریکی بورژوا قوم ابھری جو برطانوی سلطنت سے آزادی پا کر اپنے ہاں سرمایہ داری کی اٹھان پر سے ایک بوجھ اتار دینا چاہتی تھی۔ امریکیوں کی فتح نے بالآخر ایک آزاد بورژوا ریاست کو جنم دیا جس کا نام رکھا گیا: ریاست ہائے متحدہ امریکہ۔ صفحہ ۹۲

۳۳۔ کلیسائے اعلا۔ انگریزی کلیسا کا ایک فرقہ، جس میں زیادہ تر اشراف طبقے کے لوگ شامل تھے۔ اس نے پرانے شان و شکوہ کو قائم رکھا اور کیتھولک عقیدے سے اپنی وابستگی پر اصرار کیا۔ صفحہ ۹۳

۳۴۔ نیلی کتاب (Blue Books) — برطانوی پارلیمنٹ اور وزارت خارجہ کے دستاویزی کاغذات کی اس کتاب کو کہتے ہیں جو عموماً نیلی دفتی کے ساتھ شائع کی جاتی ہے۔ ۱۷ ویں صدی سے اس کتاب کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔ ملک کی اقتصادی حالت اور خارجہ پالیسی پر یہ کتاب خاص خاص معلومات کا ایک سرکاری دفتر سمجھی جاتی ہے۔ یہاں جس کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے وہ لندن سے ۱۸۶۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ صفحہ ۹۳



۳۵- پیکر ”سماجی اور سیاسی معاشیات کا نیا نظریہ یا سماج کی تنظیم کا مطالعہ“ (C. Pecqueur «Théorie nouvelle d'économie sociale et politiques, ou Études sur l'organisation des sociétés» Paris, 1842, p. 435) صفحہ ۹۶

۳۶- اینگلز نے اپنی تصنیف ”جرمنی میں کسانوں کی جنگ“ کے دوسرے ایڈیشن کے لئے فروری ۱۸۷۰ء میں ایک دیباچہ لکھا تھا (۱۶ ویں صدی میں جرمن کسانوں نے جاگیرداری کے خلاف شورش اٹھائی تھی اسی پر یہ کتاب ہے)۔ اس دیباچے میں اینگلز نے ان تبدیلیوں کی باریکیاں ظاہر کی تھیں جو ۱۸۳۸ء کے بعد سے ملک کی اقتصادی اور سیاسی زندگی میں رونما ہو چکی تھیں اور بتایا تھا کہ جرمن تاریخ کے اس دور میں مختلف طبقوں اور پارٹیوں کا کیا رول رہا ہے۔ مارکس اور اینگلز ۴۹-۱۸۴۸ء کے انقلابات کے تجربے سامنے رکھ کر اپنی کئی تصنیفوں میں پرولتاریوں اور کسانوں کے اتحاد کی ضرورت جتا چکے تھے۔ یہاں اس تصنیف میں اسی سمت میں نہایت اہم نظریاتی اور سیاسی نتیجے بڑی تفصیل اور جامعیت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ اینگلز نے اس بات کو ثابت کر کے دکھایا ہے کہ کسانوں کے معاملے میں بڑی چھان پھٹک کی ضرورت ہے اور تجزیے سے معلوم کیا ہے کہ کسانوں میں وہ کس درجے کے لوگ ہیں جو انقلابی جدوجہد میں پرولتاریہ کا ساتھ دیں گے اور کیوں ساتھ دیں گے۔ ۱۸۷۴ء میں جب اینگلز نے اپنی اس تصنیف کے تیسرے ایڈیشن کی تیاری میں مصروف تھا تو اس نے ۱۸۷۰ء والے ایڈیشن کے دیباچے میں جا بجا کارآمد حاشیے بڑھا دیئے، جہاں اشتراکی اور مزدور تحریک میں نظریے کی اہمیت پر زور دیا گیا اور یہ جتایا گیا کہ عوام کی ذہنی تربیت اس طرح کی جائے کہ ان میں پرولتاریائی انٹرنیشنلزم کا جذبہ بیدار ہو۔ انہی حاشیوں میں اینگلز نے مزدور طبقے اور اس کی پارٹی کے کردار، اس کے

فریضے اور جدوجہد کے طریقوں پر بھی نہایت قیمتی ہدایات کا خاکہ شامل کیا ہے۔ صفحہ ۱۰۱

۳۷- «Neue Rheinische Zeitung. Politisch-ökonomische Revue»

(”نیا رائنی اخبار، سیاسی معاشی تبصرہ“،)۔ یہ اخبار ”کمیونسٹ لیگ“ کے خیالات کا ترجمان تھا، مارکس اور اینگلز نے اس کی داغ بیل ڈالی تھی۔ دسمبر ۱۸۴۹ء سے صرف ایک سال نکلا اور سب ملا کر چھ شمارے شائع ہوئے۔ صفحہ ۱۰۱

۳۸- یہاں زیمرمین کی اس کتاب کا حوالہ ہے جو تین جلدوں میں اشوٹ گارٹ شہر سے ۴۸-۱۸۴۱ء میں شائع ہوئی تھی: «Allgemeine Geschichte des großen Bauern Krieges» (”کسانوں کی عظیم الشان جنگ کی عام تاریخ“،)۔ صفحہ ۱۰۱

۳۹- یہاں اشارہ ہے اس انتہائی بائیں بازو کی طرف جو کل جرمن قومی اسمبلی میں موجود تھا۔ اسمبلی فرینکفرٹ آن مین میں ۴۹-۱۸۴۸ء کے انقلاب کے زمانے میں قائم ہوئی تھی۔ اگرچہ یہ اسمبلی چھوٹی بورژوازی کے مفاد کی ترجمان تھی، تاہم جرمن مزدوروں کا ایک حصہ بھی اس کی تائید میں تھا۔ اس قومی اسمبلی کے ذمے خاص یہ کام تھا کہ جرمنی کا سیاسی تفرقہ دور کرے اور پورے ملک کے لئے عام آئین بنائے۔ لیبرل اکثریت کی بزدلی اور ہچکچاہٹ کی وجہ سے اسمبلی نہ طاقت اپنے ہاتھ میں لے سکی، نہ جرمن انقلاب کے بنیادی اصولوں پر کوئی پختہ فیصلہ کر کے اس پر ثابت قدم رہ سکی۔ ۳۰ مئی ۱۸۴۹ء کو اسمبلی فرینکفرٹ چھوڑ کر اشوٹ گارٹ اٹھ آئی اور پھر ۱۸ جون ۱۸۴۹ء کو فوج نے اس کو درہم برہم کر دیا۔ صفحہ ۱۰۱

۴۰- آسٹریا اور پروشیا کی جنگ ۱۸۶۶ء میں پروشیا کی فتح پر تمام ہوئی اور یوں ان دونوں ملکوں کی پرانی رسہ کشی کا خاتمہ



ہو گیا۔ اسی کے ساتھ پروشیا کی بالا دستی میں جرمنی کے متحد ہو جانے کی راہ ہموار ہو گئی۔ کئی جرمن ریاستوں نے اس جنگ میں آسٹریا کا ساتھ دیا اور پروشیا کی طرفداری اٹلی نے کی۔ پراگ میں جو امن کا عہدنامہ طے پایا اس کے مطابق آسٹریا نے شلیزویگ اور ہولشٹن سے پروشیا کے حق میں دستبرداری لکھ دی، تھوڑا بہت ہرجانہ ادا کرنا اپنے ذمے لیا اور وینس کا مقام اطالوی سلطنت کے حوالے کر دیا۔ ویانا کانگریس کے فیصلے کے مطابق ۱۸۱۵ء میں جو ”جرمن یونین“ بنی تھی اور جس میں تیس جرمن ریاستیں ملائی گئی تھیں، اسے منسوخ کر کے یہ طے پایا کہ شمالی جرمن کانفڈریشن بنایا جائے جو پروشیا کے اقتداراعلا کے تحت رہے۔ آسٹریا اس کانفڈریشن سے الگ رہا۔ جنگ کے نتیجے میں پروشیا نے ہنوور کی سلطنت، ہیسے کاسیل کا انتخابی حلقہ، نساؤ کا نوابی علاقہ اور فرینکفرٹ آن مین کا آزاد شہر بھی اپنے اندر ضم کر لیا۔ جنگ میں آسٹریا کی تباہ کن شکست سے، اور قومی آزادی کی بڑھتی ہوئی تحریک سے ایسا سیاسی بحران ابھڑا کہ ان حالات میں ملک کے رجعت پرست حلقوں کو ایک طرف تو ہنگری سے معاملہ کرنا پڑا کہ ایک مشترکہ آسٹریائی ہنگیرین بادشاہی قائم کریں، اور دوسری طرف انہیں بورژوازی کے ساتھ کئی سیاسی رعایتیں کرنی پڑیں۔ ۱۸۶۷ء کی نئی آئین نے رائخستاگ کے نمائندہ ادارے کو بھرپور اختیارات دے دیے، وزیروں کی ذمہ داریاں طے کر دیں، فوجی تربیت تمام شہریوں پر لازم کر کے لامبندی کا حکم عام کر دیا، اور حکومت کو مرکزی بنا دیا۔ حکومت میں اشرافیہ کے نمائندوں کے علاوہ آزاد خیال بورژوازی کے آدمی بھی شریک ہو گئے۔ صفحہ ۱۰۳

۴۱۔ ”نیشنل لبرل“۔ یہ جرمن بورژوازی کی پارٹی تھی جو ۱۸۶۶ء کے موسم خزاں میں بنی تھی۔ اس پارٹی کی منزل مقصود یہ تھی کہ جرمنی کو ملا کر پروشیا کے سائے میں

ایک کیا جائے۔ ان کی پالیسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ جرمنی کی آزاد خیال بورژوازی نے بسمارک کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ صفحہ ۱۰۴

۴۲۔ جرمن پیوپلز پارٹی ۱۸۶۵ء میں قائم ہوئی۔ اس میں زیادہ تر جنوبی جرمنی کی ریاستوں کے چھوٹی بورژوازی والے جمہوریت پسند لوگ اور کچھ اوپر کی بورژوازی کے آدمی شامل تھے۔ یہ پارٹی پروشیا کے سایہ اقتدار کے خلاف یہ چاہتی تھی کہ ایک سہا جرمنی بنے جس میں پروشیا اور آسٹریا دونوں شامل ہوں۔ ایک وفاقی جرمنی کا مطالبہ پھیلا کر یہ پارٹی درحقیقت جرمنی کو اس طرح ایک کرنے کے خلاف تھی جو مل جل کر مرکزی جمہوری ریپبلک میں ڈھل جائے۔ صفحہ ۱۰۵

۴۳۔ ۱۹ ویں صدی کی ساتویں دہائی کے وسط میں پروشیا میں خاص لائسنسوں کا سسٹم چلایا گیا۔ لائسنس لئے بغیر صنعت کی چند شاخوں میں داخل ہونا منع تھا۔ اس نیم جاگیردارانہ پابندی نے سرمایہ داری کی ترقی میں ایک رکاوٹ کھڑی کر دی۔ صفحہ ۱۰۶

۴۴۔ یہاں اشارہ ہے رائے دہندگی کے حق میں تحریک اصلاح کی طرف۔ عوام کے دباؤ سے انگلینڈ کے ہاؤس آف کامنز نے یہ قانون ۱۸۳۱ء میں پاس کر دیا۔ جون ۱۸۳۲ء میں ہاؤس آف لارڈز نے بھی اس کی منظوری دے دی۔ اس قانون کا رخ تھا صاحب جائداد اشرافیہ اور مالیاتی شرفا کی سیاسی اجارہ داری کے خلاف۔ اس قانون نے صنعتی بورژوازی پر پارلیمنٹ کے دروازے کھول دیے۔ پرولتاریہ اور چھوٹی بورژوازی، جنہوں نے تحریک اصلاح میں بڑھچڑھ کر حصہ لیا تھا، وہی حق رائے دہندگی سے محروم رہ گئے اور آزاد خیال بورژوازی نے انہی کو فریب دے دیا۔ صفحہ ۱۰۷

۴۵۔ پیرس کے مزدوروں نے جو ۲۳ جون سے ۲۶ جون ۱۸۴۸ء تک علم بغاوت بلند کیا اس کی طرف اشارہ ہے۔ فرانسیسی



بورژوازی نے اس بغاوت کو انتہائی بے رحمی سے کچل ڈالا۔ یہ بغاوت بورژوازی اور پرولتاریہ کے درمیان پہلی زبردست خانہ جنگی تھی۔ صفحہ ۱۰۸

۴۶۔ یونکر۔ محدود معنوں میں اس لفظ کا مطلب ہے مشرقی پروشیا کے صاحب جائداد شرفاء، عام طور سے یہ لفظ جرمن جاگیرداروں کے طبقے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ صفحہ ۱۰۸

۴۷۔ سادووا کا معرکہ ۳ جولائی ۱۸۶۶ء کو ہوا تھا۔ یہ معرکہ تاریخ میں ”جنگ کونی گراٹز“ کے نام سے یادگار رہ گیا ہے۔ اس مقام تو اب گراڈیز کراوف کہا جاتا ہے۔ آسٹریا اور پروشیا کی جنگ ۱۸۶۶ء میں یہ معرکہ فیصلہ کن ثابت ہوا۔ صفحہ ۱۰۸

۴۸۔ جائداد غیر منقولہ کے رهن اور قرقی کا رواج۔ صفحہ ۱۱۰

۴۹۔ یہاں مراد ہے انٹرنیشنل کی اس کانگریس سے جو ۶ ستمبر سے ۱۱ ستمبر ۱۸۶۹ء تک بازل میں منعقد ہوئی تھی۔ ۱۰ ستمبر کو بازل کانگریس نے زمینی جائداد کے متعلق یہ تجویز پاس کی جو مارکس کے ماننے والوں نے کانگریس کے سامنے رکھی تھی: ”۱۔ سماج کو یہ حق پہنچتا ہے کہ زمین کی نجی ملکیت کا خاتمہ کر دے اور اسے مشترکہ قومی ملکیت بنا دے۔“ ”۲۔ لازمی ہے کہ زمین کی نجی ملکیت کا حق ختم کیا جائے اور اسے مشترکہ قومی ملکیت بنا دیا جائے۔“

اسی کانگریس نے ٹریڈ یونینوں کو قومی اور بین الاقوامی پیمانے پر متحد کرنے کے فیصلے بھی کئے تھے اور ایسی تنظیمی کارروائیاں کرنی چاہی تھیں جن سے انٹرنیشنل مضبوط ہو اور جنرل کونسل کے اختیارات اور بڑھ جائیں۔ صفحہ ۱۱۱

۵۰۔ فرانس اور پروشیا کی جنگ ۷۱-۱۸۷۰ء میں سیدان کے مقام پر جرمن فوجوں نے فرانسیسی فوج کو ایک بڑے معرکے میں شکست دے کر فوجیوں، افسروں اور ان کے سپہ سالار

شہنشاہ نپولین سوم کو قید کر لیا۔ شہنشاہ اور اعلا افسروں کو ولہلم سہوئے میں کاسیل کے نزدیک، پروشیائی بادشاہوں کے ایک محل میں ۵ ستمبر ۱۸۷۰ء سے ۱۹ مارچ ۱۸۷۱ء تک قید رکھا گیا۔ سیدان کی شکست سے دوسری سلطنت (شہنشاہی) کے زوال کی رفتار تیز ہو گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۳ ستمبر ۱۸۷۰ء کو فرانس میں ریپبلک قائم ہونے کا اعلان عام کر دیا گیا۔ ریپبلک کا اعلان ہوتے ہی ایک نئی حکومت وجود میں آئی جس کا نام تھا قومی ڈیفنس کی حکومت۔ صفحہ ۱۱۳

۵۱۔ ”پروشیائی قوم کی مقدس جرمن سلطنت“، کہہ کر اینگلس نے یہاں جرمن قوم کی اس مقدس سلطنت روما پر چھینٹا مارا ہے جو قرون وسطیٰ میں موجود تھی (ملاحظہ ہو نوٹ نمبر ۷۶)، اور یہ جتنا ہے کہ جرمنی کا ایک ہونا، یعنی فرانس پر فتح حاصل ہونے کی بدولت ۱۸۷۱ء میں جرمن سلطنت کا قائم ہونا، پروشیائی اقتدار کے سائے میں انجام پایا اور اسی کے ساتھ تمام جرمن ریاستوں کو پروشیائی رنگ میں رنگا جانے لگا۔ صفحہ ۱۱۳

۵۲۔ پروشیا کی سرپرستی میں شمالی جرمن یونین (یا ریاستوں کا اتحاد) ۱۸۶۷ء میں بنی۔ اس میں شمالی اور وسطی جرمنی کی ۱۹ ریاستیں اور تین آزاد شہر مل کر ایک ہو گئے تھے۔ یہ بسمارک کی تجویز پر ہوا تھا اور پروشیا کی سرپرستی میں سارے جرمنی کے متحد ہونے کی طرف یہ ایک فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ جنوری ۱۸۷۱ء میں اس یونین کا وجود ختم ہوا اور اس کی جگہ جرمن سلطنت قائم ہو گئی۔ صفحہ ۱۱۳

۵۳۔ یہ اشارہ ہے اس طرف کہ ۱۸۷۰ء میں بویریا، بیڈن، ویورٹمبرگ اور ہیسن ڈرم شٹاڈٹ کا شمالی جرمن یونین سے الحاق کر لیا گیا۔ صفحہ ۱۱۳



۵۴۔ شپی خیرن کے نزدیک (لورین میں) ۶ اگست ۱۸۷۰ء کو پروشیائی فوجوں نے فرانس کو ایک لڑائی میں سخت شکست دی۔ یہ معرکہ تاریخ میں جنگ فورباخ کے نام سے مشہور ہے۔

مارس لا تور کے مقام پر ۱۶ اگست ۱۸۷۰ء کو جرمن فوجوں نے میٹز سے پیچھے ہٹتی ہوئی رائن علاقے کی فرانسیسی فوج کا راستہ کاٹنے میں کامیابی حاصل کی اور اس طرح پسپائی کی راہ بند کر دی۔ صفحہ ۱۱۷

۵۵۔ «Der Volksstaat» (”عوامی ریاست“، جرمن سوشل ڈیموکریٹک ورکرز پارٹی (آئری ناخ والوں) کا ترجمان تھا جو لیپزگ شہر میں ۲ اکتوبر ۱۸۶۹ء سے ۲۹ ستمبر ۱۸۷۶ء تک شائع ہوتا رہا۔ اخبار کی پالیسی کی باگ ڈور ولہلم لیکنیخت کے ہاتھ میں تھی اور اس کا انتظام اگسٹ بیبل کے ہاتھ میں۔ مارکس اور اینگلس اس اخبار میں لکھتے بھی تھے اور اس کی ترتیب میں بھی مدد دیتے تھے۔ ۱۸۶۹ء سے پہلے یہ اخبار «Demokratisches Wochenblatt» کے نام سے نکلا کرتا تھا۔ صفحہ ۱۱۸

۵۶۔ ۱۰ جنوری ۱۸۷۴ء کو رائخ ستاگ (پارلیمنٹ) کے انتخابات میں سوشل ڈیموکریٹوں کو یہ کامیابی ہوئی کہ ان کے ۹ ممبر چنے گئے۔ ان میں بیبل اور لیکنیخت بھی تھے جو انتخاب کے زمانے میں جیل کاٹ رہے تھے۔ صفحہ ۱۱۹

۵۷۔ ”فرانس میں خانہ جنگی“، سائنسی کمیونزم کے موضوع کی ایک نہایت اہم تصنیف ہے۔ یہاں طبقاتی کشمکش، ریاست، انقلاب اور پرولتاری ڈکٹیٹری کے تعلق سے خاص مارکسی اصول بڑی وضاحت کے ساتھ پیرس کمیون کے تجربے کی روشنی میں بیان ہوئے ہیں۔ ورکنگ مینز ایسوسی ایشن کی جنرل کونسل کے تمام ممبروں کو یورپ اور امریکہ میں تقسیم کرنے کے لئے یہ تحریر ایک کھلے خط کے طور پر تیار کی گئی تھی

تاکہ سارے ملکوں کے مزدوروں کو کمیون والوں کی سرفروشی کی اصلیت سے، اس کی عالمی اہمیت سے پوری طرح باخبر کہا جائے اور دنیا بھر کے پرولتاریہ میں یہ تاریخی تجربہ عام کر دیا جائے۔

اس تصنیف میں بھی مارکس نے اسی خیال کی تصدیق، تائید اور تکمیل کی ہے جو ”لوئی بوناپارٹ کی ۱۸ ویں برویئر“ میں پیش کیا تھا کہ پرولتاریہ کے لئے بورژوازی کی سرکاری مشینری کا درہم برہم ضروری ہے (اس سلسلے کے حصہ اول میں ملاحظہ ہو، صفحات ۲۹۷-۱۰۰)۔ مارکس اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ”مزدور طبقہ بنی بنائی سرکاری مشینری پر ہاتھ ڈال کر اس سے کام نہیں لے سکتا“۔ مزدور طبقے کا فرض ہے کہ اسے توڑ پھوڑ کر برابر کر دے اور پیرس کمیون کے نمونے کی ریاست کو اس کی جگہ دے دے۔ مارکس نے یہاں جو یہ کلیہ قائم کیا ہے کہ پیرس کمیون قسم کی نئی ریاست ہی پرولتاری ڈکٹیٹری کی سرکاری شکل ہے، یہ انقلابی نظریے میں اس کے نئے اضافے کا لب لباب ہے۔ مارکس کی اس تصنیف ”فرانس میں خانہ جنگی“ کی بہت وسیع اشاعت ہوئی ہے۔ ۱۸۷۱ء اور ۱۸۷۲ء میں یورپ کے کئی ملکوں اور امریکہ کی زبانوں میں اس کا ترجمہ نکل چکا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں کتاب کا روسی ترجمہ لینن کی ترتیب کے ساتھ اودیسا سے شائع ہوا۔ صفحہ ۱۲۲

۵۸۔ یہ دیباچہ اینگلس نے مارکس کی تصنیف ”فرانس میں خانہ جنگی“ کے تیسرے جرمن ایڈیشن کے لئے لکھا تھا جو پیرس کمیون کی ۲۰ ویں سال گرہ کے موقع پر ۱۸۹۱ء میں شائع کیا گیا تھا۔ پیرس کمیون کے تجربے کی تاریخی اہمیت پر پورا زور دینے کے بعد، اور مارکس نے جو نظریاتی تجزیہ کیا ہے، اسے اچھی طرح جتانے کے ساتھ اینگلس نے پیرس کمیون کی تاریخ پر، بلانکی اور پرودھوں کے ماننے والوں کی سرگرمی پر



کئی نکتوں کا اضافہ کیا۔ اسی جرمن ایڈیشن میں اینگلس نے انٹرنیشنل ورکنگ مینز ایسوسی ایشن کی جنرل کونسل کا وہ پہلا اور دوسرا خط بھی شامل کر لیا جو فرانس اور پروشیا کی جنگ پر مارکس نے لکھا تھا۔ مختلف زبانوں میں اس تصنیف کے جتنے ایڈیشن بعد میں پمفلٹ کی صورت میں نکلے ہیں، ان میں بھی دونوں خطوط شامل رہے۔ صفحہ ۱۲۲

۵۹۔ یہاں جرمنوں کی اس قومی آزادی کی جنگ کی طرف اشارہ ہے جو ۱۸۱۳ء میں انھوں نے نپولین کے قبضے سے نکلنے کے لئے لڑی تھی۔ صفحہ ۱۲۳

۶۰۔ ہنگامی قانون (The Exceptional Law or the Anti-Socialist Law) جرمنی میں ۲۱ اکتوبر ۱۸۷۸ء کو بنا تھا۔ اس کے مطابق سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کی تمام شاخیں، عام مزدور انجمنیں، مزدوروں کے اخبارات وغیرہ خلاف قانون قرار دئے گئے۔ اشتراکی خیال کی کتابوں، رسالوں کو بحق سرکار ضبط کر لینے کا حکم ہوا اور سوشل ڈیموکریٹوں پر زیادتیاں گئیں۔ عام مزدور تحریک کے دباؤ سے یہ قانون پہلی اکتوبر ۱۸۹۰ء کو منسوخ کر دیا گیا۔ صفحہ ۱۲۳

۶۱۔ جرمنی میں Demagogue ۱۸۲۰ء کے برسوں میں ان جرمن تعلیم یافتہ لوگوں کو کہا جاتا تھا جو جرمن ریاستوں کے رجعت پرست نظام کے خلاف بولتے تھے اور متحدہ جرمنی کی آواز بلند کرتے تھے۔ جرمن حکومت ان لوگوں کے ساتھ بڑی بے دردی سے پیش آئی۔ صفحہ ۱۲۳

۶۲۔ یہاں جولائی ۱۸۳۰ء کے انقلاب کی طرف اشارہ ہے۔ صفحہ ۱۲۵

۶۳۔ یہ اشارہ ہے جائزوارث والوں، اورلین والوں اور بوناپارٹ والوں کی طرف، جو بوناپارٹ کی خاندانی بادشاہی کے حامی تھے۔ صفحہ ۱۲۶

۶۴۔ دوسری دسمبر ۱۸۵۱ء۔ وہ دن ہے جب فرانس میں انقلاب کے مخالفین کی طرف سے حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ اس میں لوئی بوناپارٹ اور اس کے حمایتیوں کا ہاتھ تھا۔ صفحہ ۱۲۶

۶۵۔ یہاں اس ابتدائی صلح نامے کا ذکر ہے جس پر فرانس اور جرمنی نے لڑائی بند کر کے ۲۶ فروری ۱۸۷۱ء کو وارسائی میں دستخط کئے۔ دستخط کرنے والوں میں ایک طرف سے تیسر اور ٹریول فاور تھے اور دوسری طرف سے بسمارک۔ اس صلح نامے کی شرائط کے مطابق فرانس نے الزاس اور مشرقی لارین صوبے جرمنی کے حوالے کر دئے اور ۵۰۰ کروڑ فرانک ہرجانہ ادا کرنا اپنے ذمے لے لیا۔ امن کا پکا عہد نامہ ۱۰ مئی ۱۸۷۱ء کو فرینکفرٹ آن مین میں لکھا گیا۔ صفحہ ۱۲۹

۶۶۔ اکتوبر ۱۸۷۰ء میں فرانسیسی فوج مارشل بازین کی سرکردگی میں میتز کے مقام پر نرگے میں آگئی اور اس نے شہر جرمنوں کے حوالے کر دیا۔ صفحہ ۱۳۲

۶۷۔ یہاں پرودھوں کی تصنیف ”۱۹ ویں صدی میں انقلاب کا عام خیال“، (Idée générale de la Révolution au XIX siècle. Paris, 1851) کا ذکر ہے جو پیرس سے ۱۸۵۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس تصنیف میں پرودھوں کے پیش کئے ہوئے نظریات پر تنقید دیکھنی ہو تو مارکس کا وہ خط پڑھنا چاہئے جو اس نے ۸ اگست ۱۸۵۱ء کو اینگلس کے نام لکھا اور اینگلس کا وہ تنقیدی تبصرے والا مضمون جو ”پرودھوں کی کتاب“ ۱۹ ویں صدی میں انقلاب کا عام خیال، پر تنقیدی تبصرہ، کے عنوان سے تحریر ہوا۔ صفحہ ۱۳۵

۶۸۔ فرانس کی اشتراکی تحریک میں ایک موقع پرست رجحان تھا جسے ”امکانی“، (Possibilism) کہتے ہیں۔ بروس، میلون اور دوسرے لوگ اس کے لیڈر تھے جنھوں نے فرنچ ورکرز پارٹی میں ۱۸۸۲ء میں پھوٹ ڈال دی۔ ان کا کہنا تھا کہ صرف



اتنا ہی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے جو ”امکان“ میں ہو، اسی لئے ان کا یہ نام پڑا۔ صفحہ ۱۳۶

۶۹- اینگلز کے اس دیباچہ کو شائع کرتے وقت اخبار «Die Neue Zeit» Bd. II کے ایڈیٹروں نے (جس کے ۲۸ ویں شمارے ۱۸۹۰ء-۱۸۹۱ء میں یہ مضمون شائع ہوا تھا) اصل عبارت میں اپنی طرف سے کچھ تبدیلی کر دی۔ مثلاً اینگلز نے لفظ ”سوشل ڈیموکریٹک کم ظرف“ (Philistine) لکھا تھا، انہوں نے یہاں ”جرمن کم ظرف“، چھاپا۔ فیشر نے ۱۷ مارچ ۱۸۹۱ء کو جو خط لکھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اینگلز نے یہ یکطرفہ تبدیلی ناپسند کی تھی، لیکن غالباً اس خیال سے کہ ایک بار جو عبارت چھپ چکی ہے، اس میں ادل بدل نہ ہو، اختلاف نہ پڑے، پمفلٹ کی صورت میں اس کی اشاعت پر بھی اینگلز نے وہی لفظ رہنے دیا۔ موجودہ جلد میں ہم نے اینگلز کا اپنا لکھا ہوا لفظ رکھ دیا ہے۔ صفحہ ۱۳۹

۷۰- پہلا اور دوسرا خط۔ فرانس اور پروشیا کی جنگ پر انٹرنیشنل کا رویہ کیا ہونا چاہئے، اس کے متعلق جنرل کونسل کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے مارکس نے جنگ چھڑتے ہی فوراً ایک کھلا خط یا پیغام جاری کیا، پھر ستمبر ۱۸۷۰ء میں دوسرا خط لکھا، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مزدور طبقے کو جنگجوئی اور خود جنگ سے کیسے پیش آنا چاہئے۔ ان دونوں خطوں میں مارکس اور اینگلز کی ان تمام کوششوں کی بھی جھلک ملتی ہے جو وہ دوسروں کے علاقے پر چڑھائی کرنے کی جنگ کے خلاف اور پرولتاری بین الاقوامیت کے اصولوں کی تعمیل کے لئے کئے جا رہے تھے۔ مارکس نے دلیلیں دے کر ثابت کر دیا ہے کہ استحصال کرنے والے طبقے اپنی ذاتی غرض کے لئے جو غاصبانہ جنگیں چھیڑتے ہیں، ان کا مقصد دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے کے علاوہ خود انقلابی مزدوروں کی تحریک کو کچلنا بھی ہوتا ہے۔ اس قسم کی

جنگوں کی سماجی وجہوں پر مارکس نے اپنی تعلیم کا نہایت اہم باب کھول کر بیان کر دیا ہے۔ خاص طور سے اس نے زور دیا کہ جرمن اور فرانسیسی مزدوروں کا مفاد ایک ہی ہے اور انہیں چاہئے کہ دونوں ملکوں کے حاکم طبقوں کی جارحانہ پالیسی کا متحد ہو کر، ڈٹ کر مقابلہ کریں۔

مارکس نے بے مثال دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے اپنے پہلے خط میں آخر کا یہ نکتہ بھی جتا دیا کہ مزدوروں کے ہاتھ میں طاقت آجائے گی تو تمام جنگوں کا خاتمہ ہو جائے گا اور روئے زمین پر امن قائم ہونا آئندہ کی کمیونسٹ سوسائٹی کا ایک زبردست بین الاقوامی اصول بن جائے گا۔ صفحہ ۱۴۱

۷۱- عام رائے شماری نپولین سوم نے مئی ۱۸۷۰ء میں کرائی تھی، گویا اپنی سلطنت کے بارے میں عام آبادی کی رائے معلوم کرنی چاہی ہو۔ لفظوں کے الٹ پھیر سے سوال نامے کی عبارت کچھ اس طرح رکھی گئی کہ اگر دوسری سلطنت کی پالیسی پر نامنظوری کا اظہار کیا جاتا تو تمام جمہوری اصلاحوں سے بھی منکر ہونا پڑتا تھا۔ فرانس میں پہلی انٹرنیشنل کی شاخوں نے اس لفظی الٹ پھیر اور چالبازی کا پردہ چاک کرتے ہوئے اپنے ممبروں سے اپیل کی کہ ووٹ کا بائیکاٹ کریں۔ رائے شماری شروع ہونے سے پہلے ہی انٹرنیشنل کی پیرس شاخ کی ممبر اس الزام میں گرفتار کر لئے گئے کہ وہ نپولین سوم کے خلاف سازش کر رہے تھے۔ حکومت کے ہاتھ ایک بہانہ آگیا تاکہ فرانس کے مختلف شہروں میں انٹرنیشنل کے ممبروں کو پھنسایا جائے، ان پر زیادتیاں کی جائیں۔ ۲۲ جون سے ۵ جولائی ۱۸۷۰ء تک جب پیرس کے ممبروں پر مقدمہ چلا تو دنیا کو یہ پتہ چل گیا کہ سازش کے الزام کی حقیقت کیا تھی۔ پھر بھی انٹرنیشنل کے کئی ممبروں کو قید کی سزائیں دی گئیں صرف اس بنا پر کہ وہ انٹرنیشنل ورکنگ مینز ایسوسی ایشن کے ممبر تھے۔ فرانس کے مزدور طبقے نے عام جلسوں کے ذریعے اس ظلم کے خلاف احتجاج کیا۔ صفحہ ۱۴۲



۷۲- فرانس اور پروشیا کی جنگ ۱۹ جولائی ۱۸۷۰ء کو چھڑی تھی۔ صفحہ ۱۴۲

۷۳- «Le Réveil» (”بیداری“)۔ یہ بائیں بازو کے ریپلکنوں کا فرانسیسی اخبار تھا جو پیرس میں جولائی ۱۸۶۸ء سے جنوری ۱۸۷۱ء تک شارل دیلکلوڑے کی ادارت میں نکلتا رہا۔ اس اخبار میں انٹرنیشنل کی دستاویزیں اور مزدور تحریک کی معلومات شائع ہوا کرتی تھیں۔ صفحہ ۱۴۳

۷۴- «La Marseillaise»۔ بائیں بازو کے ریپلکنوں کا روزنامہ، پیرس میں دسمبر ۱۸۶۹ء سے ستمبر ۱۸۷۰ء تک نکلا۔ اس میں انٹرنیشنل اور مزدور تحریک کے متعلق بھی معلومات اور سرگرمیوں کی تفصیل چھپا کرتی تھی۔ صفحہ ۱۴۴

۷۵- یہاں مراد ہے ”دس دسمبری سوسائٹی“، لوئی بوناپارٹ والوں کی خفیہ جماعت سے، جس میں زیادہ تر سماج کے فالتو، ٹوٹے پھوٹے عناصر جوڑے گئے تھے، سیاسی جواہری اور فوج کے لوگ شامل تھے۔ ان لوگوں کا کام یہ تھا کہ لوئی بوناپارٹ کو دس دسمبر ۱۸۴۸ء کے صدارتی انتخاب میں فرانسیسی ریپلک کا صدر چنوا دیں۔ اسی لئے دس دسمبری نام پڑا۔ ان کی حرکتوں کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مارکس کا مقالہ ”لوئی بوناپارٹ کی اٹھارویں برومیئر“، جو حصہ اول میں شامل ہے۔ صفحہ ۱۴۴

۷۶- یہاں مراد ہے جرمن قوم کی مقدس سلطنت روما جس کی بنیاد ۹۶۲ عیسوی میں رکھی گئی تھی اور جرمن علاقوں کے علاوہ اٹلی کا بھی کچھ حصہ اس میں شامل تھا۔ بعد میں کچھ علاقے فرانس کے، بوہیمیا کے، آسٹریا، نیدرلینڈ، سوئٹزرلینڈ اور دوسرے ملکوں کے بھی اسی میں شامل ہو گئے تھے۔ یہ سلطنت کوئی مرکزیت والی اسٹیٹ نہیں تھی۔ یہ چند رجواڑوں کی اور آزاد شہروں کی ملی جلی اور ڈھیلی ڈھالی

یونین تھی جو سلطنت کے صرف اختیارات کو تسلیم کرتے تھے۔ ۹۶۲ سے ۱۸۰۶ء تک قائم رہی۔ آخر جب فرانس کے مقابلے میں جرمنی کو شکست ہوئی تو ہیپس برگ نے مقدس سلطنت روما کے شہنشاہ کا خطاب چھوڑ دیا۔ صفحہ ۱۵۱

۷۷- ۱۶۱۸ء میں برانڈن برگ کا الکٹوریٹ پروشیا کی نوابی (مشرقی پروشیا) سے مل گیا جو ۱۶ ویں صدی کی ابتدا میں تیوٹونی امارت کے علاقے سے بنی تھی اور تب تک پولینڈ کی بادشاہی کی دست نگر تھی۔ برانڈن برگ کا نواب (الکٹور) جو خود پروشیائی امیرزادہ تھا ۱۶۵۷ء تک پولینڈ کا باج گزار رہا۔ لیکن جب سویڈن سے جنگ میں پولینڈ مشکل میں پھنسا تو اس پروشیائی امیرزادے نے تمام پروشیائی علاقوں پر پھیل کر خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ صفحہ ۱۵۱

۷۸- یہ اشارہ ہے بازل کے صلح نامے کی طرف، جو پروشیا نے ۵ اپریل ۱۷۹۵ء کو فرانسیسی ریپلک سے اپنے طور پر کر لیا تھا، حالانکہ پروشیا اس وقت فرانس کے مقابلے پر یورپی ریاستوں کے پہلے کولیشن میں شریک تھا۔ صفحہ ۱۵۲

۷۹- تلست کا صلح نامہ ۷ اور ۹ جولائی ۱۸۰۷ء کے درمیان نپولین کے فرانس نے روس اور پروشیا سے کیا تھا۔ یہ دونوں ملک فرانس کے خلاف چوتھے کولیشن کے ممبر تھے اور جنگ میں شکست کھا کر اس صلح نامے پر مجبور ہوئے تھے۔ صلح نامے کی شرطوں نے پروشیا کی کمربند دی جسے اپنا بہت سا علاقہ ہاتھ سے دینا پڑا، اور روس کے ہاتھ سے اگرچہ کوئی علاقہ نہیں گیا لیکن اسے یورپ میں فرانس کی پوزیشن کا استحکام بھی ماننا پڑا اور یہ بھی کہ انگریزوں کی ناکہ بندی میں (جسے براعظم یورپ کی ناکہ بندی کہتے ہیں) شریک ہوگا۔ نپولین اول کے حکم سے اس صلح نامے میں جو غاصبانہ



زبردستی رکھی گئی تھی، اس کا انجام یہ ہوا کہ تمام جرمن آبادی میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی، جس نے نپولینی غلبے کے خلاف قومی آزادی کی تحریک کا راستہ ہموار کر دیا اور یہ تحریک ۱۸۱۳ء میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ صفحہ ۱۵۴

۸۰۔ تیوتونی (Teutons) کا لفظ جرمن نسل کے پرانے قبیلوں کے لئے استعمال ہوتا تھا اور اس دائرے میں تمام جرمن اصل نسل کے لوگ آتے ہیں۔ مارکس نے یہاں جرمن قوم پرستوں کی زبان سے اس لفظ کے استعمال کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ صفحہ ۱۵۴

۸۱۔ مارکس کا مطلب یہ ہے کہ نپولین کا اقتدار ٹوٹتے ہی جرمنی میں جاگیرداری رجعت پرستی کی کمان پھر چڑھ گئی۔ پہلے کی سی جاگیر تفرقہ پر دازی نے سر اٹھا لیا اور جرمن ریاستوں میں موروثی بادشاہیوں کا نظام پھر جم گیا، جس نے اسرا کے خاص حقوق اور کسانوں کی اندھی لوٹ، نیم غلامی کا دور دورہ کر دیا۔ صفحہ ۱۵۶

۸۲۔ یہ اشارہ ہے پیرس کے توپلری محل کی طرف جہاں نپولین سوم دوسری سلطنت کے زمانے میں رہا کرتا تھا۔ صفحہ ۱۵۷

۸۳۔ اورلین والے — یعنی اورلین گھرانے کے حمایتی۔ اورلین — بوربون شاہی خاندان کی ایک نوجوان شاخ تھی۔ ۱۸۳۰ء کے انقلاب نے اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں دے دیا تھا اور ۱۸۴۸ء کے انقلاب نے وہ چھین لیا۔ یہ لوگ مالیاتی شرفا (بڑے پیمانے پر روپے کا کاروبار کرنے والے) اور اوپر کی بورژوازی کے جاں نثار تھے۔ صفحہ ۱۵۷

۸۴۔ یہاں انگریز مزدوروں کی اس تحریک کی طرف اشارہ ہے جو انہوں نے ۴ ستمبر ۱۸۷۰ء کو قائم ہونے والی فرانسیسی ریپبلک کو تسلیم کرانے کے لئے اٹھائی تھی۔ اعلان کے دوسرے ہی دن، ۵ ستمبر کو لندن اور بڑے شہروں میں جلسے جلوس

شروع ہو گئے۔ جابجا تجویزوں اور مطالبوں میں مظاہرین نے اس پر زور دیا کہ برطانوی حکومت فرانسیسی ریپبلک کو فوراً تسلیم کر لے۔ اس تحریک کو رخ دینے میں پہلی انٹرنیشنل کی جنرل کونسل نے براہ راست شرکت کی۔ صفحہ ۱۵۸

۸۵۔ مارکس کا اشارہ اس طرف ہے کہ جاگیردارانہ بادشاہتوں کا وہ کولیشن بنوانے میں انگلینڈ نے بڑھچڑھ کر حصہ لیا تھا جس کولیشن نے ۱۷۹۲ء میں انقلابی فرانس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اور یہ بھی انگلینڈ کے حاکم لوگ تھے جنہوں نے سارے یورپ میں سب سے پہلے فرانس کی لوئی بوناپارٹ حکومت کو تسلیم کر لیا، ایسی حکومت کو جو ۲ دسمبر ۱۸۵۱ء کو ریپبلکن حکومت کا تختہ الٹ کر وجود میں آئی تھی۔ صفحہ ۱۵۹

۸۶۔ «Journal Officiel de la République Française»

(”فرانسیسی ریپبلک کا سرکاری اخبار“،) — پیرس کمیون کا سرکاری ترجمان تھا جو ۲۰ مارچ سے ۲۴ مئی ۱۸۷۱ء تک شائع ہوتا رہا۔ پہلے سے یہ نام فرانسیسی ریپبلک کے سرکاری اخبار کا تھا جو پیرس میں ۵ ستمبر ۱۸۷۰ء سے نکلتا شروع ہوا تھا (جب پیرس کمیون قائم ہوا تو کمیون کی مخالف تیسر گورنمنٹ نے وارسائی سے اسی نام کا دوسرا اخبار نکالا)۔ ۳۰ مارچ کے شمارے پر اخبار کا نام یوں درج تھا: «Journal Officiel de la Commune de Paris» (”پیرس کمیون کا سرکاری اخبار“،)۔ اسی اخبار کے ۲۵ اپریل ۱۸۷۱ء کے شمارے میں سائمن کا خط چھپا تھا۔ صفحہ ۱۶۲

۸۷۔ ۲۸ جنوری ۱۸۷۱ء کو فاتح بسمارک اور قومی ڈیفنس کی حکومت کی طرف سے فاور نے ایک صلح نامے پر دستخط کئے جس کا عنوان تھا: ”جنگ بندی اور پیرس کے ہتھیار ڈالنے کا کنونشن“۔ اس حرکت نے فرانس کے قومی مفاد کو مٹی



میں ملا دیا۔ کنونشن کے مطابق فاور نے وہ تمام شرمناک شرطیں قبول کر لیں جو پروشیا گورنمنٹ نے منوانی چاہی تھیں، مثلاً دو ہفتے کے اندر بیس کروڑ فرانک ہرجانہ ادا کرنا، پیرس کے بیشتر قلعے فاتح کے حوالے کرنا، پیرس کی فوج کا میدان توپ خانہ اور اسلحہ پروشیا کے ہاتھ میں دے دینا۔  
صفحہ ۱۶۲

۸۸-۷۱-۱۸۷۰ء میں جب پیرس محاصرے میں تھا تو وہ لوگ جو ہتھیار ڈال دینے کے حق میں تھے انہیں Capitulars کہا جاتا تھا۔ بعد میں ہر قسم کے شکست خوردہ ذہن والوں کا یہ نام پڑ گیا۔ صفحہ ۱۶۳

۸۹- «L'Étendard» (”پرچم“)- بوناپارٹ کا طرفدار فرانسیسی اخبار جو پیرس میں ۱۸۶۶ء سے ۱۸۶۸ء تک نکلتا رہا۔ زیادہ رقم بٹورنے کے لئے جب اس کا ایک فریب پکڑا گیا تو اخبار نکلتا بند ہو گیا۔ صفحہ ۱۶۴

۹۰- یہاں مراد ہے «Société Générale du Crédit Mobilier»- یہ ایک بڑا فرانسیسی جوائنٹ اسٹاک بینک تھا جو ۱۸۵۲ء میں قائم کیا گیا۔ اس کی آمدنی کا بڑا ذریعہ تھا زر ضمانت (سکیورٹیز) پر سٹہ چلانا۔ دوسری سلطنت کے سرکاری حکام سے اس بینک کا گہرا لین دین تھا۔ ۱۸۶۷ء میں اس کا دیوالہ نکلا اور ۱۸۷۱ء میں اس پر تالہ پڑ گیا۔ صفحہ ۱۶۴

۹۱- «L'Électeur libre» (”آزاد ووٹر“)- داہنے بازو کا ریپلکن ترجمان جو پیرس میں ۱۸۶۸ء سے ۱۸۷۱ء تک نکلتا رہا۔ قومی ڈیفنس کی حکومت کی وزارت مالیات سے اس کا سمبندھ تھا۔ صفحہ ۱۶۴

۹۲- ڈیوک دے بیرری کی یاد میں جب سین ڈرسمین ل، اوسے روا گرجا گھر میں فاتحہ خوانی ہو رہی تھی تو جائزوارث والوں نے مظاہرہ کر کے اس میں گڑبڑ پھیلانی۔ اس پر غصے کا

اظہار کرنے کے لئے ۱۴ اور ۱۵ فروری ۱۸۳۱ء کو پیرس میں لوگوں کا ایک ہجوم ٹوٹ پڑا، اس نے گرجا گھر اور پادری کیلین کا محل غارت کر دیا۔ تیسرے اس ہنگامے کے وقت وہاں بذات خود موجود تھا اور اس نے نیشنل گارڈ کو سمجھایا کہ وہ دخل نہ دے۔

۱۸۳۲ء میں تیسرے کے حکم خاص سے (وہ وزیر داخلہ تھا) فرانسیسی تخت و تاج کے جائزوارث والے دعویدار کاؤنٹ آف شمبور کی ماں شہزادی دی بیرری گرفتار کر لی گئیں اور ان پر ایسی ڈاکٹری جرح کرائی گئی جس کی غرض یہ تھی کہ اس کی خفیہ شادی کا راز دنیا بھر پر افشا ہو جائے اور وہ سیاسی حیثیت سے منہ دکھانے قابل نہ رہے۔ صفحہ ۱۶۵

۹۳- ۱۴-۱۳-اپریل ۱۸۳۴ء کو پیرس میں عوامی شورش اٹھی تھی جولائی کی بادشاہت کے خلاف۔ تیسرے اس وقت وزیر داخلہ تھا اور اس نے شورش کو کچلنے میں نہایت شرمناک رول انجام دیا تھا۔ فوج کے ہاتھوں یہ عام شورش اس سختی اور درندگی سے تہہ تیغ کی گئی کہ ٹرانسنونان والی سڑک کے ایک مکان میں تو تمام کے تمام باشندے بری طرح قتل کر دیے گئے۔

ستمبر کے قانون کا حوالہ اسی سلسلے میں آیا ہے۔ ستمبر ۱۸۳۵ء میں فرانسیسی حکومت نے پیرس کے خلاف بڑے رجعت پرست قانون جاری کئے، جن کی رو سے، رائج الوقت سماجی اور سیاسی نظام پر نکتہ چینی شائع کرنے کی سزا قید اور بھاری جرمانے مقرر تھی۔ صفحہ ۱۶۵

۹۴- جنوری ۱۸۳۱ء میں تیسرے نے ایوان نمائندگان (پارلیمنٹ) میں ایک پلان پیش کیا تاکہ پیرس کے چوطرفہ فوجی قلعہ بندی کھڑی کی جائے۔ انقلابی اور جمہوری خیال کے لوگوں نے اس پلان کے پیچھے یہ نیت بھانپ لی کہ اس طرح عوامی مظاہروں کو کچلنا مقصود ہے۔ پلان میں خاص کر مزدور



علاقوں کے آس پاس زبردست قلعہ بندی اور مورچہ بندی کی تجویز تھی - صفحہ ۱۶۶

۹۵ - فرڈیننڈ دوم کی نیپلز والی فوجوں نے جنوری ۱۸۴۸ء میں پلیرمو پر توپخانے سے گولہ باری کی تاکہ اس عوامی بغاوت کو خاک و خون میں ملا دیا جائے جو ۲۹ - ۱۸۴۸ء میں اٹلی کی مختلف ریاستوں میں بورژوا انقلاب کی آمد کی خبر دے رہی تھی۔ یہ وہی فرڈیننڈ ہے جس نے اسی سال موسم خزاں میں شہر مسینا پر گولہ باری کرائی تھی اور لوگوں میں ”شاہ بومبا“ کا نام کمایا تھا۔ صفحہ ۱۶۶

۹۶ - اپریل ۱۸۴۹ء میں فرانس نے آسٹریا اور نیپلز سے مل کر روم کی رپبلک پر فوجی مہم بھیج کر مداخلت کی تاکہ رپبلک کو بے دخل کر کے پوپ کی مذہبی حکومت جما دی جائے۔ فرانس کی فوجوں نے روم پر سخت گولہ باری کی۔ رپبلک والوں نے جان پر کھیل کر مقابلہ کیا لیکن آخر شکست کھا گئے اور روم پر فرانسیسی فوج نے قبضہ کر لیا۔ مارکس نے اس واقعے پر اپنی تصنیف ”لوئی بوناپارٹ کی اٹھارویں برومیئر“ میں بھی تبصرہ کیا ہے۔ ملاحظہ ہو حصہ اول، صفحات ۲۹۷ - ۱۵۰ - صفحہ ۱۶۷

۹۷ - ضابطہ پارٹی - قدامت پسندانہ خیالات والی اوپر کی بورژوازی نے یہ پارٹی ۱۸۴۸ء میں بنائی تھی۔ اس میں فرانس کی دو خاندانی بادشاہتوں کے طرفدار گروہ ملے ہوئے تھے۔ ایک جائزوارث والے (Legitimist) اور دوسرے اورلین والے۔ ۱۸۴۹ء سے دوسری دسمبر ۱۸۵۱ء تک (جب لوئی بوناپارٹ نے اندر سے حکومت کا تختہ الٹا) فرانس کی دوسری رپبلک کی قانون ساز اسمبلی میں اس پارٹی کا بول بالا تھا۔ صفحہ ۱۶۸

۹۸ - ۱۵ جولائی ۱۸۴۰ء کو انگلینڈ، روس، پروشیا، آسٹریا اور ترکی نے لندن میں ایک کنونشن (قرائناسے) پر دستخط کئے کہ

یہ طاقتیں سلطان ترکی کو مصری حکمران محمد علی پاشا کے مقابلے پر مدد دیں گی۔ محمد علی کو فرانس کی تائید حاصل تھی۔ نتیجہ یہ کہ فرانس اور یورپی ملکوں کے اس کولیشن کے درمیان جنگ کی صورت پیدا ہو گئی۔ لیکن شاہ فرانس لوئی فیلپ کی ہمت نہیں پڑی کہ وہ جنگ چھیڑے اور اس نے محمد علی پاشا کی مدد سے ہاتھ اٹھا لیا۔ صفحہ ۱۶۹

۹۹ - انقلابی پیرس کو دبانے کی خاطر وارسائی فوجوں کی طاقت بڑھانے کے لئے تیسرے بسمارک سے درخواست کی کہ وہ ان فرانسیسی جنگی قیدیوں کو چھوڑ دے اور وارسائی کی فوج میں شریک ہو جانے دے جن میں سے اکثر سیدان اور میتز کے مقام پر ہتھیار ڈالنے والی فوج میں شامل تھے۔ صفحہ ۱۶۹

۱۰۰ - ”جائزوارث والے“ (Legitimists) - اسی بوربون خاندان کی بادشاہت کے حمایتی تھے جو ۱۸۳۰ء میں بے دخل کی گئی اور جب تک رہی اوپر کے جاگیرداروں کا دم بھرتی رہی۔ پھر اورلین خاندان کی حکومت (۱۸۴۸ء - ۱۸۳۰ء) قائم ہو گئی تو اس کا تکیہ تھا اوپر کے مالیاتی شرفا اور بڑی حیثیت کی بورژوازی پر۔ ان کا زور توڑنے کے لئے جائزوارث والوں کے ایک حصے نے سماجی حقوق کی لفاظی سے کام لیا اور بڑے سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ کے مقابلے میں محنت کرنے والوں کے طرفدار بن کر کھڑے ہو گئے۔ صفحہ ۱۷۱

۱۰۱ - «Chambre introuvable» (”انوکھا دربار“،) - یہ ۱۸۱۵ء - ۱۸۱۶ء میں فرانس کا ایوان نمائندگان (پارلیمنٹ کا ایوان) تھا جس میں پرلے درجے کے رجعت پرست بھرے ہوئے تھے (بادشاہی کی بحالی کے شروع برسوں میں)۔ صفحہ ۱۷۲

۱۰۲ - ”چودھریوں کی چوپال“ - ۱۸۷۱ء کی اس قومی اسمبلی کا نام پڑ گیا تھا جس میں زیادہ تر فرانس کے دیہات کے رجعتی



شاہپرست نمائندے، قصباتی زمیندار، سرکاری عہدہ دار، لگان دار (Rentiers) اور دوکاندار شامل تھے۔ بوردو کے مقام پر اس کا اجلاس ہوا۔ ۶۳۰ نمائندوں میں ۴۳۰ شاہپرست ممبر چن کر آئے تھے۔ صفحہ ۱۷۲

۱۰۳۔ ۱۰ مارچ ۱۸۷۱ء کو قومی اسمبلی نے ایک قانون پاس کیا جو پہلے کے چڑھے ہوئے قرضوں کی ادائیگی کے بارے میں تھا۔ ۱۳ اگست اور ۱۲ نومبر ۱۸۷۰ء کے درمیان جو قرض نامے ہوئے تھے، صرف انہی کی ادائیگی ملتوی کی گئی لیکن جو قرض نامے ۱۲ نومبر کے بعد ہوئے ان کی ادائیگی میں کوئی چھوٹ نہیں دی گئی۔ چنانچہ ۱۰ مارچ کے اس قانون کی ضرب مزدوروں اور کم حیثیت لوگوں پر پڑی اور بہت سے چھوٹے موٹے کارخانہ دار اور دوکاندار دیوالیہ ہو گئے۔ صفحہ ۱۷۳

۱۰۴۔ Décembreur — وہ لوگ جنہوں نے ۲ دسمبر ۱۸۵۱ء کو لوئی بوناپارٹ کے ہاتھوں حکومت کا تختہ الٹنے (Coup d'état) میں شرکت کی یا دل سے اس کے حامی تھے۔ صفحہ ۱۷۳

۱۰۵۔ اخبارات کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ تیسر کی حکومت جو ملک کے اندرونی قرضے جاری کرنا چاہتی تھی ان سے تیسر اور اس کی گورنمنٹ کے آدمیوں کو ۳۰ کروڑ فرانک سے زیادہ رقم کمیشن میں ملتی۔ پیرس کمیون کو کچل ڈالنے کے بعد ۲۰ جون ۱۸۷۱ء کو ان قرضوں کا قانونی اجرا ہو سکا۔ صفحہ ۱۷۴

۱۰۶۔ کائینا — جنوبی امریکہ کے فرانسیسی گیانا کا وہ شہر جہاں فرانسیسی حکومت کالے پانی کے سزایافتہ لوگوں کو بھیجتی تھی۔ صفحہ ۱۷۵

۱۰۷۔ «Le National» (”قومی اخبار“) — فرانسیسی روزنامہ جو پیرس میں ۱۸۳۰ء سے ۱۸۵۱ء تک نکلا۔ معتدل بورژوا رپبلکوں کا ترجمان تھا۔ اس خیال کے خاص خاص نمائندے

جو عارضی حکومت میں شامل ہوئے سراسر، باستید، اور گرانٹے پاڑیس تھے۔ صفحہ ۱۷۸

۱۰۸۔ ۳۱ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو جیسے ہی یہ خبر پھیلی کہ قومی ڈیفنس کی حکومت پروشیا والوں سے گفت و شنید کا فیصلہ کر چکی ہے، پیرس کے مزدوروں اور نیشنل گارڈ کے انقلابیوں نے شورش برپا کر دی۔ انہوں نے ٹاؤن ہال پر قبضہ کیا اور اپنی انقلابی حکومت کا اعلان کر دیا جس کا نام تھا پبلک سلامتی کی کمیٹی۔ بلانکی اس کمیٹی کا سربراہ قرار پایا۔ مزدوروں کے دباؤ میں قومی ڈیفنس کی حکومت کو یہ قول دینا پڑا کہ وہ استعفا دے دے گی اور کمیون کے لئے پہلی نومبر کو عام چناؤ کا دن مقرر کر دے گی۔ پیرس کی انقلابی طاقتیں ابھی اچھی طرح منظم نہیں تھیں، اور بغاوت کے لیڈروں میں اختلاف رائے بھی تھا۔ ان میں بلانکی کے ماننے والے اور چھوٹی بورژوازی کے جیکوبی خیالات والے جمہوریت پسند متفق نہ ہو سکے۔ حکومت نے موقع کا فائدہ اٹھایا اور نیشنل گارڈ کے کچھ وفادار دستوں کو لے کر ٹاؤن ہال پر قبضہ کر لیا اور اپنی طاقت پھر سے جمالی۔ صفحہ ۱۷۸

۱۰۹۔ ”برے تن“ — یہ صوبہ بریتان کا ایک گشتی دستہ تھا فوجی قسم کا، جو فرانس اور پروشیا کی جنگ ۱۸۷۰-۷۱ء کے زمانے میں بنایا گیا تھا۔ تروشیو نے اس سے سیاسی پولیس والوں (ژندارسی) کا کام لیا کہ پیرس کی انقلابی تحریک کو کچلا جائے۔ کورسیکن — ان کو دوسری سلطنت کے زمانے میں ژندارسی کی کافی جگہیں دی گئی تھیں۔ صفحہ ۱۷۸

۱۱۰۔ ۲۲ جنوری ۱۸۷۱ء کو پیرس کے پرولتاریوں اور نیشنل گارڈ والوں نے بلانکی والوں کی ہدایت پر ایک انقلابی مظاہرہ کیا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ حکومت کو بے دخل کر کے کمیون قائم کیا جائے۔ قومی ڈیفنس کی حکومت نے حکم



جاری کیا اور برے تن گشتی دستے نے، جو ٹاؤن ہال کی حفاظت پر مامور تھا، مظاہرین پر گولی چلا دی۔ یوں دہشت سے انقلابی تحریک کو دبا لینے کے بعد حکومت نے پیرس دشمن کے حوالے کر دینے کی تیاری شروع کر دی۔ صفحہ ۱۷۹

۱۱۱۔ Sommations (منتشر ہونے کی وارننگ)۔ بہت سی بورژوا ریاستوں میں یہ قاعدہ ہے کہ جلسے جلوس والوں کو تین بار وارننگ دی جاتی ہے کہ وہ منتشر ہو جائیں، اس پر بھی اگر لوگ نہ ہٹیں تو افسروں کو طاقت استعمال کرنے کا حق پہنچتا ہے۔

بلوہ ایکٹ (Riot Act)۔ انگلینڈ میں ۱۷۱۵ء میں بنا تھا، اس کی رو سے بارہ آدمی سے زیادہ کا اجتماع خلاف قانون قرار پاتا تھا۔ اور یہ حکم تھا کہ اگر خاص وارننگ کے تین بار اعلان کئے جانے پر ایک گھنٹے کے اندر اندر منتشر نہ ہو تو حکومت کے آدمیوں کو طاقت استعمال کرنے کا پورا اختیار حاصل ہے۔ صفحہ ۱۸۰

۱۱۲۔ ۳۱ اکتوبر کو جو واقعات گزرے (ملاحظہ ہونوٹ نمبر ۱۰۸) اس موقع پر ایک باغی کی رائے یہ تھی کہ قومی ڈیفنس کی حکومت کو گولی سے اڑا دیا جائے۔ لیکن فلورنس نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ صفحہ ۱۸۲

۱۱۳۔ مارکس نے یہاں اس فرمان کا ذکر کیا ہے جو پیرس کمیون نے ۵ اپریل ۱۸۷۱ء کو یرغمال یا ضمانت کے آدمی پکڑنے کے متعلق جاری کیا تھا (مارکس نے وہ تاریخ دی ہے جب یہ فرمان انگریزی اخبارات میں شائع ہوا)۔ اس فرمان کی رو سے ایسے تمام لوگ جو وارسائی کی حکومت سے رابطہ رکھنے کے ملزم سمجھے جائیں، اگر ان پر الزام ثابت ہو جائے تو یرغمال میں پکڑے جائیں گے۔ اس تدبیر سے کمیون کی کوشش یہ تھی کہ اپنے آدمیوں کو وارسائی کے ہاتھوں مارے جانے سے بچالے۔ صفحہ ۱۸۳

۱۱۴۔ The Times ("زمانہ")۔ لندن کا مشہور قدامت پسند روزنامہ جو ۱۷۸۵ء سے برابر نکل رہا ہے۔ صفحہ ۱۸۴

۱۱۵۔ "پشتینی منصب داری"، (Investiture) یہ سرکاری عہدہ دار مقرر کرنے کا ایک ایسا سسٹم ہے جس میں نیچے کے سرکاری ملازمین پوری طرح اوپر کے افسروں کے قبضہ قدرت میں ہوتے ہیں۔ صفحہ ۱۹۲

۱۱۶۔ ژیروندیست۔ ۱۸ ویں صدی کے آخر میں فرانس کے بورژوا انقلاب کے وقت یہ ایک بورژوا سیاسی گروپ تھا، اعتدال پسندوں کے مفاد کا خیال رکھنے والا، انقلابی اور انقلاب کی مخالف طاقتوں کے درمیان ڈانواڈول۔ اس گروپ نے شاہ پرستوں سے سمجھوتہ کر لیا۔ اس گروپ کا یہ نام پڑا ژیروندی حلقے کی وجہ سے کیوں کہ جو لوگ اس حلقے سے چن کر قانون ساز اسمبلی میں اور قومی کنونشن میں آتے تھے، زیادہ تر وہی اس گروپ کے لیڈر تھے۔ صفحہ ۱۹۲

۱۱۷۔ Kladderadatsch۔ اس نام کا ایک باتصویر جرمن مزاحیہ ہفتہ وار رسالہ برلن میں ۱۸۴۸ء سے نکلتا تھا۔  
Punch, or the London Charivari۔ لندن سے مزاحیہ ہفتہ وار ۱۸۴۱ء سے شائع ہو رہا ہے جو ایک بورژوا آزاد خیال پرچہ ہے۔ صفحہ ۱۹۳

۱۱۸۔ یہاں مراد ہے پیرس کمیون کے اس فرمان سے جو ۱۶ اپریل ۱۸۷۱ء کو نکلا تھا اور جس کی رو سے تمام قرضے آئندہ تین سال میں قسطوں سے ادا کرنے کی اجازت دی گئی تھی اور ان پر سارے سود منسوخ کر دیے گئے تھے۔ صفحہ ۱۹۷

۱۱۹۔ ۲۲ اگست ۱۸۴۸ء کو آئین ساز اسمبلی نے وہ مسودہ قانون نامنظور کر دیا تھا جس کی رو سے قرضے ملتوی کئے جاسکتے نتیجہ یہ نکلا کہ چھوٹی حیثیت کے کافی لوگ بری طرح تبا



ہوئے اور بڑے صاحب حیثیت لوگوں کے قرضوں میں پھنس کر  
بے بس ہو گئے۔ صفحہ ۱۹۷

۱۲۰ - Frères Ignorantins (”بے علم بھائی“) - یہ ایک مذہبی  
فرقہ تھا جس کی بنیاد ریمس کے مقام پر ۱۶۸۰ء میں رکھی  
گئی۔ اس فرقے کے لوگ عہد کرتے تھے کہ ہم غریب گھروں  
کے بچوں کو تعلیم دیں گے۔ بچوں کو ان سے  
زیادہ تر دینی تعلیم ہی ملا کرتی تھی، باقی تعلیم کے شعبے  
خالی رہ جاتے۔ اسی باعث بورژوا فرانس میں اس قسم کی ابتدائی  
تعلیم کو، جس کا معیار پست اور کردار دینی ہو، پھبتی  
کے طور پر مارکس نے ”بے علم بھائی“، کہا رہے۔ صفحہ ۱۹۷

۱۲۱ - ڈپارٹمنٹوں کے ریپلکنوں کی انجمن - ایک سیاسی جماعت تھی  
جس میں چھوٹی بورژوازی کے وہ نمائندے شامل تھے جو  
فرانس کے مختلف حلقوں یا اضلاع (ڈپارٹمنٹوں) سے آئے ہوئے  
پیرس میں رہنے لگے تھے۔ انہوں نے لوگوں سے اپیل کی کہ  
وہ وارسائی حکومت، شاہ پرست قومی اسمبلی کے مقابلے پر نکل آئیں  
اور سارے اضلاع سے پیرس کمیون کی تائید کریں۔ صفحہ ۱۹۷

۱۲۲ - یہ ۲۷ اپریل ۱۸۲۵ء کے اس قانون کی طرف اشارہ ہے جس  
کی رو سے ان تمام لوگوں کو، جو ملک چھوڑ کر نکل گئے  
تھے، بورژوا انقلاب فرانس کے زمانے میں ضبط کی ہوئی املاک  
اور جائداد کا معاوضہ دینا طے پایا تھا۔ صفحہ ۱۹۸

۱۲۳ - ویندوم کی لاٹ - یہ ۱۸۰۶ء اور ۱۸۱۰ء کے درمیان پیرس  
میں نصب کی گئی۔ نپولین نے جو فتوحات حاصل کیں ان  
کی یادگار کے طور پر مال غنیمت کی توپوں سے کانسی نکال کر  
یہ لاٹ ڈھالی گئی اور اس کے اوپر نپولین کا مجسمہ لگایا گیا۔  
۱۶ مئی ۱۸۷۱ء کو پیرس کمیون کے حکم سے یہ لاٹ زمین  
کے برابر کر دی گئی تھی لیکن ۱۸۷۵ء میں رجعت پرستوں  
کے غلبے نے اسے پھر اپنی جگہ جما دیا۔ صفحہ ۲۰۱

۱۲۴ - پکپیوس کی خانقاہ میں تلاشی لینے سے پتہ چلا کہ بعض راہباؤں  
کو برسوں بند کوٹھریوں میں قید رکھا گیا تھا اور جسمانی  
اذیتیں دینے کے اوزار بھی نکلے۔ سینٹ لارینٹ کے گرجا گھر  
میں ایک خفیہ قبرستان کا سراغ ملا جہاں مقتولین کو چپ  
چاپ دفن کر دینے کے ثبوت برآمد ہوئے۔ پیرس کمیون کے  
اخبار «Mot d'Ordre» (”پلول“،) نے ۵ مئی ۱۸۷۱ء کی  
اشاعت میں یہ واقعات پبلک تک پہنچائے۔ بعد میں ایک  
پمفلٹ بھی شائع کیا گیا «Les Crimes des congrégations  
religieuses» (”گرجا گھروں کے عملوں کے کرتوت“،) صفحہ ۲۰۲

۱۲۵ - Absentee - ان غیر حاضر تعلقہ داروں کے لئے بولا جاتا ہے  
جو کبھی بھولے بھٹکے ہی اپنی جاگیر کا دورہ کرتے تھے،  
زمین جائداد کا بندوبست یا تو ان کے ایجنٹ کیا کرتے، یا  
جوتداری کے طور پر کسی کو پٹے پر دے دی جاتی جو  
لگان بڑھا چڑھا کر اپنی طرف سے کسانوں کو دیا کرتا تھا۔  
صفحہ ۲۰۳

۱۲۶ - جب لوئی شانزدہم ۱۶ کی حکومت نے ۲۰ جون ۱۷۸۹ء کو  
جنرل اسٹیٹس کے اجلاس میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی،  
کیوں کہ اس ادارے نے خود کو قومی اسمبلی قرار دے دیا  
تھا، تو تیسرے سماجی درجے (یعنی بورژوازی) کے نمائندوں  
نے وارسائی محل کے اس ہال میں جو گیند کھیلنے کے لئے  
مقرر تھا، جمع ہو کر حلف اٹھایا کہ ہم جب تک آئین  
کا خاکہ تیار نہ کر لیں، یہیں ٹھہریں گے۔ یہ واقعہ بھی  
ایک سبب بن گیا جس سے ۱۸ ویں صدی کے آخر کا بورژوا  
انقلاب فرانس برپا ہوا۔ صفحہ ۲۰۵

۱۲۷ - Franks-fileurs کے لفظی معنی ہیں ”بے لگام مفرور“، یہ  
بورژوازی کے ان لوگوں کا نام پڑ گیا تھا جو محاصرے کے زمانے  
میں پیرس چھوڑ کر نکل بھاگے تھے۔ فرانسیسی زبان کی ایک  
ترکیب franks-tireurs کی نسبت سے اس لفظ کی مزاحیہ



کیفیت ابھرتی ہے جس کے معنی ہیں ”تیر بے ہدف“۔ یہ ان فرانسیسی چہا پہ ماروں کا نام پڑ گیا تھا جو پروشیا کے مقابلے میں لڑ رہے تھے۔ صفحہ ۲۰۶

۱۲۸۔ کوبلینٹس۔ جرمنی کا ایک شہر ہے۔ ۱۸ ویں صدی کے انقلاب فرانس کے زمانے میں یہ شہر بھاگے ہوئے جاگیردار اور بادشاہی کے حامیوں کا گڑھ بن گیا تھا جہاں سے وہ انقلابی فرانس پر چڑھائی کرنے کی تدبیریں کر رہے تھے۔ یہاں ملک سے باہر بنی ہوئی حکومت نے ڈیرا ڈالا تھا جس کا سربراہ ایک بدترین رجعت پرست، دی کلون تھا جو لوئی شانزدہم ۱۶ کی حکومت کا سابق وزیر رہ چکا تھا۔ صفحہ ۲۰۶

۱۲۹۔ پیرس کمیون والے وارسائی کے ان فوجیوں کو ”شوان“ کہتے تھے جن کی ہمدردیاں بادشاہی کے ساتھ تھیں اور جنہیں صوبہ بریتان میں بھرتی کیا گیا تھا۔ ان کی حالت بالکل ان باغیوں کی سی تھی جنہوں نے ۱۸ ویں صدی کے آخر میں انقلاب فرانس کے خلاف اور بادشاہی کی حمایت میں شمال مغربی فرانس سے سر اٹھایا تھا۔ صفحہ ۲۰۷

۱۳۰۔ ”زواو“ کے لفظ سے اس پاپائی گارڈ رجمنٹ کی طرف اشارہ ہے جس میں فرانسیسی شرفا کی اولاد بھری ہوئی تھی۔ اسے فرانس کے پیدل دستے کے انداز پر تربیت دے کر تیار کیا گیا تھا۔ ستمبر ۱۸۷۰ء میں جب پاپائے روم کے دنیاوی اختیارات کا خاتمہ کیا گیا تو پاپائی گارڈ کے پیدل دستے فرانس لائے گئے جہاں پہنچ کر انہوں نے پروشیا اور فرانس کی جنگ میں حصہ لیا۔ جنگ کے بعد یہ رجمنٹ پیرس کمیون کو کچلنے کے لئے استعمال کی گئی۔ صفحہ ۲۰۷

۱۳۱۔ پیرس میں پرولتاری انقلاب کے اثر سے، جب پیرس کمیون قائم ہو گیا، تو لیون اور مارسیلز میں بھی اسی قسم کی عام انقلابی کارروائیاں پھیلنے لگیں، لیکن انقلابی جلسے، جلوس اور مظاہروں کو سرکاری فوج نے بے دردی سے کچل ڈالا۔ صفحہ ۲۰۹

۱۳۲۔ فوجی عدالت (کورٹ مارشل) کی کارروائی کے متعلق دیوفور نے قومی اسمبلی سے اس قاعدے کی منظوری لی تھی کہ جو مقدمات آئیں گے ان کی تحقیقات اور سزا کی تعمیل ۳۸ گھنٹے کے اندر کردی جائے گی۔ صفحہ ۲۱۰

۱۳۳۔ انگلینڈ اور فرانس میں یہ تجارتی معاہدہ ۲۳ جنوری ۱۸۶۰ء کو ہوا تھا۔ معاہدے کے تحت طے پایا کہ فرانس جنگی کسٹم پر اپنی پابندیوں کی پالیسی ترک کر دے گا اور ان کی جگہ نئی اسپورٹ ڈیوٹیاں (درآمد پر ٹیکس) لگایا کرے گا۔ نتیجہ یہ کہ فرانس میں انگلینڈ کا مال اس تیزی سے ڈھلنا شروع ہوا کہ خود ملک کے اندر انگریزی مال سے سخت مقابلہ کرنا پڑ گیا اور فرانسیسی کارخانہ داروں میں بے چینی پھیل گئی۔ صفحہ ۲۱۲

۱۳۴۔ «Insurgent»۔ وہ لوگ جو حکومت کے مقابلے میں ہتھیار لے کر اٹھ کھڑے ہوں۔ صفحہ ۲۱۳

۱۳۵۔ یہاں اشارہ ہے اس طرف کہ پہلی صدی قبل مسیح میں غلام دار رومن رپبلک میں جب بھی کوئی مشکل کا وقت آپڑتا تو دہشت کا بازار گرم کر دیا جاتا اور خوں ریزی کر کے شورش دہائی جاتی۔ باری باری کئی جنرلوں نے اس زمانے میں فوجی ڈکٹیٹری قائم کی: سولا کی ڈکٹیٹری (۸۲ سے ۷۹ ق م تک)؛ پہلی اور دوسری رومی تریوم ویرات (تین کی فوجی ڈکٹیٹری) (۶۰ سے ۵۳ اور ۴۳ سے ۳۶ ق م تک)۔ پہلی تریوم ویرات میں پومپئی، سیزر اور کراس کے نام آتے ہیں اور دوسری میں اوکتاویان، انتونئی اور لیپید کے نام۔ صفحہ ۲۱۵

۱۳۶۔ «Journal de Paris»۔ اورلین والوں کا طرفدار، بادشاہی کا حامی ایک ہفتہ وار جو ۱۸۶۷ء میں پیرس سے نکلنا شروع ہوا۔ صفحہ ۲۱۶

۱۳۷۔ اگست ۱۸۱۴ء میں جب انگلینڈ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی جنگ چل رہی تھی، برطانوی فوجوں نے واشنگٹن قبضہ کر کے



”کیپٹول“، (امریکی کانگریس کی عمارت) کو، وہاٹ ہاؤس کو اور راجدھانی کی کئی دوسری پبلک عمارتوں کو پھونک ڈالا۔

اکتوبر ۱۸۶۰ء میں جب برطانیہ اور فرانس نے چین سے جنگ چھیڑی تو برطانوی اور فرانسیسی فوجوں نے چینی شہنشاہوں کے گرما محل کو، جو چینی آرٹ اور فن تعمیر کا ایک نایاب خزانہ تھا، پہلے لوٹ مار کی اور پھر جلا ڈالا۔ صفحہ ۲۱۸

۱۳۸-۱۸۱۲ء کے موسم خزاں میں جب نپولین نے چڑھائی کی تو ماسکوالوں نے شہر کے اچھے خاصے علاقے کو آگ لگادی تاکہ دشمن کی فوج کو مکان اور خوراک کی آسانی نصیب نہ ہو۔ صفحہ ۲۱۹

۱۳۹- پری ٹورین فوجی- روم قدیم میں سپہ سالار یا شہنشاہ کا خاص گارڈ۔ یہ پری ٹورین اکثر اندرونی شورشوں میں شریک ہوتے اور اپنی پسند کے آدمی کو تخت پر بٹھا دیا کرتے تھے۔ صفحہ ۲۲۰

۱۴۰- مارکس نے پروشیا کی اسمبلی کو فرانسیسی ایوان نمائندگان سے مشابہت کی خاطر «Chambre introuvable» (انوکھا دربار) کہا ہے۔ یہ اسمبلی جس کا چناؤ ۱۸۴۹ء کے جنوری فروری میں ہوا تھا، دو ایوانوں سے مل کر بنی تھی۔ پہلے ایوان میں خاص حقوق والے شرفا آئے اور یہ ”ایوان شرفا“، کہلایا، دوسرے کے لئے انتخاب دو مرحلوں سے گزرا اور صرف وہی پروشیائی اس میں حصہ لے سکے جنہیں ”آزاد“، کہا جاتا تھا۔ بسمارک اس دوسرے ایوان میں چن کر آیا اور انتہائی رجعت پرست ”یونکر“، گروہ کے لیڈروں میں شمار ہونے لگا۔ صفحہ ۲۲۱

۱۴۱- «The Daily News»- لبرل انگریزی روزنامہ جو صنعتی بورژوا کا ترجمان تھا۔ لندن میں ۱۸۴۶ء سے ۱۹۳۰ء تک اسی نام سے نکلتا رہا۔ صفحہ ۲۲۶

۱۴۲- «Le Temps»- فرانس کا قدامت پسند روزنامہ، بڑی بورژوازی کا ترجمان۔ پیرس میں ۱۸۶۱ء سے ۱۹۴۳ء تک شائع ہوتا رہا۔ صفحہ ۲۲۶

۱۴۳- «The Evening Standard»- قدامت پسند انگریزی اخبار «Standard» کا شام کا ایڈیشن۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۵ء تک لندن میں شائع ہوتا رہا۔ صفحہ ۲۲۷

۱۴۴- یہ خط مارکس اور اینگلس نے لکھا تھا۔ صفحہ ۲۲۷

۱۴۵- سوشل ڈیموکریسی کا اتحاد (L'Alliance de la Démocratie Socialiste)۔ یہ جماعت ۱۸۶۸ء میں باکونین نے جنیوا میں قائم کی تھی۔ اس کے پروگرام میں صاف اعلان کیا گیا تھا کہ ہم تمام طبقوں کی مساوات اور اسٹیٹ کے خاتمے کے حق میں ہیں۔ اس ”الائینس“ کے ممبر اس بات کو ضروری نہیں سمجھتے تھے کہ مزدور طبقہ سیاسی جدوجہد میں اترے۔ ”الائینس“ کے چھوٹی بورژوازی والے نراجی (انارکسٹ) پروگرام کو اٹلی، سوئٹزرلینڈ، اسپین اور دوسرے ملکوں کے ان علاقوں سے تائید نصیب ہوئی جہاں صنعت پست درجے میں تھی۔ ۱۸۶۹ء میں اس جماعت نے پہلی انٹرنیشنل کی جنرل کونسل سے اپیل کی کہ وہ اسے اپنے اندر شامل کر لے۔ انٹرنیشنل والوں نے اس شرط پر ”الائینس“ کی الگ الگ شاخوں کا داخلہ منظور کیا کہ وہ خود کو علاحدہ جماعت کی حیثیت سے توڑ کر شامل ہوں۔ تاہم جب انٹرنیشنل سے منسلک ہو چکے تب بھی ”الائینس“ کے ممبروں نے انٹرنیشنل ورکنگ مینز ایسوسی ایشن کے اندر اپنی خفیہ تنظیم باقی رکھی اور ان کے لیڈر کی حیثیت سے باکونین نے جنرل کونسل پر نکتہ چینی اور حملوں کا ایک طومار باندھ دیا۔ پیرس کمیون کا ٹوٹنا تھا کہ یہ مہم اور تیز کر دی۔ باکونین اور اس کے ماننے والوں نے پرولتاری ڈکٹیٹری کے نظریے کو قطعی رد کر کے یہ کہنا شروع کیا کہ مزدور طبقے کی ایک الگ سیاسی



پارٹی بنانے کے کوئی معنی نہیں ہوتے، ایسی پارٹی جو جمہوری مرکزیت کے اصولوں پر قائم کی گئی ہو۔ آخر جب پہلی انٹرنیشنل کی کانگریس ستمبر ۱۸۷۲ء میں ہیگ میں منعقد ہوئی تو زبردست اکثریت کے ساتھ ”الائینس“ کے لیڈروں — باکونین اور گیلوم کو انٹرنیشنل سے خارج کر دیا گیا۔ صفحہ ۲۲۸

۱۸۷۶ — The Spectator — آزاد خیال انگریزی ہفتہ وار، جو لندن میں ۱۸۲۸ء سے برابر شائع ہوتا رہا۔ صفحہ ۲۲۹

۱۸۷۷ — پہلی انٹرنیشنل کی لندن کانفرنس ۱۷ سے ۲۳ ستمبر ۱۸۷۱ء تک چلتی رہی۔ یہ ایسا زمانہ تھا، جب پیرس کمیون کی شکست کے بعد ہر طرف انٹرنیشنل والوں پر مظالم کی گھٹا چھائی ہوئی تھی اس لئے لندن کانفرنس میں حاضری بہت تھوڑی رہی: ۲۲ ڈیلی گیٹ ایسے تھے جنہیں ووٹ کا حق حاصل تھا اور ۱۰ کو اظہار رائے کا حق تھا، ووٹ کا نہیں۔ جن ملکوں سے ڈیلی گیٹ نہیں آ سکے، ان کی نمائندگی جنرل کونسل میں ان ملکوں کے سکریٹریوں نے کی۔ مارکس نے اس کانفرنس میں جرمنی کی نمائندگی کی اور اینگلس نے اٹلی کی۔

مارکس اور اینگلس ایک پرولتاری پارٹی کی بنیاد رکھنے کے لئے جو کوششیں کئے جا رہے تھے، ان میں لندن کانفرنس کا خاص مقام ہے۔ کانفرنس نے ایک تجویز پاس کی ”مزدور طبقے کی سیاسی کارروائی“، پر اور اس تجویز کا اصل حصہ، ہیگ کانگریس کے فیصلے کے مطابق (ملاحظہ ہو نوٹ نمبر ۱۵۲) انٹرنیشنل ورکنگ مینز ایسوسی ایشن کے عام قواعد و ضوابط میں شامل کر لیا گیا۔ اس کانفرنس میں پرولتاری پارٹی کے سلسلے میں کئی نہایت اہم عملی تدبیروں اور تنظیمی اصولوں کا فیصلہ ہوا جس سے فرقہ بندی اور اصلاح پسندی پر سخت ضرب لگی۔ لندن کانفرنس نے انارکزم اور موقع پرستی کے مقابلے میں پرولتاری ذمہ داری کے اصولوں کو منوانے میں اپنی اہمیت ثابت کردی۔ صفحہ ۲۳۱

۱۸۷۸ — مارکس کی تصنیف ”گوتھا پروگرام پر تنقیدی نظر“، ۱۸۷۵ء میں تیار ہوئی تھی۔ جرمنی کی متحدہ مزدور پارٹی کا پروگرام کیا ہونا چاہئے، اس پر مارکس نے تنقیدی روشنی ڈالی ہے۔ جو خاکہ ”گوتھا پروگرام“ کے نام سے بنایا گیا تھا اس میں فاش غلطیاں بھی تھیں اور لاسال کے خیالات سے سمجھوتہ بھی۔ مارکس اور اینگلس کو یہ تو قبول تھا کہ جرمنی کی ایک متحدہ سوشلسٹ پارٹی بنے لیکن لاسال والے نظریے کو اپنے پروگرام میں داخل کرنا گوارا نہیں تھا، انہوں نے اس سمجھوتہ بازی پر کڑی تنقید کی۔ ”گوتھا پروگرام پر تنقیدی نظر“، میں مارکس نے سائنسی کمیونزم کے اہم سوالوں پر کئی بہت ہی کارآمد خیالات کو ایک واضح شکل دی ہے — مثلاً اشتراکی انقلاب، پرولتاری ڈکٹیٹری، سرمایہ داری نظام سے کمیونزم کی طرف آنے کا عبوری دور، کمیونسٹ سماج کے دو مرحلوں، سوشلزم آنے پر پیداوار اور تقسیم کا مسئلہ، کمیونزم کی بنیادی خصوصیات، پرولتاری بین الاقوامیت اور مزدور طبقے کی پارٹی۔

مارکس نے اس تصنیف میں اسٹیٹ اور پرولتاری ڈکٹیٹری پر بھی اپنا نظریہ بہت وضاحت سے پیش کیا ہے۔ یہیں اس نے یہ خیال بھی آگے بڑھایا ہے کہ سرمایہ داری سے کمیونزم میں داخل ہوتے، یا اس مرحلے کو عبور کرتے وقت ایک خاص مقام سے گزرنا تاریخ کا لازمہ ہے جس سے کوئی مفر نہیں۔ اور یہ خاص مقام ہے اسٹیٹ (ریاست) کی وہ شکل جسے مارکس ”پرولتاریہ کی انقلابی ڈکٹیٹری“ کہتا ہے۔ لینن نے اس مقالے کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ”مارکس نے جو وضاحت پیش کی ہے، اس کی زبردست اہمیت اس نکتے میں ہے کہ یہاں بھی وہ مادی جدلیات کا دامن مضبوطی سے تھامے ہوئے ہے، ارتقا کے نظریے سے کام لیتے ہوئے کمیونزم کو ایسی چیز قرار دیتا ہے جو سرمایہ داری میں سے نکلتی ہے۔ کتابی علم سے سوچی ہوئی ’ایجاد بندہ‘ قسم کی



علمی تعریفوں کے پل باندھنے کے بجائے، لاجواب لفظوں کی تکراریں پڑنے کے بجائے (مثلاً یہ کہ سوشلزم کیا ہے، کمیونزم کیا ہے) مارکس نے اس بات کا تجزیہ کر کے دکھا دیا جسے ہم کمیونزم کی معاشی پختگی کے مختلف درجے یا مرحلے کہہ سکتے ہیں۔ ،، صفحہ ۲۳۳

۱۳۹- اینگلز نے یہ دیباچہ مارکس کی تصنیف ”گوٹھا پروگرام پر تنقیدی نظر“ کی ۱۸۹۱ء والی اشاعت کے لئے لکھا تھا۔ پارٹی پالیسی کے بیان پر اس قابل قدر دستاویز کی اشاعت کا بیڑا اینگلز نے اس خیال سے اٹھایا کہ جرمن سوشل ڈیموکریٹک پارٹی میں جو موقع پرستوں کا زور ہو گیا ہے، اسے اسی تصنیف سے توڑا جائے۔ وقت کے لحاظ سے یہ نہایت اہم کارنامہ تھا، کیوں کہ آئرفرٹ کے مقام پر جو پارٹی کانگریس ہونے والی تھی، اسے گوٹھا پروگرام کی جگہ ایک نیا پروگرام بحث مباحثے سے طے کرنے اور اختیار کرنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ جب اس تصنیف کو پریس کے لئے تیار کرنے کی نوبت آئی تو سوشل ڈیموکریٹک لیڈروں کی طرف سے اینگلز کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ »Die Neue Zeit« اخبار کے پبلشر دیتز نے اور اس کے ایڈیٹر کاؤتسکی نے اینگلز سے اصرار کیا کہ وہ کچھ حصے چھانٹ دے، کہیں کہیں تبدیلی کرے اور اینگلز کو ان کی بات ماننی پڑی۔ جرمن سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے عام ممبروں نے اور دوسرے ملکوں کے سوشلسٹوں نے مارکس کی اس تصنیف کی قدر کی اور اسے انٹرنیشنل اشتراکی تحریک کے لئے پارٹی پالیسی کی ایک قابل قدر دستاویز شمار کیا۔ ”گوٹھا پروگرام پر تنقیدی نظر“ کے ساتھ اینگلز نے مارکس کا وہ خط بھی منسلک کر دیا جو ۵ مئی ۱۸۷۵ء کو براکے کے نام لکھا گیا تھا اور جس کا اس تصنیف سے براہ راست تعلق تھا۔ اینگلز کے جیتے جی اس تصنیف کا یہی ایک ایڈیشن، اسی دیباچے کے ساتھ نکلا تھا۔ بعد میں سوویت یونین سے ۱۹۳۲ء

میں ”گوٹھا پروگرام پر تنقیدی نظر“، پہلی بار اصل کے مطابق شائع ہوا۔ صفحہ ۲۳۳

۱۵۰- ۲۲ سے ۲۷ مئی ۱۸۷۵ء تک گوٹھا کے مقام پر کانگریس ہوئی تو وہاں جرمن مزدور طبقے کی تحریک میں دو رجحانوں کے لوگ جمع تھے: آگسٹ بیبل اور ولہلم لیکنیخت کی رہنمائی میں سوشل ڈیموکریٹک ورکرز پارٹی والے (جو آئری ناخ والوں کا گروپ تھا) اور لاسال کے حاسیوں میں جرمن جنرل ورکرز یونین والے (ملاحظہ ہو نوٹ ۱۵۳)۔ جرمنی کی سوشلسٹ ورکرز پارٹی میں یہ دونوں متحد ہو گئے۔ جرمن مزدور طبقے میں جو اختلافات چلے آ رہے تھے وہ یہاں پہنچ کر تمام ہو گئے۔ متحدہ پارٹی کے لئے پروگرام کے جس خاکے پر مارکس اور اینگلز نے ایسی کٹیلی تنقید کی تھی، وہ معمولی سی ترمیموں کے بعد کانگریس نے منظور کر لیا۔ صفحہ ۲۳۳

۱۵۱- ۱۸۹۰ء میں ۱۸-۱۲ اکتوبر تک ہالے کے مقام پر جرمن سوشل ڈیموکریٹک کانگریس منعقد ہوئی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ نئے پروگرام کا خاکہ تیار کر کے، آئرفرٹ میں ہونے والی کانگریس سے تین مہینے پیشتر شائع کر دیا جائے تاکہ اس پر مقامی پارٹی تنظیموں میں اور اخبارات میں کھل کر بحث ہو سکے۔ صفحہ ۲۳۳

۱۵۲- انٹرنیشنل ورکنگ مینز ایسوسی ایشن کی کانگریس ہیگ میں ۱۸۷۲ء میں ۲ اور ۷ ستمبر کے درمیان ہوئی تھی۔ اس کانگریس میں ہندو قومی پارٹیوں (ملکوں) کی طرف سے ۶۵ ڈیلی گیٹ آئے تھے۔ مارکس اور اینگلز نے کانگریس کی تمام کارروائیوں میں رہنمائی کا فرض انجام دیا تھا۔ یہ دونوں رہنما اور ان کے حاسی جو برسوں سے اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ مزدور طبقے کی تحریک سے چھوٹی حیثیت کے بورژوا لوگوں کی تنگ نظری یا فرقہ بندی کی ہر شکل کو دور کر



دیں، اس کانگریس میں وہ کوششیں اپنے انجام کو پہنچیں۔  
انارکسٹوں (نراجیوں) کی تفرقہ پسندی کی حرکتوں سے بیزاری  
کا اظہار کر کے، ان کے لیڈروں کو انٹرنیشنل سے نکال  
دیا گیا۔ ہیگ میں ہونے والی اس کانگریس نے یہ راہ ہموار  
کر دی کہ مختلف ملکوں میں مزدور طبقے کی آزاد سیاسی پارٹیاں  
وجود میں آئیں اور آزادانہ اپنا کام کریں۔ صفحہ ۲۳۴

۱۵۳۔ آئزی ناخ کے مقام پر جرمنی، آسٹریا اور سوئٹزرلینڈ کے سوشل  
ڈیموکریٹوں کی کانگریس ۱۸۶۲ء میں ۷ سے ۹ اگست تک  
ہوئی تھی۔ وہیں جرمن سوشل ڈیموکریٹک ورکرز پارٹی  
کا قیام عمل میں آیا اور شریک ہونے والوں کو آئزی ناخ والے  
(Eisenachers) کہنے لگے۔ اس کانگریس میں جو پروگرام  
منظور ہوا وہ بڑی حد تک پہلی انٹرنیشنل کے پیش کئے ہوئے  
اصولوں سے مطابقت رکھتا تھا۔ صفحہ ۲۳۵

۱۵۴۔ یہاں حوالہ ہے باکونین کی تصنیف کا ”ریاستی نظام اور نراج“  
(Statehood and Anarchy) جو سوئٹزرلینڈ سے ۱۸۷۳ء میں  
شائع ہوئی تھی۔ صفحہ ۲۳۵

۱۵۵۔ ”تعطیل کے بعد“ کا مطلب ہے کہ کچھ تاخیر کے  
ساتھ۔ گوتھا کی اتحاد کانگریس ۱۸۷۵ء میں ۲۲ سے ۲۷ مئی  
تک چلی۔ لاسال والوں کی کانگریس اس سے زرا پہلے مئی میں  
ہو چکی تھی، اور آئزی ناخ والوں نے اپنی کانگریس بعد میں  
۸ جون کو ہمبرگ میں کی۔ صفحہ ۲۳۶

۱۵۶۔ امن اور آزادی کی لیگ۔ سوئٹزرلینڈ میں ۱۸۶۷ء میں چھوٹی  
بورژوازی کے ریپبلکنوں اور لیبرلوں (آزاد خیال لوگوں) نے یہ  
ایک بورژوا صلح پسند جماعت قائم کی تھی۔ یہ لوگ اس  
بات پر زور دیتے تھے کہ ”ریاست ہائے متحدہ یورپ“ بنالی  
جائے تو جنگوں کا امکان دور کیا جاسکتا ہے۔ اپنے اس پرچار  
سے امن اور آزادی کی لیگ نے عوام کو خوش فہمی میں مبتلا

کیا اور پرولتاریہ کو طبقاتی جدوجہد سے بھٹکانے کی کوشش کی۔  
صفحہ ۲۵۲

۱۵۷۔ «Norddeutsche Allgemeine Zeitung» — یہ رجعت پرست روزنامہ  
برلن میں ۱۸۶۱ء سے ۱۹۱۸ء تک نکلتا رہا۔ ۱۸۶۰ء کی  
دہائی اور ۱۸۸۰ء کے درمیان وہ بسمارک کی گورنمنٹ کا  
سرکاری ترجمان تھا۔ مارکس نے یہاں ایک مضمون کا حوالہ  
دیا ہے جو اس اخبار میں ۲۰ مارچ ۱۸۷۵ء کو شائع ہوا  
تھا۔ صفحہ ۲۵۳

۱۵۸۔ مالتھوس کی ایک مشہور تصنیف ہے ”آبادی کے قاعدے پر  
ایک مقالہ“، (Malthus «An Essay on the Principle of Population»)۔  
جہاں وہ بنیادی قاعدہ پیش کرتا ہے کہ محنت کشوں  
کے افلاس کا سبب گویا یہ ہے کہ لوگوں کی آبادی اقلیدسی  
حساب (in geometrical progression) سے بڑھنے کی طرف مائل  
رہتی ہے، حالانکہ ضروریات زندگی کا سامان بہت بڑھے تو  
بھی حسابی نسبت (arithmetical progression) سے بڑھ سکتا  
ہے۔ صفحہ ۲۵۴

۱۵۹۔ «L'Atelier» (”مستری خانہ“،) — یہ ماہنامہ پیرس میں  
۱۸۸۰ء سے ۱۸۵۰ء تک نکلتا رہا۔ دستکاریوں، کاری گروں اور  
مسیحی اشتراکی خیالات کے لوگوں کا ترجمان تھا۔ صفحہ ۲۵۷

۱۶۰۔ «Kulturkampf» (”تہذیبی جدوجہد“،) — یہ نام بورژوا  
لیبرلوں نے اصلاحات کے اس سسٹم کو دیا تھا جو بسمارک  
کی حکومت نے پچھلی صدی کی آٹھویں دہائی میں یہ کہہ کر  
جاری کی تھیں کہ سکیولر کلچر (غیر مذہبی تہذیب) پھیلانے  
کی خاطر اختیار کی جارہی ہیں۔ لیکن ابھی دس سال نہ گزرے  
تھے کہ رجعت پرست طاقتوں کا پایہ مضبوط کرنے کی خاطر ان  
اصلاحات کا بیشتر حصہ منسوخ کر دیا گیا۔ صفحہ ۲۶۳



۱۶۱- آگسٹ بیل کے نام اینگلز نے یہ خط ۱۸ سے ۲۸ مارچ ۱۸۷۵ء کے درمیان لکھا تھا، اور اس کا گہرا سمبندھ ہے مارکس کی تصنیف ”گوتھا پروگرام پر تنقیدی نظر“ سے۔ اس خط میں جرمنی کی سوشل ڈیموکریٹک ورکرز پارٹی جو متحد ہونے والی تھی، اس کے پروگرام کے خاکے پر اینگلز نے اپنی اور مارکس کی مشترکہ رائے ظاہر کی ہے۔ سمجھوتے کے اس خاکے میں، جس میں لاسال کے اندھے عقیدوں کا پورا ڈھانچہ داخل ہو گیا تھا، اسٹیٹ کے متعلق موقع پرستی کا بیوہار رکھا گیا تھا، اور پرولتاری انٹرنیشنلزم کے اصولوں کو مٹی میں ملا دیا گیا تھا۔ اسے اینگلز نے اپنی بے باک اور بے لاگ تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ صفحہ ۲۶۶

۱۶۲- «Frankfurter Zeitung und Handelsblatt» (”فرینکفرٹ اخبار اور تجارتی پرچہ“)- یہ چھوٹی بورژوازی کا ایک جمہوری روزنامہ تھا جو ۱۸۵۶ء سے شائع ہونا شروع ہوا (۱۸۶۶ء میں اسی نام سے) اور ۱۹۳۳ء تک نکلتا رہا۔ صفحہ ۲۶۸

۱۶۳- اینگلز نے یہاں گوتھا پروگرام کے خاکے کی حسب ذیل مدوں کا حوالہ دیا ہے :

”جرمن ورکرز پارٹی کی طرف سے اسٹیٹ کی آزاد بنیادوں کے بطور ان باتوں کا مطالبہ کیا جاتا ہے کہ : (۱) ۲۱ سال اور اس سے اوپر کے تمام مردوں کو، تمام انتخابات میں، چاہے وہ قومی ہوں یا مقامی، برابر کا حق حاصل ہونا چاہئے کہ وہ خفیہ بیلٹ کے ذریعے براہ راست ووٹ دیا کریں۔ (۲) لوگوں کو براہ راست قانون سازی کا حق حاصل ہو، وہ قانون کا مسودہ پیش بھی کر سکیں اور اسے رد بھی کر سکیں۔ (۳) فوجی تربیت عام ہونی چاہئے۔ موجودہ باقاعدہ فوج کی جگہ عوامی ملیشیا (فوجی تربیت یافتہ رضاکار) کو ملنی چاہئے؛ جنگ یا امن کا فیصلہ عوام کی نمائندہ اسمبلی کے ہاتھ میں ہونا چاہئے۔ (۴) ہر قسم کے غیر معمولی قانون ہٹائے جائیں،

خاص کر وہ جو اخبارات، انجمن اور جلسے پر پابندی لگاتے ہیں۔ (۵) عدالت عوام کے ہاتھ میں ہو۔ عدالتی چارہ جوئی پر کوئی خرچ نہ آنا چاہئے۔

”جرمن ورکرز پارٹی کی طرف سے اسٹیٹ کی ذہنی اور اخلاقی بنیادوں کے بطور ان باتوں کا مطالبہ کیا جاتا ہے کہ : (۱) تمام لوگوں کے لئے مفت اور مساوی پبلک تعلیم کا بندوبست اسٹیٹ کرے، تعلیم سب کے لئے لازمی ہو اور مفت ہو۔ (۲) سائنسی یا علمی فکر کو آزادی ہو، ضمیر یا عقیدے کی آزادی ہو۔“ صفحہ ۲۶۸

۱۶۴- یہاں فرانس اور پروشیا کی اس جنگ کی طرف اشارہ ہے جو ۱۸۷۰ء-۱۸۷۱ء میں ہوئی تھی۔ صفحہ ۲۶۸

۱۶۵- یہاں مراد ہے براکے کی کتاب ”لاسال کی تجویز“ سے (Der Lassalle'sche Vorschlag. Braunschweig, 1873) صفحہ ۲۷۰

۱۶۶- «Demokratisches Wochenblatt» (ڈیموکریٹک ہفتہ وار)-

جرمن مزدوروں کا اخبار تھا جو لیپزگ میں جنوری ۱۸۶۸ء سے ستمبر ۱۸۶۹ء تک نکلا۔ ولہلم لیکنیخت اس کا ایڈیٹر تھا۔ اس اخبار نے جرمن سوشل ڈیموکریٹک ورکرز پارٹی بنوانے میں بڑی خدمت انجام دی۔ ۱۸۶۹ء میں جب آئری ناخ مقام پر پارٹی کانگریس ہوئی تو اسی اخبار کو پارٹی کا مرکزی ترجمان بنا کر اس کا نام رکھا گیا «Volksstaat»۔ مارکس اور اینگلز اس اخبار کے لئے لکھا کرتے تھے۔ صفحہ ۲۷۳

۱۶۷- ”فطرت کی جدلیات“، «Dialectics of Nature» اینگلز کی

اہم تصنیفوں میں شمار ہوتی ہے۔ ۱۹ویں صدی کے وسط تک فطرت کے علم (نیچرل سائنسوں) میں جو اہم دریافتیں ہوئی تھیں، مصنف نے ان کا جدلیاتی مادی تجزیہ پیش کیا ہے۔ مادی جدلیات کو وضاحت سے پیش کرنے کے علاوہ ان



تصورات کا تنقیدی تجزیہ بھی کر دیا ہے جو نیچرل سائنس میں مابعد الطبیعیات اور عینیت کا نظریہ رکھتے ہیں۔  
 ”فطرت کی جدلیات“، لکھتے وقت جو مواد تیار ہوا تھا، وہ اینگلز کے جیتے جی شائع نہیں ہوا تھا۔ یہ مکمل تصنیف پہلی بار سوویت یونین سے ۱۹۲۵ء میں شائع کی گئی۔ اصل جرمن عبارت اور ساتھ ہی اس کا روسی ترجمہ بیک وقت کتابی شکل میں نکلا۔ صفحہ ۲۷۷

۱۶۸۔ اوجیائی اصطبل (Augean stables)۔ یہاں اینگلز نے یورپی زبانوں کا ایک محاورہ استعمال کیا ہے جو یونان قدیم کی داستانوں سے چلا آ رہا ہے۔ ایلید کے بادشاہ اوجی کے اصطبل میں سالہاسال کا گند جمع ہو گیا تھا، ہرکولیس (ہرقل) نے اسے ایک دن میں صاف کر ڈالا۔ کیچڑ اور گند کے ڈھیر یا بدنظمی اور انتہائی بے پروائی کے لئے یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ صفحہ ۲۷۹

۱۶۹۔ پادری لوتھر کی عبادت میں یہ بھیجن آتا ہے :  
 »Ein feste Burg ist unser Gott« (اے پروردگار ہماری صداقت قبول ہو)۔ جرمن شاعر ہنرخ ہائنے نے اپنی تصنیف ”جرمنی میں مذہب اور فلسفے کی تاریخ پر“، میں اس بھیجن ”دور اصلاح (Reformation) کا مارسیلیئز رجز“، قرار دیا ہے۔ صفحہ ۲۷۹

۱۷۰۔ کوپرنیکس کو اپنی اس تصنیف کی کاپی ۲۴ مئی ۱۵۴۳ء کو اس روز ملی جب مرنے میں کچھ گھنٹے رہ گئے تھے۔ اس تصنیف میں (اجرام فلکی کی گردش کے بارے میں) کوپرنیکس نے کائنات میں سورج کے گرد ہر وجود کی گردش کا نظام پیش کیا ہے۔ صفحہ ۲۸۰

۱۷۱۔ ۱۸ ویں صدی کی کیمسٹری میں یہ نظریہ رائج تھا کہ جسموں کے اندر ایک خاص قسم کا آتش گیری مادہ (Phlogiston) پہلے سے موجود ہوتا ہے اور آگ پکڑنے کے وقت وہ نکل پڑتا

ہے۔ ممتاز فرانسیسی عالم کیمیا لاوواژ نے اس تصور کی غلطی پکڑی۔ اس نے بتایا کہ جلتی ہوئی کوئی چیز جب کسی وجود میں آکسیجن سے ملتی ہے تو اس کے اثر سے آگ لگ جاتی ہے، جسے ہم آگ پکڑنے کا عمل کہتے ہیں۔ صفحہ ۲۸۲

۱۷۲۔ دینیات یا Theology میں فقہ اور اصول فقہ دونوں شامل ہیں یعنی مذہبی تعلیمات، عقیدوں اور اخلاقیات کو ایک باقاعدہ اصول میں پرو کر ”علمی بنیاد“ سے استوار کیا جائے۔ صفحہ ۲۸۴

۱۷۳۔ یہاں مراد ہے اس غیر علمی، عینیت پرست (idealist) نظریے سے جس کا کہنا ہے کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ مشیت ایزدی میں پہلے سے موجود ہے۔ اس سے مذاہب کے نقطہ نظر کو تائید حاصل رہی ہے اور اب بھی ہے۔ صفحہ ۲۸۴

۱۷۴۔ کانٹ کی تصنیف جو مصنف کا نام دئے بغیر ۱۷۵۵ء میں شائع ہوئی تھی »Allgemeine Naturgeschichte und Theorie des Himmels« (”عام فطری تاریخ اور افلاک کا نظریہ“،)۔ اس کتاب میں کانٹ نے خلا کی زندگی کے بارے میں اپنا یہ قیاس ظاہر کیا تھا کہ نظام شمسی کسی ابتدائی دھند کے ہیولے سے بن کر ابھرا ہے۔ لپلاس نے نظام شمسی کی تشکیل کے متعلق اپنا قیاس، اپنی تصنیف کے بالکل آخری باب میں وضاحت سے ظاہر کیا۔ تصنیف کا نام تھا : »Exposition du système du monde« (”کائنات کے نظام کا بیان“، جلد اول۔ دوم، پیرس، ۱۷۹۶ء)۔ صفحہ ۲۸۴

۱۷۵۔ انسائیکلوپیڈسٹ (قاموسی علما یا علم کی روشنی پھیلانے والے)۔ ۱۸ ویں صدی کے آخر میں انقلاب فرانس سے زرا پہلے کے وہ فرانسیسی بورژوا علما جنہوں نے فن و ہنر کے جامع علوم قاموس (Encyclopaedia of Arts and Crafts) شائع کرنے کی خاطر اپنی قوتیں یکجا کر لی تھیں۔ اس کتابی سلسلے کا چیف ایڈیٹر مشہور مادیت پسند فلسفی دیدرو تھا۔ اگرچہ ان لوگوں کے



سیاسی اور فلسفیانہ خیالات میں اختلاف رہا، تاہم بعض باتوں میں وہ ہم خیال تھے، مثلاً جاگیرداری سے بیزاری، تیسرے سماجی گروہ (چھوٹی حیثیت کے اور معمولی کاروباری، پیشہ ور لوگوں) کو حقوق دئے جانے کی تبلیغ جس کی سربراہی بورژوازی کر رہی تھی، قرون وسطی کے مذہبی فلسفے اور کتھولک کلیسا سے انکار — ان سب میں مشترک تھا۔ اینگلز نے ان کی سرگرمیوں کا بیان اپنی تصنیف ”یوٹوپائی اور سائنسی سوشلزم“ میں کیا ہے (جو اس سلسلے کے حصہ سوم میں شامل ہے)۔ صفحہ ۲۸۵

۱۷۶ — انگریز سائنس دان اسحاق نیوٹن نے اپنی تصنیف ”نیچرل سائنس کے حسابی اصول“ کی کتاب سوم ”عام نظریہ“ میں جو خیال ظاہر کیا ہے، یہاں اس کی طرف اشارہ ہے۔ نیوٹن کے اسی خیال کا حوالہ دیتے ہوئے فلسفی ہیگل نے اپنی کتاب ”فلسفیانہ سائنس کا قابوس“ میں یہ لکھا تھا: ”نیوٹن نے ... صاف صاف فزیکس (طبیعیات) کو خبردار کیا ہے کہ وہ مابعد الطبیعیات کی طرف نہ پھسل پڑے...“ صفحہ ۲۸۶

۱۷۷ — *Amphioxus* (جسے *Lancelet* بھی کہتے ہیں) مچھلی جیسا پانی کا جانور ہے۔ ریڑھ کی ہڈی والے اور بے ہڈی کے جانداروں کے بیچ کی مخلوق جو سمندروں اور بحرا عظم میں پائی جاتی ہے۔ *Lepidosiren* بھی ایک قسم کی مچھلی ہے جس کے پھیپھڑے بھی ہوتے ہیں اور گل پھڑے بھی۔ جنوبی امریکہ میں ملتی ہے۔ صفحہ ۲۹۰

۱۷۸ — *Ceratodus* (سینگ جیسے دانت والی) ایک قسم کی مچھلی، اس کے بھی پھیپھڑے اور گل پھڑے ہوتے ہیں۔ آسٹریلیا میں پائی جاتی ہے۔

*Archaeopteryx* ریڑھ کی ہڈی والا ایسا جانور جو پرندوں کی اس قدیم ترین قسم کا نمائندہ زمین میں دبا رہ

گیا ہے جس میں اڑنے کے علاوہ رینگنے کی بھی خصوصیات موجود تھیں۔ صفحہ ۲۹۰

۱۷۹ — یہ ک۔ وولف کے اس تحقیقی مقالے کی طرف اشارہ ہے: *«Theorie generationis»* (”ابتدا کا نظریہ“، جو ۱۷۵۹ء میں شائع ہوا تھا۔ صفحہ ۲۹۰

۱۸۰ — چارلس ڈارون کی تصنیف *«Origin of Species»* (”نوعوں کی ابتدا“، ۱۸۵۹ء میں نکلی۔ صفحہ ۲۹۱

۱۸۱ — *Protista* — سائنس دان ہیکل کی درجہ بندی کے مطابق ایک خلیے اور بے خلیے کے جانداروں کی عام اور پھیلی ہوئی قسم۔ نباتات اور حیوانات، جو بہت سے خلیے رکھتے ہیں، ان کے علاوہ یہ جانداروں کی تیسری قسم ہے جو عالم فطرت میں نامیاتی جسم رکھتی ہے۔ صفحہ ۲۹۱

۱۸۲ — *Eozoon canadense* — جاندار جسم کی ایک بالکل ابتدائی حالت میں پڑی ہوئی یہ قسم کناڈا میں ملی ہے۔ لیکن جرمن ماہر حیوانات میوہی اوس نے ۱۸۷۸ء میں اس کو جاندار جسم ماننے سے انکار کیا ہے۔ صفحہ ۲۹۲



الیکساندر دوم (Alexander II) (۱۸۸۱ء-۱۸۱۸ء) - روسی شہنشاہ  
جس نے ۱۸۸۱ء تک ۲۶ سال حکومت کی۔ صفحہ ۱۵۵

الیکساندرا (Alexandra) (۱۹۲۵ء-۱۸۴۴ء) - ڈچ بادشاہ کرسٹیان  
نہم کی بیٹی۔ ۱۸۶۳ء سے پرنس آف ویلز کی اور پھر ۱۹۰۱ء  
سے شاہ انگلستان ایڈورڈ ہفتم کی بیوی رہی۔ صفحہ ۱۷۹

اورکارٹ (Urquhart)، داؤد (۱۸۷۷ء-۱۸۰۵ء) - انگریز ڈپلومیٹ،  
رجعت پرست سیاسی شخصیت، ۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۲ء تک برطانوی  
پارلیمنٹ کا ممبر۔ صفحہ ۲۹

اورلین خاندان (Orleans) - فرانس کا ایک شاہی خاندان جو ۱۸۳۰ء سے  
۱۸۴۸ء تک صاحب اختیار رہا۔ صفحات ۱۵۸، ۱۷۱، ۲۰۹،

۲۱۱

اورلین شاہزادہ - ملاحظہ ہو لوئی فلپ۔

اوریل دی پلادین (Aurelle de Paladines)، لوئی ژاں باتیسٹ دے  
(۱۸۷۷ء-۱۸۰۴ء) - فرانسیسی جنرل، کلیسائی حلقے کا آدمی  
تھا۔ مارچ ۱۸۷۱ء میں اس نے پیرس کے نیشنل گارڈ کی کمان کی۔  
اسی سال وہ قومی اسمبلی کا بھی ممبر تھا۔ صفحات ۱۷۳،  
۱۷۷، ۱۷۸

اوکن (Oken)، لورینز (۱۸۵۱ء-۱۷۷۹ء) - جرمن نیچرلسٹ اور  
نیچرل فلسفی۔ صفحہ ۲۹۰

اووین (Owen)، رابرٹ (۱۸۵۸ء-۱۷۷۱ء) - انگلستان کا مشہور  
یوٹوپائی سوشلسٹ۔ صفحات ۲۶، ۱۱۹

آئر (Auer)، اگناتس (۱۹۰۷ء-۱۸۴۶ء) - جرمن سوشل ڈیموکریٹ،  
سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کے اہم لیڈروں میں سے تھا، کئی بار  
جرمن رائخسٹاگ (پارلیمنٹ) کا ممبر چنا گیا۔ بعد میں اصلاح پسندی  
کا حامی ہو کر رہ گیا۔ صفحہ ۲۳۵

## ناموں کا اشاریہ

-۱-

اسپارٹیرو (Espartero)، بالدومیرو (۱۸۷۹ء-۱۷۹۳ء) - ہسپانوی  
جنرل اور مدبر۔ ۴۳ - ۱۸۴۱ء میں ریجنٹ رہا۔ پھر ۱۸۵۴ء  
سے دو سال کے لئے حکومت کا سربراہ ہو گیا تھا۔ یہ بھی بورژوا  
ترقی پسندوں (progressists) کی پارٹی کا لیڈر تھا۔ صفحہ ۱۶۷  
اسپینوزا (Spinoza)، باروخ بینے دکت (۱۶۷۷ء-۱۶۳۲ء) - ہالینڈ  
کا شہرہ آفاق مادیت پسند فلسفی دہریہ۔ صفحہ ۲۸۴

اسمتھ (Smith)، آدم (۱۷۹۰ء-۱۷۷۳ء) - مشہور انگریز ماہر معاشیات  
جس نے بورژوا کلاسیکی سیاسی معاشیات کی بنیاد ڈالنے میں کار  
نمایاں انجام دیا۔ صفحات ۴۲، ۵۱، ۵۲، ۸۴

آفرے (Affre)، دینی اوگوست (۱۸۴۸ء-۱۷۹۳ء) - فرانسیسی روحانی  
پیشوا۔ ۱۸۴۰ء سے آٹھ سال تک پیرس کا لائٹ پادری رہا۔ جون  
۱۸۴۸ء کی بغاوت کے دنوں میں سرکاری فوج کے سپاہیوں کی گولی  
سے ہلاک ہوا۔ صفحہ ۲۲۱

اقلیدس (Euclid) (چوتھی صدی ق م کے آخر اور تیسری صدی ق م کے  
اول میں) - یہ قدیم یونان کا لازوال ریاضی داں گزرا ہے۔  
صفحہ ۲۸۱



اینکلس (Engels)، فریڈرک، ۱۸۲۰ء سے ۱۸۹۵ء تک زندہ رہا۔ صفحات ۱۱، ۱۲، ۱۰۳، ۱۲۱، ۱۳۰، ۲۶۶، ۲۷۳، ۲۷۸، ۲۸۲، ۲۸۵

—ب—

بارٹن (Barton)، جان (۱۸ ویں صدی کے آخر سے ۱۹ ویں صدی کے اول تک) — انگریز اکانومسٹ، بورژوا کلاسیکی سیاسی معاشیات کا نمائندہ۔ صفحہ ۸۵

باکونین، میخائیل الیکساندروویچ (۱۸۷۶ء — ۱۸۱۴ء) — روسی ڈیموکریٹ، مضمون نگار، جس نے جرمنی میں ۱۸۴۸ء — ۴۹ء کے انقلاب میں حصہ لیا۔ انارکزم (نراج پسندی) کا ایک اہم نظریہ ساز۔ پہلی انٹرنیشنل میں اس نے مارکس ازم کی سخت مخالفت کی۔ جب ہیگ میں ۱۸۷۲ء کی کانگریس ہوئی تو اسے تفرقہ پردازی کے الزام میں انٹرنیشنل کی ممبری سے خارج کر دیا گیا۔ صفحات ۱۱۹، ۲۳۳، ۲۷۳

براکے (Bracke)، ولہلم (۱۸۸۰ء — ۱۸۴۲ء) — جرمن سوشل ڈیموکریٹ، آئزناخ کے پروگرام کا حامی، جو سوشل ڈیموکریٹک ورکرز پارٹی کے بانیوں اور رہنماؤں میں شامل تھا۔ مارکس اور اینگلس سے اس کے قریبی تعلقات تھے۔ لاسال کے حامیوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ صفحات ۲۳۳، ۲۳۷ — ۲۳۵، ۲۷۰

برائٹ (Bright)، جان (۱۸۸۹ء — ۱۸۱۱ء) — انگریز بل مالک، آزاد تجارت کا حامی۔ اناج کے قانونوں کی مخالف لیگ بنوانے والا۔ ۱۸۶۰ء کے بعد سے وہ لبرل پارٹی کا ایک لیڈر رہا اور لبرل حکومتوں میں وزارت کے عہدے سنبھالے۔ صفحہ ۱۰۷

برژیرے (Bergeret)، ژول وکٹر (۱۹۰۵ء — ۱۸۳۹ء) — پیرس کمیون کا ایک اہم نام۔ نیشنل گارڈ کا جنرل تھا، بعد میں ترک وطن کر دیا۔ صفحہ ۱۸۰

برونو (Bruno)، جیوردانو (۱۶۰۰ء — ۱۵۴۸ء) — اطالیہ کا مشہور مادیت پسند مفکر، جو اپنے ملحدانہ خیالات پر قائم رہا اور مسیحیت کی احتسابی عدالت نے اسے زندہ جلوا دیا۔ صفحہ ۲۸۰

برونیل (Brunel)، آن توآن مگلوار (پیدائش ۱۸۳۰ء) — فرانسیسی فوجی افسر۔ بلانکی کا حامی۔ پیرس کمیون کے وقت میں نیشنل گارڈ کی مرکزی کمیٹی کا ممبر تھا۔ مئی ۱۸۷۱ء میں وارسائی والوں کے حملے میں بری طرح زخمی ہوا۔ صفحہ ۲۲۶

بسمارک (Bismark)، اوٹو (۱۸۹۸ء — ۱۸۱۵ء) — پرنس تھا جس نے پروشیا اور جرمنی کی سیاسی زندگی میں تاریخی نام پیدا کیا۔ پروشیائی امرا کا نمائندہ۔ پہلے ۱۸۷۱ء — ۱۸۶۲ء میں پروشیا کا منسٹر پریسیڈنٹ رہا، پھر جرمن سلطنت کا چانسلر ہو گیا اور ۱۸۹۰ء تک اس عہدے پر رہا۔ صفحات ۱۲۳، ۱۲۷، ۱۳۴، ۱۵۵، ۱۶۳، ۱۶۹، ۱۷۱، ۱۷۴، ۱۹۳، ۲۰۳، ۲۰۶، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۹، ۲۵۱، ۲۵۳، ۲۷۵

بطلمیوس (Ptolemy)، کلاودی (دوسری صدی) — یونان قدیم کا ماہر علم ریاضی، ماہر فلکیات، جغرافیہ داں، جس نے سب سے پہلے زمین کی مرکزیت کا وہ نظام سوچا (heliocentric theory) جسے نظام بطلمیوس کہتے ہیں۔ صفحہ ۲۸۱

بلانشے (Blanchet)، استانیسلاف (اصلی نام تھا پوریل) ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوا فرانسیسی راہب۔ پولیس کا خاص آدمی، جو پیرس کمیون میں شامل ہو گیا تھا۔ راز کھلنے پر گرفتار کر لیا گیا۔ صفحہ ۲۰۳

بلانکی (Blanqui)، لوئی اوگوست (۱۸۸۱ء — ۱۸۰۵ء) — فرانسیسی انقلابی، قیاسی (یوٹوپائی) کمیونسٹ۔ ۱۸۴۸ء کے انقلاب کے زمانے میں فرانس کی جمہوری اور پرولتاری تحریک کے انتہائی بائیں بازو پر رہا اور زندگی میں کئی بار سزائے قید کاٹی۔ صفحات ۱۳۲، ۱۳۴، ۱۳۶، ۱۷۳، ۱۷۸، ۲۲۰



بوناپارٹ - ملاحظہ ہو آگے نپولین سوم -

بے ایر (Baer)، کارل ارنسٹ (کارل میکسموچ) (۱۸۷۶ء - ۱۸۹۲ء) -  
عالم فطرت کا مشہور روسی سائنس دان، جس نے تشکیلی کیفیت  
(embryonic stage) کا پتہ لگایا۔ جرمنی اور روس میں علمی کام  
کرتا رہا۔ صفحہ ۲۹۰

بیل (Bebel)، آگسٹ (۱۸۳۰ء - ۱۹۱۳ء) - بین الاقوامی اور جرمن  
مزدور تحریک کا ایک اہم لیڈر - ۱۸۶۷ء سے وہ جرمن ورکرز  
ایسوسی ایشن کا رہنما، پہلی انٹرنیشنل کا ممبر اور جرمن پارلیمنٹ  
کا ممبر رہا۔ جرمن سوشل ڈیموکریسی کے بانیوں میں شمار  
ہوتا ہے۔ مارکس اور اینگلس کا دوست اور رفیق کار - دوسری  
انٹرنیشنل میں بھی سرگرم رہا۔ صفحات ۲۳۳، ۲۳۵،  
۲۶۶-۲۷۶

بیری دے (Berry)، ماریا کرولینا فرڈیننڈا لوئیزا (۱۸۷۰ء - ۱۸۹۸ء) -  
خود نوابزادی اور گراف شمبور کی ماں - فرانسیسی تخت و تاج  
کی Legitimist دعوی دار - ۱۸۳۲ء میں اس نے لوئی فلپ کا تختہ  
الٹنے کی نیت سے وینڈیئے کے مقام پر شورش برپا کرانی چاہی تھی -  
صفحہ ۱۶۵

بیکر (Becker)، برنہارڈ (۱۸۹۱ء - ۱۸۲۶ء) - جرمن اہل قلم اور  
مورخ - لاسال کے خیالات کا حامی تھا، بعد میں آئزناخ والوں  
سے مل گیا۔ صفحہ ۲۳۷

بیلے (Beslay)، شارل (۱۸۷۸ء - ۱۸۹۵ء) - فرانسیسی کارخانہ دار اور  
سیاسی لیڈر، انٹرنیشنل کا ممبر، پرودھوں کا حامی - پیرس  
کمیون کے وقت مالیاتی کمیشن کا ممبر - بینک آف فرانس میں  
ایک ڈیلی گیٹ تھا، بینک کے قومی ملکیت بنائے جانے کے حکم  
کی سیاسی مخالفت کی اور اس کے اندرونی معاملات میں دخل نہ  
دئے جانے پر زور دیا۔ صفحہ ۱۷۰

بیوشے (Buche)، فلپ (۱۸۶۵ء - ۱۸۹۶ء) - فرانسیسی سیاست دان اور  
مورخ، بورژوا ریپبلکن، جس نے کرسچین سوشلزم کا نظریہ ایجاد  
کرنے میں نام پایا۔ صفحہ ۲۵۷

- پ -

پرنس آف ویلز - دیکھئے الیکساندرا -

پالیکاؤ (Palikao) - ملاحظہ ہو کوزین موئٹے یان -

پرودھوں (Proudhon)، پیئر ژوزف (۱۸۰۹ء سے ۱۸۶۵ء) - مشہور  
فرانسیسی ماہر معاشیات و عمرانیات - چھوٹی بورژوازی کا نظریہ ساز -  
انارکزم یا نراج کا نظریہ تیار کرنے والوں میں وہ بھی تھا - صفحات  
۱۲، ۱۱۹، ۱۳۳، ۱۳۵، ۱۳۶، ۲۷۲

پویے کرتیے (Pouyer-Quertier)، اگوستین توما (۱۸۹۱ء - ۱۸۲۰ء) -  
فرانس کا بڑا مل مالک اور سیاسی لیڈر - ۷۲ - ۱۸۷۱ء میں  
وزیر مالیات رہا۔ صفحات ۱۷۳، ۲۱۲

پیات (Pyat)، فیلکس (۱۸۸۹ء - ۱۸۱۰ء) - فرانسیسی مضمون نگار،  
چھوٹی بورژوازی کا ڈیموکریٹ - ۱۸۳۸ء کے انقلاب میں شریک  
ہوا اور اگلے سال ترک وطن کر گیا - لندن میں فرانسیسی سیکشن  
کو استعمال کر کے مارکس اور انٹرنیشنل کے خلاف کئی سال  
تک جھوٹا سچا پروپیگنڈا کرتا رہا - یہ شخص بعد میں پیرس کمیون  
میں شریک ہوا۔ صفحہ ۲۳۲

پیک، (Pic)، ژول - فرانسیسی اخبار نویس - لوئی بوناپارٹ کا حامی،  
اخبار «Etendard» کا مینجنگ ڈائریکٹر - صفحہ ۱۶۳

پی کار (Picard)، ایژین آرتھر (پیدائش ۱۸۲۵ء) - فرانس کا ایک  
سیاسی رہنما اور اسٹاک ایکسچینج کا بروکر - معتدل خیالات  
کا بورژوا ریپبلکن - صفحہ ۱۶۳



پی کار (Picard)، ارنسٹ (۱۸۷۷ء-۱۸۲۱ء) - فرانس کا مشہور وکیل اور سیاست دان، معتدل خیالات کا بورژوا ریپبلکن، قومی ڈیفنس کی حکومت میں وزیر مالیات (۱۸۷۰ء-۷۱ء)، تیسرے کی حکومت میں وزیر داخلہ رہا (۱۸۱۷ء)، کمیون کے خون ناحق میں شریک تھا۔ ایڑیں آرتھر اس کا بھائی تھا۔ صفحات ۱۶۳، ۱۷۳، ۱۸۲، ۲۲۳

پیکر (Pecqueur)، کونستانتین (۱۸۸۷ء-۱۸۰۱ء) - فرانسیسی اکادمیسٹ (ماہر معاشیات)، سماجی یوٹوپائی۔ صفحہ ۹۲

پین (Pène)، آنری دی (۱۸۸۸ء-۱۸۳۰ء) - فرانسیسی اخبار نویس، موروثی بادشاہی کا حامی۔ پیرس میں ۲۲ مارچ ۱۸۷۱ء کو جو مخالف انقلاب کارروائی ہوئی اس میں آگے آگے تھا۔ صفحہ ۱۸۰

پیٹری (Pietri)، ژوزف ماری (۱۹۰۲ء-۱۸۲۰ء) - فرانس کا سیاسی لیڈر۔ لوئی برنارڈٹ کا حامی۔ ۷۰-۱۸۶۶ء کے برسوں میں پیرس کا پولیس پریفیکٹ۔ صفحات ۱۳۴، ۲۰۷

- ت -

تاسیت (Tacitus)، پوبلی کارنیل (تقریباً ۷۵ء سے تقریباً ۱۲۰ء تک زندہ رہا) - روم کا عظیم مورخ، جس کی تصانیف ”جرمنی“، ”تاریخ“، ”Annals“ مشہور ہیں۔ صفحہ ۲۱۶

تائفیر (Taillefer) جس نے بوناپارٹ کے اخبار ”Etendard“ کی اشاعت کے سلسلے میں بہت جوڑ توڑ دکھائے۔ صفحہ ۱۶۴

تروشیو (Trochu)، لوئی ژول (۱۸۹۶ء-۱۸۱۵ء) - فرانسیسی جنرل اور سیاست دان، اورلین کی بادشاہی کا حامی، قومی ڈیفنس کی حکومت کا صدر۔ ستمبر ۱۸۷۰ء سے جنوری ۱۸۷۱ء تک پیرس کی ہتھیاربند فوج کا کمانڈر انچیف تھا۔ اور شہر کے بچاؤ

میں اندر سے رخنہ ڈالا۔ ۱۸۷۱ء کی قومی اسمبلی کا ممبر بھی رہا۔ صفحات ۱۶، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۷۰، ۱۷۶، ۱۷۹

تیمیزیے (Tamisier)، فرانسوا لوران الفونس (۱۸۸۰ء-۱۸۰۹ء) - فرانسیسی جنرل اور سیاسی شخصیت، ریپبلکن، پیرس کے نیشنل گارڈ کی کمان ستمبر سے نومبر ۱۸۷۰ء تک اسی کے ہاتھ میں تھی۔ ۱۸۷۱ء میں قومی اسمبلی کا ممبر تھا۔ صفحہ ۱۷۸

توری چلی (Torricelli)، ایوانجیلیستا (۱۶۴۷ء-۱۶۰۸ء) - اطالیہ کا زبردست ماہر طبیعیات و ریاضی۔ صفحہ ۲۸۲

ٹوک (Took)، تھومس (۱۸۵۸ء-۱۷۷۲ء) - انگریز بورژوا ماہر معاشیات، کلاسیکی معاشیات سے تعلق رکھتا ہے۔ ریکارڈو کے نظریہ زر کا نکتہ چین۔ صفحات ۲۶، ۵۲

تولین (Tolain)، آنری لوئی (۱۸۹۷ء-۱۸۲۸ء) - فرانس کا مشہور کئدہ کار، پرودھوں کا داہنے بازو والا حامی، انٹرنیشنل کے پیرس سیکشن کے لیڈروں میں سے تھا۔ ۱۸۶۵ء میں لندن کی کانفرنس میں ڈیلی گیٹ ہو کر آیا اور کئی کانفرنسوں میں شریک ہوا۔ ۱۸۷۱ء میں قومی اسمبلی کے لئے چنا گیا۔ پیرس کمیون کے وقت کمیون سے کٹ کر وارسائی والی حکومت سے مل گیا اور انٹرنیشنل سے نکالا گیا۔ صفحہ ۱۸۴

تھارنٹن (Thornton)، ولیم تھامس (۱۸۸۰ء-۱۸۱۳ء) - انگریز بورژوا ماہر معاشیات۔ صفحہ ۸۱

تھامس (Thomas)، کلیماں (۱۸۷۱ء-۱۸۰۹ء) - فرانسیسی سیاست دان، فوجی جنرل، معتدل بورژوا ریپبلکن، جون ۱۸۴۸ء کی بغاوت کے کچلنے میں بڑھ کر حصہ لیا۔ نومبر ۱۸۷۰ء - فروری ۱۸۷۱ء تک پیرس کے نیشنل گارڈ کی کمان سنبھالے رہا۔ شہر کے ڈیفنس میں دغا سے کام لیتا رہا اور آخر ۱۸ مارچ ۱۸۷۱ء کو باغی سپاہیوں نے اسے گولی سے اڑا دیا۔ صفحات ۱۷۷، ۱۸۴، ۲۰۹



تیمورلنگ (۱۴۰۵ء - ۱۳۳۶ء) - وسط ایشیا کا مشہور سپہ سالار اور جنگجو، جس نے مشرق میں عظیم الشان سلطنت قائم کی۔  
صفحہ ۱۸۳

ٹیولکے (Tölcke)، کارل ولہلم (۱۸۹۳ء - ۱۸۱۷ء) - جرمن سوشل ڈیموکریٹ، لاسال والوں کی کل جرمن ورکرز ایسوسی ایشن کے لیڈروں میں سے تھا۔ صفحات ۲۶۶، ۲۷۴

ٹیئر (Thiers)، ادولف (۱۸۷۷ء - ۱۷۹۷ء) - فرانس کا بورژوا مورخ اور ریاستی معاملات میں سرگرم، ۵۱ - ۱۸۴۹ء میں قانون ساز اسمبلی کا ممبر۔ اورلین والوں کا حامی، ۷۳ - ۱۸۷۱ء میں رپبلک کا صدر رہا۔ پیرس کمیون کو خون میں ڈبونے والا۔  
صفحہ ۱۲۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۵، ۱۶۷، ۱۶۹، ۱۷۱، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۷، ۱۸۱، ۱۸۳، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۲۰

### ج -

جونس (Jones)، رچرڈ (۱۸۵۵ء - ۱۷۹۰ء) - انگریز بورژوا ماہر معاشیات۔ سیاسی معاشیات کا کلاسیکی مکتب فکر اس کی تحریروں میں زوال آمادہ اور منتشر نظر آتا ہے۔ تاہم کئی سوالوں میں اس کی نگاہ ریکارڈو سے آگے پہنچی ہے۔ صفحہ ۸۵

جوئل (Joule)، جیمس پریسکوٹ (۱۸۸۹ء - ۱۸۱۸ء) - انگریز ماہر طبیعیات جس نے برقی مقناطیسی اور حرارت پر تحقیق کی۔  
صفحہ ۲۸۸

### د -

دانٹے (Dante)، الی گئیری (۱۳۲۱ء - ۱۲۶۵ء) - اطالیہ کا عظیم شاعر۔  
صفحہ ۱۳، ۹۴

دریوٹی (Darboy)، جارج (۱۸۷۱ء - ۱۸۱۳ء) - فرانسیسی فقیہ۔  
۱۸۶۳ء سے پیرس کا لائٹ پادری تھا۔ مئی ۱۸۷۱ء میں ضمانتی قیدی (یرغمال) کی حیثیت سے پیرس کمیون کی گولی کا شکار ہوا۔  
صفحہ ۱۳۲، ۲۲۰

دوال (Duval)، ایمیل وکٹر (۱۸۷۱ء - ۱۸۴۱ء) - فرانس کی مزدور تحریک میں ایک اہم شخصیت، پیشے کے لحاظ سے ڈھلائی مزدور، انٹرنیشنل کا ممبر، نیشنل گارڈ کی مرکزی کمیٹی اور پیرس کمیون کا ممبر، نیشنل گارڈ کا جنرل۔ ۴ اپریل ۱۸۷۱ء کو قید ہوا اور وارسائی فوج نے اسے گولی مار دی۔ صفحہ ۱۸۲

دومبروفسکی، یاروسلاف (۱۸۷۱ء - ۱۸۳۶ء) - پولینڈ کا انقلابی ڈیموکریٹ جس نے ۱۹ ویں صدی کی ساتویں دہائی میں پولینڈ کی قومی آزادی کی تحریک میں بڑھ کر حصہ لیا تھا، بعد میں پیرس کمیون کے وقت مئی ۱۸۷۱ء کے شروع سے تمام ہتھیاربند طاقت کی کمان سنبھال لی اور لڑتے ہوئے ہی جان دے دی۔  
صفحہ ۲۰۰

دوئے (Douay)، فیلکس (۱۸۷۹ء - ۱۸۱۶ء) - فرانسیسی جنرل جو سیدان میں قید ہوا تھا، بعد میں پیرس کمیون پر وارسائی کی فوج لے کر بڑھا اور قتل و غارت گری میں آگے آگے رہا۔ صفحہ ۲۱۴

دیمارے (Desmaret)، فرانس کا ژندارسی (سیاسی پولیس) افسر جس نے فلورنس کو قتل کیا۔ صفحہ ۱۸۲

دیوریر (Dürer)، البرخت (۱۵۲۸ء - ۱۴۷۱ء) - ریناساں (نشاة ثانیہ) کے زمانے کا عظیم جرمن مصور۔ صفحہ ۲۷۹

دیوفور (Dufaure)، ژول آرمان استانیسلس (۱۸۸۱ء - ۱۷۹۸ء) - فرانسیسی قانون داں اور مدبر، اورلین والوں کا حامی، ۴۹ - ۱۸۴۸ء میں وزیر داخلہ رہا۔ ۱۸۷۱ء سے ۱۸۷۹ء تک تین بار وزیر عدل رہا۔ یہ نام بھی پیرس کمیون کے قاتلوں میں شامل ہے۔ ۱۸۷۶ء



میں اور پھر ۷۹-۱۸۷۷ء میں وزیراعظم بھی ہوا۔ صفحات  
۱۷۳، ۱۸۱، ۲۰۸، ۲۰۹

— ڈ —

ڈالٹن (Dalton)، جان (۱۸۴۴-۱۷۶۶ء)۔ مشہور انگریز عالم  
طبیعیات اور ماہر کیمیا، جس نے کیمسٹری میں ذرات کے  
تجزیے کا نظریہ آگے بڑھایا۔ صفحہ ۲۸۹

ڈیکارٹ (Descartes)، رینے (۱۶۵۰-۱۵۹۶ء)۔ فرانس کا ثنویت پسند  
(dualist) فلسفی، ماہر علم ریاضی و طبیعیات۔ صفحہ ۲۸۱

— ر —

رام (Ramm)، ہرمن — جرمن سوشل ڈیموکریٹ، اخبار «Volksstaat»  
(عوامی ریاست) کے ایڈیٹوریل بورڈ میں شامل تھا (۱۸۷۵ء)۔  
صفحہ ۲۷۵

رویس پیری (Robespierre)، میکسی میلین (۱۷۹۴-۱۷۵۸ء) — اٹھارویں  
صدی کے آخر میں انقلاب فرانس کی زبردست شخصیت۔  
جیکوبی گروہ کا لیڈر، ۹۴-۱۷۹۳ء میں انقلابی حکومت کا  
سربراہ۔ صفحہ ۲۵

روبینے (Robinet)، ژان فرانسوا ایژین (۱۸۹۹-۱۸۲۵ء) — فرانسیسی  
مورخ، positivist - ۷۱-۱۸۷۰ء کے محاصرے کے زمانے میں  
پیرس کے ایک حلقے کا میٹر تھا۔ صفحہ ۲۲۳

روز (Rose)، جارج (۱۸۱۸-۱۷۴۴ء) — ٹوری خیالات کا انگریز  
مدبر - ۱۷۸۲ء سے ۱۸۰۱ء تک دو بار چانسلر آف اکسچیکر  
(وزیر مالیات) رہا۔ صفحہ ۸۱

ریکارڈو (Ricardo)، ڈیوڈ (۱۸۲۳-۱۷۷۲ء) — انگریز ماہر معاشیات۔  
بورژوا کلاسیکی سیاسی معاشیات کا سب سے اہم نمائندہ۔ صفحات

۳۲، ۸۴، ۸۵، ۲۷۰

ریمزے (Ramsey)، جارج (۱۸۷۱-۱۸۰۰ء) — انگریز ماہر معاشیات،  
بورژوا کلاسیکی سیاسی معاشیات کا ایک آخری ترجمان۔ صفحہ ۸۵

روسو (Rousseau)، ژان ژاک (۱۷۷۸-۱۷۱۲ء) — فرانس کا مشہور  
روشن خیال، جمہوریت پسند، خالق کا عقیدہ (\* Deism) رکھنے والا  
فلسفی، اور عملی اصلاحات میں سرگرم حصہ لینے والا، چھوٹی  
بورژوازی کا نظریہ ساز۔ صفحہ ۲۴۰

— ز —

زیمرمین (Zimmermann)، ولہلم (۱۸۷۸-۱۸۰۷ء) — جرمن مورخ،  
چھوٹی بورژوازی کا جمہوریت پسند نمائندہ، جس نے ۴۹-۱۸۴۸ء  
کے انقلاب میں شرکت کی۔ فرینکفرٹ کی قومی اسمبلی کا بائیں بازو  
کی طرف سے ممبر تھا۔ ”جرمنی میں کسانوں کی جنگ کی تاریخ“،  
کا مصنف۔ صفحات ۱۰۱، ۱۰۲

— ژ —

ژاکمے (Jacquemet)، فرانسیسی پادری، ۱۸۴۸ء میں پیرس کے بڑے  
پادری کا نائب اعظم۔ صفحہ ۲۲۱

ژوبر (Jaubert)، اپولیت فرانسوا گراف (۱۸۷۳-۱۷۹۸ء) — فرانس  
کی سیاست میں ایک نمایاں حیثیت کا مالک، موروثی بادشاہی کا  
حامی، ۱۸۴۰ء میں سماجی معاملات کا وزیر رہا۔ ۱۸۷۱ء  
کی قومی اسمبلی کا ممبر چنا گیا۔ صفحہ ۲۲۳

سروے (Servetus)، میگیل (۱۵۵۳-۱۵۱۱ء) — پیشے سے طبیب  
تھا۔ اسپین کا وہ زبردست عالم، جس نے نشاۃ ثانیہ کے دور میں  
دوران خون کے سلسلے میں اہم انکشاف کئے۔ صفحہ ۲۸۰

\* Deism — یہ فلسفیانہ مذہبی عقیدہ کہ خداوند عالم خالق کائنات  
ہے، لیکن تخلیق کے بعد دنیا اپنے اندرونی نظام کے مطابق چلتی رہتی  
ہے۔



— س —

سسماندی (Sismondi)، ژاں شارل لیونار سموندی (۱۸۳۲ء-۱۷۷۳ء) — سوئٹزرلینڈ کا ماہر معاشیات، سرمایہ داری نظام کا نکتہ چین چھوٹی بورژوازی کے نقطہ نظر سے۔ صفحہ ۸۵

سولا (Sulla)، لوسی کارنیل (۱۳۸ سے ۷۸ ق م) — روم کا مشہور سپہ سالار اور مدبر، سفیر بھی رہا اور بعد میں (۸۲ سے ۷۹ ق م) ڈکٹیٹر ہو گیا۔ صفحات ۱۷۰، ۲۱۵

سیسے (Saisset)، ژاں (۱۸۷۹ء-۱۸۱۰ء) — فرانس کا ایڈمرل (امیر بحریہ) اور سیاسی لیڈر۔ موروثی بادشاہی کا حامی، ۲۰-۲۵ مارچ ۱۸۷۱ء کو پیرس کے نیشنل گارڈ کا سپہ سالار۔ ۱۸ مارچ کو ہونے والے پرولتاری انقلاب کو کچلنے کے لئے اس نے تمام رجعت پرست طاقتوں کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔ ۱۸۷۱ء میں قومی اسمبلی کا ممبر بھی تھا۔ صفحہ ۱۸۱

سیکی (Secchi)، انجیلو (۱۸۷۸ء-۱۸۱۸ء) — فلکیات کا اطالوی عالم، جس نے علم ہیت میں اپنے کارناموں سے لافانی شہرت حاصل کی۔ یسوعی فرقے سے تعلق تھا۔ صفحات ۲۹۲، ۲۹۸، ۳۰۰

سیمون (Simon)، ژول (۱۸۹۶ء-۱۸۱۳ء) — فرانس کا مشہور مدبر، معتدل بورژوا ریپلکن، ۷۳-۱۸۷۰ء میں وزیر تعلیم بھی رہا۔ پیرس کمیون کے خلاف زور آزمائی پر ابھارنے والوں میں سے تھا۔ ۷۷-۱۸۷۶ء میں وزیراعظم کا عہدہ بھی سنبھالا۔ صفحہ ۱۷۳

سین سائمن (Saint-Simon)، آئری (۱۸۲۵ء-۱۷۶۰ء) — فرانس کا زبردست یوٹوپائی اشتراکی۔ صفحات ۱۱۹، ۲۸۵

سیوزن (Susane)، لوئی (۱۸۷۶ء-۱۸۱۰ء) — فرانسیسی جنرل، وزارت جنگ میں توپخانے کا انچارج تھا، اس نے فرانس کی فوجی تاریخ پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ صفحہ ۱۶۲

— ش —

شاپیر (Schaper)، فون — پروشیائی رجعت پرست نوکر شاہی کا ایک نمائندہ۔ رائن صوبے کا ۴۵-۱۸۴۲ء میں لارڈ لفٹنٹ تھا۔ صفحہ ۸

شربولیے (Cherbuliez)، آنتواں ایلیزے (۱۸۶۹ء-۱۷۹۷ء) — سوئٹزرلینڈ کا ماہر معاشیات، سسماندی کا پیروکار۔ صفحہ ۸۵

شنگارنیے (Changarnier)، نکولا آن تیودیول (۱۸۷۷ء-۱۷۹۳ء) — فرانسیسی جنرل اور بورژوا سیاسی لیڈر، شاہی کا حامی۔ جون ۱۸۴۸ء کی بغاوت کے بعد پیرس کی چھاوٹی فوج اور نیشنل گارڈ کا کمانڈر۔ ۱۳ جون ۱۸۴۹ء کو پیرس کے جلوس کو درہم برہم کرنے میں اسی کا ہاتھ تھا۔ صفحہ ۱۸۱

شولتسے دلیچ (Schulze-Delitzsch)، ہرمن (۱۸۸۳ء-۱۸۰۸ء) — جرمن سیاسی رہنما، اور گھٹیا بورژوا معاشیات کا ماہر۔ ۱۸۴۸ء میں پروشیا کی قومی اسمبلی کا ممبر تھا۔ ۱۸۶۰ء والی دھائی میں بورژوازی کی ترقی پسند پارٹی کا ایک لیڈر تھا۔ اس نے کوآپریٹو سوسائٹیوں کا جھمپلا کھڑا کر کے مزدوروں کی توجہ انقلابی سرگرمی کی طرف سے پھیرنے کی پوری کوشش کی۔ صفحہ ۸۹

شیکسپیر (Shakespeare)، ولیم (۱۶۱۶ء-۱۵۶۴ء) — لافانی انگریز ڈرامہ نگار۔ صفحات ۸۲، ۲۷۴

— ف —

فاور (Favre)، ژول (۱۸۸۰ء-۱۸۰۹ء) — فرانسیسی بیرسٹر اور سیاست دان، معتدل بورژوا ریپلکن کے لیڈروں میں شمار ہوتا ہے۔ ۷۱-۱۸۷۰ء میں وزیر خارجہ کی حیثیت سے اس نے جرمنی کے سامنے ہتھیار ڈالنے اور صلح کرنے کی گفت و شنید کی۔ پیرس کمیون کے قاتلوں میں اور پھر انٹرنیشنل کے خلاف ہنگامہ برپا کرانے میں



اس کا نام نمایاں ہے۔ صفحات ۱۳۲، ۱۶۴، ۱۶۱-۱۶۹، ۱۷۳، ۱۷۴، ۲۰۳، ۲۱۲، ۲۳۰-۲۳۲، ۲۳۳

فرانکیل (Frankel)، لیو (۱۸۹۶-۱۸۴۴) - ہنگری کی اور بین الاقوامی مزدور تحریک میں اہم حیثیت کا مالک۔ پیرس کمیون کا ممبر، لیبر اور آکس چیئرمین کا صدر رہا۔ پہلی انٹرنیشنل کی جنرل کونسل کا ۷۲-۱۸۷۱ء میں ممبر رہا۔ ہنگری کی جنرل ورکرز پارٹی کا بانی مبنی، مارکس اور اینگلس کا رفیق کار۔ صفحہ ۲۰۰

فرینکلین (Franklin)، بنجامن (۱۷۹۰-۱۷۰۶) - امریکی سیاست کی مشہور تاریخی شخصیت، سائنس دان اور ڈپلومیٹ، بورژوا جمہوریت پسند، جس نے شمالی امریکہ کی جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ صفحہ ۴۶

فلورنس (Flourens)، گوستاف (۱۸۷۱-۱۸۳۸) - فرانسیسی انقلابی اور فطرت کا مطالعہ کرنے والا (naturalist)، بلانکی کا حامی، ۳۱ اکتوبر ۱۸۷۰ء اور ۲۲ جنوری ۱۸۷۱ء کو پیرس کی بغاوت میں آگے آگے تھا، پیرس کمیون میں شریک رہا۔ اپریل ۱۸۷۱ء میں وارسائی فوج کے ہاتھوں وحشیانہ قتل ہوا۔ صفحات ۱۷۳، ۱۸۲، ۱۸۸

فیری (Ferry)، ژول فرانسوا کامل (۱۸۹۳-۱۸۳۲) - فرانس کا مشہور وکیل، مضمون نگار، اور سیاسی لیڈر۔ معتدل بورژوا ریپبلکنوں میں نمایاں حیثیت کا مالک، قومی ڈیفنس کی حکومت کا ایک وزیر۔ ۷۱-۱۸۷۰ء میں پیرس کا میئر، انقلابی تحریکوں کے خلاف صف آرائی کرتا رہا، بعد میں ۱۸۸۰ء سے ۱۸۸۵ء تک دوبار وزارت میں شامل ہوا۔ نوآبادیات فتح کرنے کی سیاست میں بہت سرگرم تھا۔ صفحہ ۱۶۴

-ک-

کابے (Cabet)، ایٹن (۱۸۵۶-۱۷۸۸) - فرانس کا ایک اہل قلم جو ۱۸۳۰ء سے ۱۸۵۰ء کے درمیان پروتاریوں کی سیاسی تحریک میں شریک رہا۔ پرامن قیاسی (یوٹوپائی) کمیونزم کا ممتاز ترجمان، جس کی ایک کتاب مشہور ہے "ایکاریا کا سفر"۔ صفحہ ۲۲۷

کالوین (Calvin)، ژان (۱۵۶۴-۱۵۰۹) - تحریک اصلاح کا مشہور رہنما، جس نے مسیحی مذہب میں پروٹسٹنٹازم کے ایک الگ فرقے "کالوینازم" کی بنیاد رکھی۔ یہ تحریک سرمایہ جمع ہونے کے ابتدائی مرحلے میں بورژوا مفاد کی ترجمان تھی۔ صفحہ ۲۸۰

کانٹ (Kant)، ایمانوئل (۱۸۰۴-۱۷۲۴) - کلاسیکی جرمن فلسفے کا بانی مبنی - عینیت پرست فلسفی۔ صفحات ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۹۰

کلون (Calonne)، شارل الیکساندر دے (۱۸۰۲-۱۷۳۴) - فرانسیسی مدبر - ۱۸ ویں صدی کے آخر میں انقلاب فرانس کے وقت تارک وطن انقلاب دشمنوں کا ایک لیڈر تھا۔ صفحہ ۲۰۶

کوپرنیکس (Copernicus)، نکولائی (۱۵۴۳-۱۴۷۳) - پولینڈ کا عظیم الشان ماہر فلکیات، دنیا میں سورج کے گرد ستاروں کی حرکت کا نظریہ (Heliocentrik System) اسی نے دیا۔ صفحات ۲۸۰، ۲۸۴

کوربون (Corbon)، کلود انتیم (۱۸۹۱-۱۸۰۸) - فرانس کا ایک سیاسی لیڈر، ریپبلکن، ۴۹-۱۸۴۸ء میں آئین ساز اسمبلی کا ممبر - بعد میں پیرس کے ایک علاقے کا میئر ہو گیا۔ ۱۸۷۱ء کی قومی اسمبلی کے لئے چنا گیا۔ صفحہ ۱۶۲



کوزین مونٹے بان (Cousin Montauban)، شارل ہیوم ماری اپولینر آنتوائ  
کاؤنٹ آف پالیکاؤ (۱۸۷۸-۱۷۹۶ء) - فرانسیسی جنرل، بوناپارٹ  
کا حامی۔ ۱۸۶۰ء میں جو اینگلو فرانسیسی فوجی مہم چین پر  
بھیجی گئی تھی، یہ اس کا کمانڈر انچیف تھا۔ اگست ستمبر  
۱۸۷۰ء میں وزیر جنگ اور حکومت کا سربراہ رہا۔ صفحہ ۱۷۳

کوے نیاک (Cavaignac)، لوئی ایڑیں (۱۸۵۷-۱۸۰۲ء) - فرانس  
کا ایک جنرل اور سیاسی لیڈر، اعتدال پسند بورژوا ریپبلکن۔ مئی  
۱۸۴۸ء سے وہ وزیر جنگ رہا اور پیرس کے مزدوروں نے جون  
میں بغاوت کی تو اسے انتہائی بے دردی سے کچل ڈالا۔ جون  
۱۸۴۸ء سے دسمبر تک انتظامیہ کمیٹی کا سربراہ وہی تھا۔  
صفحہ ۲۲۰

کیپلر (Kepler)، یوگن (۱۶۳۰-۱۵۷۱ء) - فلکیات کا عظیم الشان  
جرمن عالم، جس نے سیاروں کی حرکت کے قانون معلوم کئے۔  
صفحہ ۲۸۱

کیوت لوگن (Coëtlogon)، لوئی شارل ایمانوئیل، کانٹ دے (۱۸۱۴-  
۱۸۸۶ء) - فرانسیسی عہدہ دار، بوناپارٹ کا حامی۔ ۲۲ مارچ  
۱۸۷۱ء کو پیرس کی انقلابی طاقتوں پر چڑھائی میں پیش پیش  
تھا۔ صفحہ ۱۸۰

کیوئے (Cuvier)، ژورژ (۱۸۳۲-۱۷۶۹ء) - مشہور فرانسیسی  
نیچرلسٹ، جس نے Cataclism کا غیر علمی اور عینیت پرست نظریہ  
پیش کیا۔ صفحہ ۲۸۷

— گ —

گانیسکو (Ganesco)، گرے گوری (تقریباً ۱۸۷۷-۱۸۳۰ء) - فرانسیسی  
اخبار نویس، اصل نسل سے رومانیائی۔ دوسری شہنشاہی کے زمانے  
میں بوناپارٹ کا حامی، بعد میں تیئر کی حکومت کا طرفدار ہو گیا۔  
صفحہ ۲۰۰

گرچاکوف الیکساندر میخائیلوویچ (۱۸۸۳-۱۷۹۸ء) - روسی مدبر  
اور ڈپلومیٹ، ۵۶-۱۸۵۴ء میں وی آنا میں سفیر اور پھر  
۱۸۵۶ء سے ۱۸۸۲ء تک روس کا وزیر خارجہ رہا۔ صفحہ ۱۵۵

گلیڈسٹن (Gladstone)، رابرٹ (۱۸۷۲-۱۸۱۱ء) - انگلستان کا  
مشہور تاجر، کارخیز میں رقم دینے والا بورژوا۔ ولیم گلیڈسٹن  
کا رشتے کا بھائی۔ صفحہ ۲۶۱

گلیڈسٹن (Gladstone)، ولیم ایوارٹ (۱۸۹۸-۱۸۰۹ء) - مشہور  
انگریز مدبر۔ ۱۹ ویں صدی کے دوسرے ادھے میں لبرل پارٹی  
کا لیڈر رہا۔ ۱۸۵۲ء سے ۱۸۶۶ء تک دوبار وزیر مالیات اور  
پھر ۱۸۶۸ء سے ۱۸۹۴ء تک وقفوں سے چار بار وزیراعظم رہا۔  
صفحہ ۲۶۱

گمبے ٹا (Gambetta)، لیون (۱۸۸۲-۱۸۳۸ء) - فرانس کا مدبر،  
بورژوا ریپبلکن، قومی ڈیفنس کی حکومت میں شامل تھا (۱۸۷۰-  
۱۸۷۱ء)۔ صفحہ ۱۶۲

گوئیٹے (Goethe)، یوگن والف گانگ (۱۸۳۲-۱۷۴۹ء) - جرمن زبان  
کا عظیم شاعر، ادیب اور مفکر۔ صفحہ ۲۹۷

گیزو (Guizot)، فرانسوا پیئر ہیوم (۱۸۷۴-۱۷۸۷ء) - فرانس کا  
بورژوائی مورخ اور ریاستی معاملات میں ممتاز۔ ۱۸۳۰ء سے  
۱۸۴۹ء تک فرانس کی اندرونی اور بیرونی سیاست کے تار اسی کے  
ہاتھ میں رہے۔ صفحات ۹، ۱۶۷

گیلی فے (Galliffet)، گسٹن، الیکساندر اوگوست۔ مارکوئیس دے  
(۱۹۰۹-۱۸۳۰ء) - فرانسیسی جنرل، پیرس کمیون کے قاتلوں  
میں شمار ہوتا ہے۔ صفحات ۱۸۲، ۱۸۳، ۲۲۵، ۲۲۶

گئو (Guiod)، الفونس سیمون (پیدائش ۱۸۰۵ء) - فرانسیسی جنرل،  
پیرس کے محاصرے ۷۱-۱۸۷۰ء کے زمانے میں توپخانہ اسی  
کی کمان میں تھا۔ صفحہ ۱۶۲







انقلاب میں شریک - کمیونسٹ لیگ اور پہلی انٹرنیشنل کا ممبر -  
جرمنی کی سوشل ڈیموکریسی کے بانیوں اور لیڈروں میں شمار  
ہوتا ہے - مارکس اور اینگلس کا دوست بھی تھا اور ان کے کام  
کو آگے بڑھانے والا بھی - صفحات ۲۳۳، ۲۳۵، ۲۶۶،  
۲۷۵، ۲۷۳

لینبز (Leibniz)، گوتفرید ولہلم (۱۶۴۶-۱۷۱۶) - علم ریاضی  
کی مشہور جرمن شخصیت، عینیت پرست فلسفی - صفحہ ۲۸۱  
لے فلو (Le-Flu)، ادولف ایمانوئیل شارل (۱۸۰۴-۱۸۸۷) -  
فرانسیسی جنرل اور سیاسی لیڈر، ضابطہ پارٹی کا نمائندہ، دوسری  
ریپبلک کے زمانے میں یہ شخص آئین ساز اور قانون ساز اسمبلیوں  
کا ممبر چنا گیا - صفحات ۱۷۹، ۱۸۴

لیکونت (Lecomte)، کلود مارتن (۱۸۷۱-۱۸۱۷) - فرانسیسی  
جنرل، نیشنل گارڈ سے توپخانہ چھیننے کی جو کوشش تیسرے  
کی حکومت نے کی تھی، اس کی ناکافی پر ۱۸ مارچ ۱۸۷۱ء کو  
باغی فوجیوں نے جنرل کو گولی مار دی - صفحات ۱۷۷، ۱۸۴،  
۲۰۹، ۲۱۱، ۲۱۳

لینئی (Linnaeus)، کارل (۱۷۷۸-۱۷۵۰) - سویڈن کا مشہور  
نیچرلسٹ، پودوں اور جانوروں کی درجہ بندی کا ایک باقاعدہ  
نظام اسی نے تیار کیا ہے - صفحات ۲۸۱، ۲۸۲

لیوناردو داوینچی (Leonardo da Vinci) (۱۵۱۹-۱۴۵۲) - ریناساں  
(نشاة ثانیہ) کے دور کا شہرہ آفاق اطالوی مصور، عالم،  
انسائیکلوپیڈسٹ (قاموسی) اور ماہر تعمیرات - صفحہ ۲۷۹

- م -

مارٹن (Morton)، جان چالمرس (۱۸۸۸-۱۸۲۱) - زراعتی مسائل  
کا انگریز عالم، جس نے اپنے موضوع پر کئی کتابیں تصنیف کی  
ہیں - صفحہ ۲۸

مارکس (Marx)، کارل، ۱۸۱۸ء سے ۱۸۸۳ء تک زندہ رہا - صفحات  
۹۷، ۱۱، ۱۳، ۸۸، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۳۵،  
۲۳۳، ۲۳۷، ۲۶۷، ۲۷۳، ۲۷۵، ۲۷۶  
مارکوفسکی - فرانس میں زار روس کا ایجنٹ جس نے ۱۸۷۱ء میں تیسرے  
ہاتھ بٹایا - صفحہ ۲۰۰

مالتھوس (Malthus)، تھامس رابرٹ (۱۸۳۴-۱۷۶۶) - انگلستان  
کا مشہور اہل علم، پادری اور ماہر معاشیات - آدم بیزاری  
کا نظریہ آبادی اسی نے پیش کیا تھا - صفحات ۷۴، ۲۵۴،  
۲۶۹، ۲۷۰

مائییر (Mayer)، جولیس رابرٹ (۱۸۷۸-۱۸۱۴) - ممتاز جرمن  
نیچرلسٹ - وہ ان اولین لوگوں میں سے ہے جنہوں نے یہ اصول  
دریافت کیا کہ قوت (انرجی) برقرار بھی رہتی ہے اور دوسری  
صورتوں میں ڈھل بھی جاتی ہے - صفحہ ۲۸۸

مراٹ (Marat)، ژاں پول (۱۷۹۳-۱۷۴۳) - فرانسیسی اہل قلم،  
اٹھارویں صدی کے آخر میں بورژوا انقلاب فرانس کی نمایاں شخصیت،  
جیکوبی تحریک کا ایک اہم لیڈر - صفحہ ۲۵۱

منٹسکیو (Montesquieu)، شارل (۱۷۵۵-۱۶۸۹) - فرانس کا  
نمایاں بورژوا سماجیات کا ماہر، معاشیات کا عالم اور ادیب،  
۱۸ ویں صدی میں بورژوا روشن خیالی پھیلانے والا - آئینی بادشاہی  
کے حق میں نظریہ ساز - صفحہ ۱۹۲

منینی آگریپا (Menenius, Agrippa) (وفات ۴۹۳ ق م) روم کا پتیشین -  
صفحہ ۱۹

مونتا لیمبر (Montalembert)، شارل (۱۸۷۰-۱۸۱۰) - فرانسیسی اہل  
قلم، دوسری ریپبلک کے زمانے میں دستور ساز اور قانون ساز اسمبلی  
کا ممبر چنا گیا، اورلین والوں کا حامی اور کیتھولک پارٹی کا  
سربراہ تھا - صفحہ ۲۷۹



میڈلر (Mädler)، یوگان ہنریخ (۱۸۷۴-۱۷۹۴ء) - جرمن ماہر فلکیات - صفحات ۲۹۲، ۳۰۰

میکاویلی (Machiavelli)، نکولو (۱۵۲۷-۱۴۶۹ء) - اطالیہ کا شہرہ آفاق سیاست دان، مورخ اور مصنف - صفحہ ۲۷۹

میک موہن (Mac Mahon)، ماری ایڈم، پاتریس مورس (۱۸۰۸ء - ۱۸۹۳ء) - فرانس کا رجعت پرست جنگجو اور سیاست دان، بوناپارٹ کا حامی - پیرس کمیون کو غارت کرنے والوں میں وہ بھی شریک تھا - بعد میں ۷۹-۱۸۷۳ء کے زمانے میں فرانس کی تیسری ریپبلک کی صدارت سنبھالی - صفحات ۲۱۳، ۲۲۰، ۲۲۱

میلیئر (Millière)، ژان باتیست (۱۸۷۱-۱۸۱۷ء) - فرانس کا ممتاز اخبار نویس، صاحب قلم - پرودھوں کے بائیں بازو والے حامیوں میں تھا - مئی ۱۸۷۱ء میں وارسائی والوں کی گولی کا نشانہ بنا - صفحات ۱۶۳، ۲۲۹

میونٹسر (Münzer)، تھومس (تقریباً ۱۵۲۵-۱۴۹۰ء) - جرمنی کا زبردست انقلابی، اصلاحی تحریکوں کے زمانے میں اور ۱۵۲۵ء کی کسانوں کی جنگ کے دنوں میں غریب کسانوں کا لیڈر اور ذہنی رہنما - یوٹوپائی مساواتی کمیونزم کے خیالات کی تبلیغ کیا کرتا تھا - صفحہ ۱۰۱

-ن-

نپولین اول (Napoleon)، بوناپارٹ (۱۸۲۱-۱۷۶۹ء) - فرانسیسی سپہ سالار جو ۱۸۰۴ء سے ۱۸۱۴ء تک اور پھر ۱۸۱۵ء میں فرانس کا شہنشاہ رہا - صفحات ۱۳۰، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۶۸، ۲۰۰

نپولین سوم (Napoleon)، لوئی نپولین بوناپارٹ (۱۸۷۳-۱۸۰۸ء) - نپولین اول کا بھتیجا - ۵۱-۱۸۴۸ء میں دوسری ریپبلک کا صدر

تھا - پھر ۱۸۵۲ء سے ۱۸۷۰ء تک فرانس کا شہنشاہ بنا رہا - صفحات ۱۰۷، ۱۱۷، ۱۲۳، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۳۱، ۱۳۴، ۱۵۱-۱۴۹، ۱۵۵، ۱۵۷، ۱۵۹، ۱۶۳-۱۶۱، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۹۹، ۲۰۹، ۲۱۳-۲۱۱، ۲۲۸، ۲۶۰

نیوٹن (Newton)، اسحاق (اٹزک) (۱۷۲۷-۱۶۴۲ء) - شہرہ آفاق عالم طبیعیات، انگریز ماہر فلکیات، ریاضی کے علوم پر حاوی، کلاسیکی میکینکس کا موجد اور بانی - صفحات ۲۸۶-۲۸۱

نیومارچ (Newmarch)، ولیم (۱۸۸۲-۱۸۲۰ء) - انگریز بورژوا معاشیات کا عالم اور اعداد و شمار کا ماہر - صفحہ ۲۶

نیومین (Newman)، فرینسیس ولیم (۱۸۹۷-۱۸۰۵ء) - انگریز بورژوا ریڈیکل جس نے مذہب، سیاست اور معاشیات پر بہت ہی تصانیف چھوڑی ہیں - صفحہ ۲۶

نیپئر (Napier)، جان (۱۶۱۷-۱۵۵۰ء) - اسکاٹ لینڈ کا عالم ریاضی، جس نے logarithms کی ایجاد کی - صفحہ ۲۸۱

-و-

والٹیئر (Voltaire)، فرانسوا ماری (اصل خاندانی نام آروے) (۱۶۹۴-۱۷۷۸ء) - نمایاں فرانسیسی روشن خیال، خالق کا عقیدہ رکھنے والا فلسفی، طنزیہ کتابوں کا مصنف، مورخ - صفحہ ۱۸۳

والن تین (Valentin)، لوئی ایرنسٹ - فرانسیسی جنرل، بوناپارٹ کا حامی، ۱۸ مارچ ۱۸۷۱ء کی بغاوت سے پہلے پیرس کا پولیس پریفکٹ تھا - صفحات ۱۷۳، ۲۰۷

وروبلیفسکی (Wróblewski)، والیری (۱۸۳۶ء سے ۱۹۰۸ء تک) - پولینڈ کا انقلابی ڈیموکریٹ، پیرس کمیون کا جنرل، انٹرنیشنل کی جنرل کونسل کا ممبر اور پولینڈ کی طرف سے سکرٹری کورسپونڈنٹ (۱۸۷۲-۱۸۷۱ء)، باکونین کے حامیوں کا مخالف - صفحہ ۲۰۰



ولہلم اول (Wilhelm) (۱۷۹۷ء سے ۱۸۸۸ء تک) — پروشیا کا پرنس اور بادشاہ (۱۸۸۸ء — ۱۸۶۱ء)، جرمن شہنشاہ (۱۸۷۱ء — ۱۸۸۸ء) — صفحہ ۱۵۰

وولف (Wolf)، کرسٹیان (۱۶۷۹ء سے ۱۷۵۴ء تک) — جرمن عینیت پرست فلسفی، مابعد الطبیعیات کا عالم — صفحہ ۲۸۴

وولف (Wolf)، کسپار فریڈرک (۱۷۳۳ء سے ۱۷۹۴ء) — نمایاں ماہر حیاتیات، اجسام کی نشوونما کے نظریے کا بانی — صفحہ ۲۹۰

ویڈ (Wade)، بنجمن فرینکلین (۱۸۷۸ء — ۱۸۰۰ء) — امریکہ کا ۱۸۶۷ء سے دو سال تک نائب صدر رہا — رپبلکن پارٹی کے بائیں بازو کا لیڈر تھا — صفحہ ۹۴

ویسٹن (Weston)، جان — انگریز مزدور تحریک کا ایک سرگرم کارکن، رابرٹ اووین کا حامی — انٹرنیشنل کی جنرل کونسل کا ممبر (۱۸۷۲ء — ۱۸۶۴ء) — برطانیہ کی فیڈرل کمیٹی کا ممبر — ریفارم لیگ کی انتظامیہ کمیٹی کا ممبر — لیگ آف لینڈ اینڈ لیبر کا خاص رہنما — صفحات ۱۹ — ۱۴، ۲۶ — ۲۳، ۳۱ — ۲۸، ۳۵ — ۸۳، ۳۹، ۴۱، ۸۳

وینوآ (Vinoy)، ژوزف (۱۸۰۰ء سے ۱۸۳۰ء تک) — فرانسیسی جنرل، بوناپارٹ کا حامی، ۲ دسمبر ۱۸۵۱ء کو حکومت کا تختہ پلٹنے میں شریک، ۲۲ جنوری ۱۸۷۱ء سے پیرس کا گورنر، پیرس کمیون کے قاتلوں میں سے ایک، وارسائی والوں کی رزیرو فوج کا کمانڈر — صفحات ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۹، ۱۸۰

— ۵ —

ہاسیلمان (Hasselmann)، ولہلم (پیدائش ۱۸۴۴ء) — لاسال خیالات کی جرمن ورکرز یونین کے لیڈروں میں سے تھا — ۷۵ — ۱۸۷۱ء میں «Neuer Social Demokrat» کا ایڈیٹر — ۸۰ — ۱۸۷۵ء میں جرمن سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کا ممبر تھا، بعد میں نراجی

ہونے کی بنا پر پارٹی سے نکال دیا گیا — صفحات ۲۵۱، ۲۶۶، ۲۷۴

ہاؤسمان (Hausmann)، ژورژ ایڈریس (۱۸۰۹ء — ۱۸۹۱ء) — فرانس کی ایک سیاسی شخصیت، بوناپارٹ کا حامی، ۷۰ — ۱۸۵۳ء کے زمانے میں سین حلقے کا پریفیکٹ تھا، جس نے پیرس کو پھر سے تعمیر کرنے کا بیڑا اٹھایا — صفحات ۲۰۱، ۲۱۸، ۲۱۹

ہرشل (Herschel)، ولیم (۱۸۲۲ء — ۱۷۳۸ء) — مشہور انگریز ماہر فلکیات — صفحہ ۲۸۶

ہروے (Hervé)، ایڈورڈ (۱۸۳۵ء سے ۱۸۹۹ء) — فرانسیسی مضمون نگار اخبار «Journal de Paris» کا ایک بانی بھی تھا اور وہی اس کا چیف ایڈیٹر ہوا — بورژوا لیبر خیالات کا آدمی، دوسری شہنشاہی ٹوٹنے کے بعد اورلین والوں کا طرفدار ہو گیا — صفحہ ۲۱۶

ہکسلے (Huxley)، تھومس ہنری (۱۸۹۵ء — ۱۸۲۵ء) — مشہور انگریز عالم، نیچرلسٹ، چارلز ڈارون کی تحقیقات کو آگے بڑھانے والا، اس کی مادیت پسند فلسفیانہ نظر میں استقلال نہیں رہا — صفحہ ۱۹۶

ہوبس (Hobbes)، تھومس (۱۶۷۹ء — ۱۵۸۸ء) — ممتاز انگریز فلسفی — میکانیکی مادیت پسندی کا نمائندہ — صفحہ ۵۵

ہوہینزولرن (Hohenzollern) برانڈن برگ کے تعلقہ داروں کا خاندان (۱۷۰۱ء — ۱۴۱۵ء)، بعد میں وہ پروشیا کے بادشاہ ہوئے (۱۹۱۸ء — ۱۷۰۱ء) اور اسی سے جرمن شہنشاہ اٹھے (۱۸۷۱ء — ۱۹۱۸ء) — صفحات ۱۴۵، ۲۰۰

ہیزن کلیور (Hasenclever)، ولہلم (۱۸۸۹ء — ۱۸۳۷ء) — جرمن سوشل ڈیموکریٹ، لاسال کا حامی — ۷۵ — ۱۸۷۱ء میں جرمن ورکرز یونین کا صدر تھا — صفحات ۲۶۶، ۲۷۴



ہیکرین (Heckeren)، ژورژ شارل دانس، بیرن دے (۱۸۹۵ء - ۱۸۱۲ء) -  
فرانس کا سیاسی عہدہ دار جو کچھ عرصے روس میں رہا اور  
یہیں عظیم روسی شاعر پوشکن اس کے ہاتھوں مارا گیا۔ بوناپارٹ  
کا حامی، ۲۲ مارچ ۱۸۷۱ء کو پیرس کے انقلاب پر چڑھائی  
کرنے میں پیش پیش تھا۔ صفحہ ۱۸۰

ہیگل (Hegel)، گیورگ ولہلم فریڈرک (۱۸۳۱ء - ۱۷۷۰ء) -  
کلاسیکی جرمن فلسفے کا سب سے بڑا نمائندہ، معروضی عینیت پرست۔  
صفحات ۲۸۵، ۹

ہیلز (Hales)، جان (پیدائش ۱۸۳۹ء) - برطانوی ٹریڈیونین لیڈر -  
۷۲ - ۱۸۶۶ء میں انٹرنیشنل کی جنرل کونسل کا ممبر اور  
سکریٹری۔ ریفارم لیگ کا ممبر، لینڈ اینڈ لیبرلیگ کا ممبر -  
۱۸۷۲ء کے شروع سے ہی برطانوی فیڈرل کونسل کے اصلاح پسند  
بازو کا لیڈر بنتا گیا، مارکس اور اس کے حامیوں سے مستقل لڑتا  
رہا تاکہ انگلینڈ میں انٹرنیشنل کی شاخوں کو اپنے ہاتھ لے لے۔  
صفحہ ۲۲۹

-ی-

یودے (Eudes)، ایمیل دزیرے فرانسوا (۱۸۸۸ء - ۱۸۴۳ء) - فرانس  
کا مشہور انقلابی، بلانکی کا حامی، نیشنل گارڈ کا جنرل، پیرس  
کمیون کا ممبر - کمیون کے خاتمے کے بعد ترک وطن کر کے  
سوئٹزرلینڈ چلا گیا، وہاں سے انگلینڈ نکل گیا۔ جب ۱۸۸۰ء میں  
عام معافی کا حکم نکلا تو وہ فرانس واپس آیا اور بلانکی کے  
حامیوں کی مرکزی انقلابی کمیٹی قائم کرنے میں پیش پیش رہا۔  
صفحہ ۱۳۱

یور (Ure)، اندریو (۱۸۵۷ء - ۱۷۷۸ء) - انگریز عالم، کیمسٹ،  
گھٹیا معاشیات کا ماہر۔ صفحہ ۲۵

## ادبی اور افسانوی شخصیتیں

پستول (Pistol) - شیکسپیئر کے ڈراموں ”شاہ ہنری چہارم“، ”ہنری  
پنجم“، اور ”ونڈسور کی شاد کام بیویاں“ میں یہ کردار آیا  
ہے۔ دغا باز، بزدل اور شیخی باز۔ صفحہ ۲۲۶

پیرسٹی (Perseus) - زیوس دیوتا اور دنائی کا بیٹا، جس نے کارہائے  
نمایاں انجام دئے اور میدوزا کا سر اڑا دیا۔ صفحہ ۹۲

دون کارلوس (Don Carlos) - کہتے ہیں کہ اسپین کے بادشاہ فلپ دوم  
(۱۵۶۸ء - ۱۵۴۵ء) کا اصول پرست بیٹا تھا جس نے باپ کی  
مخالفت میں ہر طرح کے ظلم سہے اور قید میں جان دے دی۔  
مغربی ادب میں اس کا نام اسی حیثیت سے آیا ہے جیسے حضرت  
ابراہیم کا نام مشرقی ادب میں۔ صفحہ ۱۶۸

شائی لاک (Shylock) - شیکسپیئر کے ڈرامے ”وینس کا سوداگر“ کا  
بے رحم، لالچی ساھوکار جو اپنے قرضے کی دستاویز دکھا کر  
مقروض کے جسم کا آدھ سیر گوشت اتارنا چاہتا ہے۔ صفحات  
۱۷۲، ۲۷۴

میدوزا (Medusa) - یونانی صنمیات کا مشہور راکھشس، کہ اس پر  
نظر پڑتی تو آدمی پتھر کا ہو جاتا۔ صفحہ ۹۱

یسوس نوین (یوشع بن نون) - انجیل میں اس نام کے رستم وقت کا ذکر  
آیا ہے جس نے مقدس طبل بجا بجا کر اور اپنے جوان مردوں  
کے نعروں سے یری ہون شہر کی دیواریں گرا دی تھیں۔ صفحہ ۱۸۱



ہیکرین (Heckeren)

فرانس کا سین

یہیں عظیم

کا حامی،

کرنے میں

ہیگل (Hegel)،

کلاسیکی جرمن

صفحات ۹،

ہیلز (Hales)،

۱۸۶۶-۷۲

سکریٹری -

۱۸۷۲ء کے

بازو کا لیڈر

رہا تاکہ انگ

صفحہ ۲۲۹

یودے (Eudes)،

کا مشہور انق

کمیون کا

سوئٹزرلینڈ چلا

عام معافی کا

حامیوں کی

صفحہ ۱۳۱

یور (Ure)، اندریو

گھٹیا معاشیات

پڑھنے والوں سے

دارالاشاعت ترقی آپ کا بہت شکر گزار  
 ہوگا اگر آپ ہمیں اس کتاب کے ترجمے،  
 ڈیزائن اور طباعت کے بارے میں اپنی رائے  
 لکھیں۔ اس کے علاوہ بھی اگر آپ کوئی  
 مشورہ دے سکیں تو ہم ممنون ہوں گے۔

ہمارا پتہ : زوبوفسکی بلوار - نمبر ۲۱، ماسکو،

سوویت یونین

21, Zubovsky Boulevard, Moscow, USSR

Rizwan Atta